را گاندھی نمبر

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی چودھویں صدی ہجری کے نیشنل پروگرام میں موجودہ گورنر اترپردیش
جناب محمد عثمان عارف صاحب کے نعتیہ مجموعے "عقیدت کے پھول" کا اجرا کرتے ہوئے

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اتر پردیش کے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے ساتھ ۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو الہ آباد میں۔

روشنیٔ فکر

سائنس سے لگاؤ

گلاب، چنار، خوشبو

ملاقاتیں

یادوں کے بیتے منظر میں

سوانح

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ (انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ) یو پی، لکھنؤ

اپنی بات

ہماری محبوب وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا دردناک قتل ہمارے دور کا انتہائی بہیمانہ اور عدیم المثال جرم تھا جس نے ہندستان ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو اس صدی کی ایک عظیم ترین رہنما کی خدمات سے محروم کر دیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اگر دنیا کے عظیم ترین سیاسی رہنماؤں کی کوئی بھی فہرست مرتب کی جائے گی اس میں اندرا گاندھی کے نام کو بھی جلی حروف میں شامل کرنا لازمی ہوگا۔ بعض دوسرے عظیم سیاسی رہنماؤں کے ناموں کے سلسلے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن اندرا گاندھی کے نام کے بارے میں اختلاف ممکن نہیں ہے کیونکہ اندرا گاندھی دشمن سے مدافعانہ جنگ میں بھی عظیم تھیں، عالمی امن کے قیام کی کوششوں میں بھی عظیم تھیں اور ملک کو معاشی اور اقتصادی پستی سے نکالنے میں بھی عظیم تھیں۔

اگرچہ اندرا گاندھی کو بچھڑے ہوئے پانچ چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے لیکن ملک ہی نہیں دنیا کے حساس ذہنوں میں ان کی جدائی کا غم ابھی تازہ ہے۔ پنچھی اڑ گیا لیکن ڈالی اب بھی جھول رہی ہے۔ اُن کی زندگی اس بیش بہا تراشے ہوئے ہشت پہلو نگینے کی طرح تھی جس کا ہر رُخ "منظرِ سامانِ صد نشاط" ہوتا ہے۔ وہ مختلف رنگوں کا ایک ایسا امتزاج تھیں کہ تاریخ عالم میں اس طرح کی نادر شخصیتیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ اُن کی نگاہ ہمالہ کی طرح بلند تھی۔ دل گنگا کی طرح مقدس اور سرسوتی ان کی روح کی گہرائیوں میں موجزن تھی۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم باپ کی عظیم بیٹی تھیں، ایسی بیٹی جس پر بھارت کے ساٹھ کروڑ انسانوں کو ناز ہے، دنیا کو ناز ہے۔ انھوں نے جو نقوشِ قدم چھوڑے ہیں وہ آنے والی نسلوں کی سدا رہبری کرتے رہیں گے۔

قارئین کرام جانتے ہیں کہ نیا دور کے خصوصی نمبروں کا کیا مقام و مرتبہ ہے حالانکہ خاص نمبر نکالنے میں جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اُس سے وہی لوگ واقف ہیں جن کو اس کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پورا ایک سال گزر جاتا ہے اور تکمیل کا خواب تشنۂ تعبیر نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ادارے نے خصوصی نمبروں کی ایک تاریخ بنائی ہے۔ اس بار آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کو خراجِ عقیدت اور اُن کی حیات اور کارناموں کو پیش کرنے کا جو بیڑا ادارے نے اٹھایا وہ سابقہ نمبروں کے مقابلے میں زیادہ دشوار گذار تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ "جنونِ شوق" تمام خارزاروں سے گذرتا چلا گیا ہے۔ اپنی اس آبلہ پائی پر مجھے فخر ہے اور اسے میں اپنی زندگی کا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

اِس سانحۂ عظیم کے سلسلے میں ایک حیرت ناک بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ ہمارے اُردو شعراء اس سے جس انداز میں متاثر ہوئے اس سے اقلیتوں میں محترمہ اندرا گاندھی کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے سیکڑوں کی تعداد میں منظومات موصول ہوئیں مگر افسوس ہے کہ تنگیِ صفحات کے سبب اُن میں سے صرف ایک چوتھائی تخلیقات کی اشاعت ہی ممکن ہو سکی۔ اس خصوصی نمبر میں اہم انگریزی اور ہندی مضامین کے تراجم بھی شامل ہیں۔ چند ایسی چیزیں جو چھپ چکی ہیں روایت کے خلاف مگر افادیت کے خیال سے اس نمبر میں شائع کی جا رہی ہیں تاکہ یہ مکمل دستاویز بن جائے۔

بہر نوع انتہائی انکسار و اعتماد کے ساتھ اپنی یہ کاوش نذرِ اہلِ نظر کر رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آپ کی قیمتی رائے کا اس بار بھی بے چینی سے انتظار رہے گا۔

राष्ट्रपति
भारत गणतंत्र
PRESIDENT
REPUBLIC OF INDIA

پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اتر پردیش، لکھنؤ کی جانب سے شائع ہونے والے نیا دور کا ایک خصوصی نمبر سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی بھارت ہی کی نہیں بلکہ وہ بین الاقوامی سطح کی لیڈر تھیں جو امن اور انسانی فلاح وبہبود کے لیے برابر کام کرتی رہیں۔ انھوں نے ملک میں سماجی وجمہوری نظام کو برقرار رکھنے، اقتصادی ومعاشی ترقی اور قومی ایکتا اور یک جہتی کے لیے نمایاں کام کیا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے ملک وقوم کی جو خدمات کی ہیں اس کے لیے یہ ملک ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا۔

میں آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کو اس موقع پر خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور نیا دور کے خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔

ذیل سنگھ

اندرا گاندھی نے
ایک شاندار ورثہ چھوڑا ہے

اندرا گاندھی نے عوامی اقتدار کو حقیقی شکل دی اور اس بات کی کوشش کی کہ ہمارے قانون اور پالیسیاں شہریوں کے حقوق کی محافظ ہوں۔ انھوں نے مذہبی کٹرپن اور تنگ نظری کے خلاف جدوجہد کی۔ غریبی کے خلاف مسلسل جنگ کی اور تناؤ سے بھری اس دنیا میں امن کی آواز بلند کی۔

انھوں نے ہم میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار کیا۔ ہماری زندگی کو با مقصد بنایا اور ہمیں ہمارا وقار واپس دلایا۔ انھوں نے ایک شاندار ورثہ چھوڑا۔ میں اِس عظیم روایت کو محفوظ رکھنے اور ایک ایسے مضبوط اور ترقّی یافتہ ہندستان کے لیے کام کرنے کا عہد کرتا ہوں جو امن کے لیے وقف ہو۔

راجیو گاندھی

(وزیر اعظم ہند)

RAJ BHAVAN
LUCKNOW

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کے ادبی جریدے ماہنامہ "نیا دور" نے اندرا جی کی ہمہ گیر شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے جو خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے اس کے لیے یہ محکمہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی پوری زندگی جہد و عمل سے عبارت تھی۔ جنگ آزادی سے شہادت تک وہ ملک کے وقار، اتحاد و سالمیت کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔ بلاشبہ وہ ہماری بیش قیمت گنگا جمنی ثقافت و تہذیب کا اعلا نمونہ تھیں۔ ملک کو معاشی اعتبار سے خوشحال اور خود کفیل بنانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں۔ ان کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ بھارت نے چومکھی ترقی کی۔

غریب اور پسماندہ طبقے کو اوپر اٹھانے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے شریمتی گاندھی نے ہر ممکن کوشش کی۔ ۲۰ نکاتی پروگرام اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں ان کی دل چسپی ان کے انھیں خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہندستان میں جدیدیت، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کا ثبوت انسیٹ ایک بی، انٹارکٹیکا مشن، خلائی تحقیقاتی پروگرام، قومی سائنسی لیباریٹریز ہیں۔ جن پر شریمتی گاندھی کی ہی مہر ثبت ہے۔

بین الاقوامی سطح پر انھوں نے عالمی امن اور اقوام عالم کے درمیان دوستی اور تعاون کے جذبے کو تقویت پہنچانے کے لیے متعدد کوششیں کیں۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود تمام عالمی لیڈران کو احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا اندازہ اس وقت بخوبی ہو گیا جب ان کے آخری سفر میں ساری دنیا کے قائدین بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

ناوابستہ تحریک کی سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے ترقی پذیر اور تیسری دنیا کے لوگوں کی سربلندی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شریمتی اندرا گاندھی نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں سے ایک تھیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے دکھائے ہوئے راستہ پر چل کر ان کی آتما کو شانتی بخشیں۔

مجھے امید ہے کہ اس گراں قدر خصوصی نمبر کے ذریعہ تاریخ عالم کی اس عظیم شخصیت سے متعلق نئے گوشے سامنے آئیں گے اور یہ خصوصی نمبر آنے والی نسلوں کو عمل کا پیغام دے گا۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

(محمد عثمان عارف)

راج بھون
بھوبنیشور

پیغام

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اپنے رسالہ نیا دور کا اسپیشل نمبر نکال رہے ہیں۔ اپنے اس خاص نمبر میں ملک کی محبوب رہنما مرحومہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی عظیم الشان ہستی کو اجاگر کرنیکے یہ مضامین شائع کریں گے ان کی ہمہ گیر شخصیت کو ہندستان کا ہر چھوٹا بڑا بخوبی جانتا ہے تاہم مجھے انکی ذات کے سلسلہ میں چند باتیں مختصر طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔

غریبوں کی محبوب رہنما نے نہ صرف ہندستان کی کروڑہا کروڑ جنتا کی رہنمائی کی بلکہ دنیا کے تمام پچھڑے ملکوں کے تمام غریب عوام بے صدا میدوں کیساتھ ان کی رہنمائی کی اور دیکھتے رہتے تھے ان کی اچانک دردناک موت نے ساری دنیا کو بے چین کر دیا سب کی آرزوؤں اور تمناؤں پر یکدم کسی نے پانی پھیر دیا اور ہندستان کو قسمت پرکھنے والی رہنمائی سے محروم کر دیا ان کی شکل میں غریبوں کا مسیحا چلا گیا انھوں نے پچھلے پانچ برس میں پندرہ کروڑ خاندانوں کو غریبی و مفلسی کی سطح سے اٹھا کر انھیں کام دھندے میں لگایا اور سکون واطمینان کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت مرحمت فرمادی ایک خاموش انقلاب کے ذریعہ ملک سے غربت ہٹانے کی اتنی بڑی کوشش اور اتنا بڑا قدم اٹھانا تاریخ کے لمبے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی ان کی نظروں میں اکثریت واقلیت کا کوئی فرق نہ تھا ہندو۔ مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی۔ جین۔ بودھ سبکو انھوں نے ایک نگاہ سے دیکھا سب کی بہتری اور بہبودی کے قدم اٹھائے دنیا کے ملکوں کی مجلس میں انھوں نے ہندستان کو ایک اعلیٰ درجہ دلوایا ملک میں جمہوریت کے اصولوں کو پختہ کیا ملک میں یکجہتی کو بڑھایا باوجود اسکے کہ مخالف طاقتیں ملک کا شیرازہ بکھیرنے کی زبردست کوششیں کر رہی تھیں اس وقت انھوں نے ملک کو ایک دھاگے میں پرو کر رکھا اور آخر میں فرقہ واریت کے خلاف لڑتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا یہ ملک ان کے ان گنت احسانات کو تا قیامت فراموش نہیں کر سکتا۔

بس یہ چند جملے ہیں مرحومہ شریمتی اندرا گاندھی جی کی توصیف میں جنکو آپ اپنے خاص نمبر کے مضامین میں شامل کر لیں۔

فقط۔ نیاز مند
بشمبر ناتھ پانڈے
(بشمبر ناتھ پانڈے)

ودھان بھون
لکھنؤ

نرائن دت تیواری
وزیر اطلاعات اترپردیش

پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہماری محبوب رہنما آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی مقدس یاد میں اترپردیش کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کا اردو ماہنامہ نیا دور ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی کا شمار نہ صرف ہمارے ملک بلکہ دنیا کی مقبول ترین ہستیوں اور عظیم ترین رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے بنیادی جذبہ سے متاثر ہو کر امنِ عالم کے لیے مسلسل انتھک کوششیں کیں۔ اس عظیم مقصد کے لیے خود کو وقف کر دینے کے لیے ان کے اس جذبہ کے پیشِ نظر دنیا کے سو سے زیادہ ناوابستہ ممالک نے ان کو اپنی تحریک کا سربراہ منتخب کیا۔ ان کی قیادت میں اس تحریک کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور اس سے عالمی انسانی برادری میں ایک نیا عقیدہ اور اعتماد پیدا ہوا۔

دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے سلسلے میں انھوں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ غریبوں اور کمزور طبقوں کی تو وہ مسیحا ہی تھیں۔ انھوں نے اپنے ۲۰ نکاتی پروگرام کے ذریعہ غریبوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور ملک کی ہمہ گیر ترقی کے سلسلہ میں خصوصی رول ادا کیا۔

ہماری آنجہانی رہنما نے ملک کی سالمیت اور اتحاد کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دی۔ ان کے تئیں ہمارا بہترین خراجِ عقیدت یہی ہے کہ ہم ان کے آدرشوں کو اپنائیں اور اتحاد اور بھائی چارہ کے جذبہ سے سرشار ہو کر ملک کی تعمیرِ نو کے لیے آگے آئیں۔

"نیا دور" کے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے میری نیک خواہشات۔

نرائن دت تیواری
(نرائن دت تیواری)

محسنہ قدوائی
وزیر صحت و خاندانی بہبود
حکومت ہند نئی دہلی

پیغام

نازشِ ملک و قوم آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کا اچانک ہم سے بچھڑ جانا ایک ایسا ناقابلِ فراموش سانحہ ہے جس کا زخم زندگی بھر تازہ رہے گا۔ ان کی تابناک شخصیت جہد و عمل سے عبارت تھی۔ وہ ہمیشہ سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا رہیں۔ جمہوری قدروں پر ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ قومی شاہراہ پر ان کے نقوشِ قدم صدیوں جگمگاتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ میں نے مسز گاندھی کو بہت قریب سے دیکھا۔ رفاقت کے اس سفر میں قدم قدم پر ان کی عظمت نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی ہستیاں زمانے کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔

محکمۂ اطلاعات اترپردیش کا اردو جریدہ نیا دور اپنی ادبی حیثیت کے لیے ملک و بیرونِ ملک ممتاز و منفرد ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ وہ آنجہانی وزیر اعظم کی شخصیت و سیرت پر ایک مبسوط نمبر نکال رہا ہے۔ امید ہے کہ اس نمبر کی اشاعت سے اردو داں طبقہ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ نیا دور کے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے میں اپنی نیک خواہشات پیش کرتی ہوں۔

محسنہ قدوائی

(محسنہ قدوائی)

وزیر ریاست برائے اطلاعات
اتر پردیش

ملک کی محبوب رہنما آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ریاستی محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ کے اردو ماہنامہ نیا دور کا "اندرا گاندھی نمبر" شائع کرنے کی کاوش یقیناً ایک مستحسن اقدام ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ملک کے اتحاد اور سالمیت پر زور دیا اور اپنے اسی عظیم آدرش کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دی اور اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا کہ میرے خون کا ہر قطرہ دیش کو استحکام بخشے گا۔

درحقیقت وہ اخوت و محبت، یگانگت و ہم آہنگی، امن و آشتی، اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی کی بہت بڑی علمبردار تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا اور وہ غریبوں اور مظلوموں کی مسیحا تھیں۔ انھیں اپنے دیش اور اس کے عوام سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اقوامِ عالم میں اپنے ملک کا وقار بلند کیا۔ ان کا شمار نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے عظیم لیڈروں میں ہوتا ہے۔ ان کا بیس نکاتی پروگرام غریبوں اور کمزوروں کی فلاح و بہبود نیز ملک کی ہمہ گیر ترقی کا ضامن ہے۔ انھوں نے اپنے پروگراموں اور پالیسیوں سے ملک کو ہر اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔

اپنی عظیم قائد سے سچی عقیدت اور ان کے لیے ہمارا بہترین خراجِ عقیدت یہ ہے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں، باہمی اخوت و محبت، خیرسگالی، رواداری، قومی یکجہتی اور اتحاد و ہم آہنگی کو فروغ دیں اور ملک کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔

میں "نیا دور" کے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

حکم سنگھ
(حکم سنگھ)

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی
چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دنیا کی ایک عظیم رہنما، ہندستان کے کروڑوں عوام کی امید، بھارت رتن وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے تقریباً سولہ معرکتہ الآرا برسوں تک ہندستان کی قیادت کی اور ان کی موت بھی ویسی ہی ہوئی جیسی کہ گاندھی جی کی ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی ملک کے اتحاد اور یک جہتی کے لیے قربان ہوئیں۔

محترمہ اندرا گاندھی ناوابستہ اور تیسری دنیا کے ممالک کی علمبردار تھیں۔ عالمی سطح پر محبت و خلوص، امن و سکون دوستی و بھائی چارگی قائم رکھنے کے لیے انتھک کوششوں اور اپنی بے لوث قومی خدمات کے باعث آزاد ہندستان کی تاریخ میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک روشن باب کی رہے گی۔ انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے سے کچھ ہی دنوں قبل کہا تھا کہ وہ ملک کی ترقی اور فلاح کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نچھاور کرنے میں دریغ نہ کریں گی۔ یہ بات انھوں نے سچ کر دکھائی۔ ملک کو خوشحال اور لوگوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے وہ تا حیات سچی لگن اور جانفشانی کے ساتھ کوشش کرتی رہیں اور اپنی ان کوششوں کے دوران انھوں نے اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہ کی۔

گاندھی جی کا سانحہ اور جواہر لعل جی کی وفات بھی ملک کے لیے دو بڑے المیے تھے لیکن محترمہ اندرا گاندھی کی رحلت کا حادثہ زیادہ سنگین ہے۔

اندرا گاندھی نے ہمیشہ اس بات کو دہرایا کہ انھیں اپنے زندہ رہنے یا اس دنیا سے اٹھ جانے کی کوئی پرواہ نہیں، انھیں دراصل فکر اس بات کی تھی کہ ہندستان زندہ رہے، مضبوط ہے اور ترقی کرے۔ وہ یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ اندرا گاندھی کسی ایک خاتون کا نام نہیں بلکہ چند اصولوں کی نمائندگی کرنے والی شخصیت ہے۔ لہٰذا قوم اور ملک پر نچھاور ہو جانے والی رہنما کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے اصولوں، پروگراموں اور آدرشوں کو قومی ورثہ سمجھ کر اس کی حفاظت کریں تاکہ ہندستانی تہذیب کی روح برقرار رہے، خوشحال اور ترقی یافتہ ہندستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ ہمیں اندرا جی کی روح کی شانتی کے لیے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ ہندستان کی سلامتی اور سالمیت کے لیے ویسی ہی سرگرم کوشش کرنی چاہیے جیسی کہ محترمہ اندرا گاندھی زندگی بھر کرتی رہیں۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ماہنامہ نیا دور کا ایک خصوصی شمارہ محترمہ اندرا گاندھی کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ شمارہ ملک کی عظیم رہنما کی شخصیت کے گوناگوں اوصاف کو اجاگر کرنے اور قومی یک جہتی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

اخلاق الرحمٰن قدوائی

سید صباح الدین عبدالرحمن
ایڈیٹر، معارف، اعظم گڑھ

ایک عظیم تاریخ ساز شخصیت

شریمتی اندرا گاندھی اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہیں، کچھ نادان، وطن دشمن اور ناعاقبت اندیش مردوں کے پستول اور اسٹین گن سے نہیں بلکہ ان کی بے رحمی، بے دردی اور سفاکی کی گولیوں کا نشانہ بنیں اور راہی ملک عدم ہو کے سب سے رخصت ہو گئیں۔

دو مردوں نے ایک ۶۷ سالہ عورت کو اپنی بائیس ۲۲ گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ دنیا کے تمام مردوں کے مردانہ پن کی تذلیل کی، انسانیت کی گردن شرم سے جھکا دی اور وطن کی ناموس خاک میں ملا دی مگر خود شریمتی اندرا گاندھی کی عظمت، جلالت اور صولت میں چار چاند لگا دیا، ان کی وفات اپنی فطری موت سے ہوتی تو ان کی عزت، مقبولیت اور محبوبیت میں اتنا اضافہ نہ ہوتا جتنا کہ اب ہوا گلابوں اور سورج مکھیوں سے لدی ہوئی ان کی ارتھی بحری، ہوائی اور بری لشکریوں کے دستوں کی معیت اور لاکھوں عقیدت مندوں کے جلو میں روانہ ہوئی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی لاڈلی، ہندستان کی بیٹی اور سیاست کی دیوی اپنے میکے سے فنا کی سہاگن بنی ہوئی بے پناہ آنسوؤں کا جہیز لیکر وداع ہو رہی ہے بتیس سے زیادہ ملکوں کے ممتاز نمائندے ان کے احترام میں جھکے ہوئے تھے، مردوں اور عورتوں کا بے پناہ سوگوار ہجوم زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی فضا پر جب تک سورج کی روشنی چمکتی رہے گی چاند کی چاندنی پھیلتی رہے گی اور شبنم کے قطرے یہاں کے پھولوں کو تازہ اور شاداب کرتے رہیں گے۔ ہندستان کی تاریخ میں شریمتی اندرا گاندھی کا نام باقی رہے گا۔

کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے سپرد ہو جاتی ہیں مگر کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے سپرد زمانہ ہو جاتا ہے، اندرا گاندھی کی شخصیت ایسی تھی جس کے سپرد خود زمانہ ہو گیا تھا۔ ان کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج رکھا گیا تھا تو پورے ہندستان کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس تاج کی لاج کس طرح برقرار رکھیں گی مگر اقبال خود ان کی وزارت عظمیٰ کی مانگ پر افشاں چھڑکتا رہا، کامیابی خود بڑھ کر ان کی سیاست کے پاؤں میں چھاگل بنی رہی، عزم بالجزم ان کی قوت فیصلہ کا سہارا لیکر ان کی سیاست کے گلے میں مرصع کار ہار پہناتا رہا، اور اب جب کہ ان کی سیاسی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا ہے، مورخوں کو یہ لکھنے میں تامل نہیں ہوگا کہ ایسی سرگرم، متحرک، محنتی، جواں ہمت حوصلہ مند، نڈر، وطن کے کونے کونے کی خاک چھاننے والی، لاکھوں کے مجمع کو اپنی طرف کھینچنے والی دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہونے والی اپنے مخالفوں سے صبر و سکون کے ساتھ نبرد آزما ہونے والی، اپنی ناکامی کے باوجود از سر نو ابھرنے والی اور طرح طرح کے مسائل میں مبتلا رہ

گران کو حل کرنے کی کوشش کرنے والی حکمراں خاتون دنیا کی تاریخ میں شاید پیدا نہیں ہوئی۔

رومن امپائر میں کلیوپیٹرا، تھیوڈرا، زو، برونالٹ اور اورایرین اپنے زمانے کی سیاست پر چھائی رہیں، فرانس میں میری انٹونایٹ اور کیتھرائن اپنے ملک کی سیاست میں بہت نمایاں ہوئیں انگلستان میں ایلزبتھ، میری اور وکٹوریہ نے اپنی حکمرانی میں بڑا نام پیدا کیا، ہندستان کے اندر رضیہ سلطانہ، حبہ خاتون، بیگم ماہم، نورجہاں، درگاوتی اور تارا بائی کو اپنے زمانے میں بڑی شہرت ہوئی مگران تمام حکمراں خواتین کی سیاسی سرگرمیاں محلوں اور درباروں تک رہیں اس کے برخلاف اندرا گاندھی کی سیاست پارلیمنٹ کے ایوانوں، مخالف جماعتوں کی شدید مخالفتوں، انتخابات کے ہنگاموں سڑکوں گلیوں اور کوچوں کے طوفانی دوروں میں ابھری، اس لحاظ سے وہ ان تمام خواتین حکمرانوں پر فوقیت رکھتی ہیں، ان کی معاصر سیاسی خواتین میں اسرائیل میں گولڈا مائر، سری لنکا میں مسز بندرانائکے اور انگلستان میں مسز تھیچر وزارت عظمیٰ پر ضرور فائز رہیں، ان کے ملکوں کا رقبہ اور ان کی آبادی بھی زیادہ نہیں مگر اس کے باوجود اپنے اپنے ملک پر اس طرح حاوی نہ ہو سکیں جس طرح اندرا گاندھی ستر کروڑ کی آبادی والے ملک کے الجھے ہوئے صبر آزما اور ہمت شکن مسائل پر رہیں، اس لحاظ سے بھی ان کی معاصر حکمراں خواتین ان کی شہرت کے آگے ماند رہیں۔

تاریخ کی عظیم شخصیتوں کا جائزہ لینے میں جہاں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں، وہاں تنقید و تنقیص کی چنگاریاں بھی برسائی جاتی ہیں، اندرا گاندھی کے کارناموں کا بھی آئندہ جائزہ لیا جائے گا مگر ہندستان کی تاریخ عظمت کا ہار پہنا کر ان کو شہرت کے بقائے دوام کے دربار میں جو مقام دے چکی ہے اس سے ان کا بڑے سے بڑا ناقد اور مخالف بھی ہٹا نہیں سکتا۔

اب راجیو گاندھی کی طرف سارے ہندستان کی نظر اٹھی ہوئی ہے کہ اس بھاری ذمہ داری سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں حکومت آرڈی ننس کے ذریعہ سے بھی کی جاتی ہے، یہ پولیس کے ذریعہ سے بھی امن و امان قائم کرا لیتی ہے، فوج کے سہارے فسادات پر بھی قابو پا لیتی ہے ایسی حکمرانی تو بہت آسان ہے مگر دلوں کی تسخیر کر کے لوگوں پر حکومت کرنا آسان نہیں بلکہ مشکل ہے ایک حکمراں کا اصلی کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ جھک کر قدآور ہو مفتوح بن کر فاتح ہو، مغلوب ہو کر غالب ہو، راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کی آزمائش اس میں ہے کہ اس ملک کے ہر فرقہ بلکہ ہر آدمی کے لیے ان کے دل میں محبت کی گنگا اور اخلاص کی جمنا کس طرح بہتی ہے یہ قانون یا کاغذی تحریروں یا زبانی تقریروں سے نہیں بہہ سکتی بلکہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے سربراہ کی واقعی مخلصانہ، دردمندانہ اور ہمدردانہ حکمت عملی کی وجہ سے اس کے لیے ان کے دلوں کے اندر شیفتگی اور وارفتگی کے شہد کی نہر بہہ رہی ہے۔

دار المصنفین شریمتی اندرا گاندھی کی حسرت ناک موت سے اس لیے بھی سوگوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اس کو اپنی تشریف آوری اور لطف و کرم سے برابر نوازتے رہے، خود انھوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا اس لیے ان کی وفات کو یہ ادارہ اپنا بہت بڑا سانحہ سمجھتا ہے۔

میں اپنے عظیم بہن اور عظیم رہنما کو کبھی بھول نہیں سکتا اور میں مسز اندرا گاندھی کی موجودگی کے بغیر ہندوستان کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

——— یاسر عرفات
فلسطینی لیڈر

اِندرا گاندھی

مالک رام

موت سے کس کو رستگاری ہے۔ جو پیدا ہوا، وہ ایک دن ضرور مرے گا۔ تخلیق اور فنا لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے: کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ (۵۵: ۲۶) یعنی اس سطحِ زمین کی ہر ایک چیز فنا ہونے والی ہے۔ باقی تو وہ ہے، جسے کسی نے پیدا نہیں کیا، جو ازل سے ہے اور ابد تک رہنے والا ہے: وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵-۲۷) اور صرف تیرے رب کی جلال و اکرام والی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ اس دعوے کی تصدیق ہمارا مشاہدہ کرتا ہے۔ نسلِ انسانی اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں برسوں سے ہے، لیکن کوئی ایک مثال بھی نہیں دی جا سکتی کہ کسی شخص کو بالآخر موت نہ آئی ہو۔

پس، جب موت ابدی ہے، اور یہ حیاتِ ارضی عارضی ہے، اور اس کا کسی نہ کسی دن خاتمہ مقدر ہے، تو انسان کیوں نہ اسے کسی بڑے اور مہتم بالشان آدرش اور نصب العین کے حصول میں صرف کرے۔ اور اگر ضرورت آ پڑے، تو اس راہ میں اپنی جان تک قربان کر دے۔ ایسے آدمی مر کر بھی اموات کی ذیل میں نہیں آتے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔ وہ زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ان کی عظمت اور قربانیوں اور مثال کی اور شہادت کی قسم کھاتی ہیں۔

ایسی ہی ایک ہستی اندرا گاندھی کی تھی۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، یا جن خوش قسمت اصحاب کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کی شہادت دیں گے کہ اس دھان پان جسم اور مٹھی بھر ہڈیوں کے ڈھانچے میں کتنی آگ بھری تھی۔ میں نے نصف دنیا دیکھی ہے، اور بلا مبالغہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں معروف ہزاروں آدمیوں سے میرا واسطہ رہا ہے، میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے مطمحِ نظر سے ایسی گہری محبت کرنے والی، اور ایسی نڈر ہستی (عورتوں میں تو کیا، مردوں میں بھی) بہت کم دیکھی ہے۔ سیاست (اور وہ بھی عصرِ حاضر کی سیاست) پیشہ ہی ایسا ہے کہ انسان کو ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر رکھے رہنا پڑتی ہے۔ اندرا گاندھی اپنے عہدے کے باعث اور بھی معرضِ خطر میں تھیں۔ وہ ہر ایک کو خوش اور رضامند نہیں رکھ سکتی تھیں۔ انھیں آئے دن دھمکیوں کے خط ملتے رہتے تھے بلکہ ان پر واقعی حملے بھی ہوئے۔ لیکن کیا انھوں نے جان کے ڈر سے کبھی اپنے انتخاب کردہ راستے سے انحراف کیا! کیا اپنے اصولوں کی قربانی دے کر مخالف سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی! اور پھر ان اصولوں کی خاطر انھوں نے جو قیمت ادا کی، وہ بھی ہم سب کے سامنے ہے۔

ان کا نصب العین تھا، ہندستان کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا، اسے ترقی کی بلند سے بلند تر چوٹیوں تک پہنچانا، مختلف طبقوں میں باہمی اتحاد اور یکجہتی کی ایسی فضا پیدا کرنا کہ ان میں من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے۔ وہ اپنے دورِ اقتدار میں انھیں آدرشوں کے حصول کے لیے کوشاں رہیں۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ انھیں اس مقصد میں کتنی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔ اور یہ کام ایک دن، ایک سال یا کسی ایک شخص کی زندگی میں پورا ہونے والا بھی نہیں۔ اس کے لیے کئی نسلوں کو مسلسل جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی یادگاریں قائم ہوں گی، قائم ہونا بھی چاہئیں لیکن ان کی اصلی اور موزوں ترین یادگار یہ ہوگی کہ ہم میں سے ہر ایک یہ عہد کرے کہ ان کے نصب العین کے لیے جان لڑا دے گا تاکہ ان کا خواب پورا ہو سکے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق

*

میکش لکھنوی
بردلی - پوسٹ: کروندی
ضلع - بارہ بنکی (یوپی)

محترمہ اندرا گاندھی

ایک تاثر

پنڈت جواہر لال نہرو کے جدامجد پنڈت گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی کوتوال شہر تھے۔ ان کے صاحبزادے پنڈت موتی لال نہرو نے الہ آباد میں وکالت پاس کرکے اس وقت بین اقوامی شہرت حاصل کی جب ہندستان کی آبادی تقریباً پندرہ کروڑ تھی، پنڈت جواہر لال نہرو نے لندن میں بیرسٹر کی سند اس زمانے میں حاصل کی جب ملک کی آبادی بیس کروڑ کے قریب تھی، اس کے بعد ہندستان واپس آکر کانگریس میں شامل ہوئے اور ہندستان کو انگریزوں سے اس وقت نجات دلائی جب یہاں کی آبادی تقریباً تیس کروڑ تھی، اس کے بعد تقریباً ۱۷ برس تک ہندستان کے ہردلعزیز وزیراعظم کی حیثیت سے ملک پر حکومت کی، پنڈت نہرو کی وفات کے وقت یعنی ۱۹۶۴ء میں ہندستان کی آبادی زیادہ سے زیادہ پچاس کروڑ ہوگی۔ پھر مسٹر لال بہادر شاستری وزیراعظم بنے اور ان کے انتقال کے بعد مسز اندرا گاندھی نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور جنتا پارٹی کی ساڑھے ستائیس مہینے کی حکومت کی قلیل مدت کو چھوڑ کر ستر کروڑ کی آبادی کے عظیم الشان ملک پر تاحیات حکومت کی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پنڈت گنگا دھر نہرو، کوتوال دہلی سے لے کر محترمہ اندرا گاندھی تک نہرو خاندان نے ہندستان میں بتدریج جو ترقی کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی بڑی جہاندیدہ، غضب کی ذہین، دوراندیش اور محتاط خاتون تھیں۔ مگر جب وقت پورا ہو جاتا ہے تو بڑے سے بڑا محتاط انسان دھوکا کھا جاتا ہے، یہی اندرا جی کے ساتھ ہوا، بقول پرویز شاہدی ؎

بھانپے تو بہت آپ نے ہر موج کے تیور
کشتی میں جو پلتا ہے وہ طوفان نہیں دیکھا

وقت آگیا تھا اس لیے اندرا جی اپنے ہی محافظوں کے ناپاک ہاتھوں سے شہید ہوگئیں۔

ظالموں نے اندرا جی کو قتل کر دیا، مگر یہ لوگ محض آلۂ کار تھے اتنی زبردست سازش کرنا ہرایرے غیرے نتھو خیرے کا کام نہیں ہو سکتا۔ بقول حضرت منظرؔ لکھنوی ؎

مرگِ عاشق پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

ناممکن ہے کہ اندرا جی کے اصل قاتلوں کو منظر عام پر نہ لایا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سی بی آئی کی عقابی نظریں اپنا کام بڑی حد تک انجام دے چکی ہوں۔ چنانچہ تصور کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ مجرموں کے چہرے اترے ہوئے ہیں، حواس جواب دے چکے ہیں۔

ہماری محبوب وزیراعظم اب ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ہم اب بھی دعوے کے ساتھ کہہ سکتے کہ ایسی دیدہ ور، ہردلعزیز اور ذہین خاتون سطح ہستی پر نہیں ہے ؎

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

محمد عثمان عارف نقشبندی

اندرا گاندھی

طاقت وہی، ہمت وہی، جرأت تھی وطن کی
عزت وہی، شوکت وہی، عظمت تھی وطن کی
اس کے ہی تو کس بل پہ حفاظت تھی وطن کی
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

طوفان اٹھے گھر میں کہ سرحد پہ لگی آگ
آواز وہ دیتی تھی تو جاتا تھا وطن جاگ
جے ہند کے نعروں میں بدلتی تھی سبھی راگ
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

قانون کی آواز تھی دستور کی آواز
آواز کسانوں کی تھی مزدور کی آواز
آواز تھی وہ ہند کے جمہور کی آواز
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

دانش میں، تدبر میں، سیاست میں تھی کامل
وہ فرض کا احساس تھا محنت میں تھی کامل
وہ راج چلانے میں حکومت میں تھی کامل
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

وہ عزم تھا جی جاتی تھی طوفاں کے سہارے
منجدھار سے لے جاتی تھی کشتی کو کنارے
منزل اسے خود کرتی تھی بڑھنے کو اشارے
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

تھی مندر و مسجد کی کلیسا کی اسے لاج
گنگا کی اسے لاج تھی جمنا کی اسے لاج
بہنوں کی اسے لاج تھی ماتا کی اسے لاج
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

موتی کی چمک تھی تو جواہر کی دمک تھی
غنچوں کی لطافت تھی تو پھولوں کی مہک تھی
نغمہ تھی گلستاں کا وہ بلبل کی چہک تھی
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

سیکھی نہ تھی وہ اپنے اصولوں سے بدلنا
طے کرتی تھی جو راہ اسی راہ پہ چلنا
مضبوط ارادوں سے جھکنا نہ پھسلنا
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

دنیا کے مسائل پہ بڑی گہری نظر تھی
جنتا کی خبر اس کو حکومت کی خبر تھی
کرتا جو کوئی جنگ تو وہ سینہ سپر تھی
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

کیا کیا ہوا اس دور میں کیا اس کو گنائیں
ہر باب ہے تاریخ اگر اس کو بتائیں
دریا کو اسی بات سے کوزے میں سمائیں
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

ہر سرکش و مغرور کے سر کو جو کچل دے
وہ عزم کہ طوفان کے رخ کو بھی بدل دے
بیمار کو کمزور کو نادار کو بل دے
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

طوفانِ تباہی سے بچایا ہے وطن کو
خود بھی نہ جھکی اور نہ جھکایا ہے وطن کو
ہر طرح سے اونچا ہی اٹھایا ہے وطن کو
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

زریں ہے بہت اس کی قیادت کا زمانہ
دراصل یہ ہے ہند کی عظمت کا زمانہ
دہرائیں گی صدیاں یہ حکومت کا زمانہ
نیتا تھی حقیقت میں بڑی اندرا گاندھی

اب اُس کا لہو دیش کی رگ رگ میں رواں ہے

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی۔ وارانسی

شان اُس کی ہمالہ کی بلندی سے عیاں ہے
سمٹے تو وہ استھی ہے جو پھیلے تو جہاں ہے
جس شمع نے پروانوں کو دی زندگی تو
پروانے تو موجود ہیں وہ شمع کہاں ہے
پیغام کوئی اس کا رُکا ہے نہ رُکے گا
وہ چپ سہی تاریخ کے منھ میں تو زباں ہے
کل تک تو لہو اس کا تھا اس کے ہی بدن میں
اب اس کا لہو دیش کی رگ رگ میں رواں ہے
جو گولیاں کھا کھا کے سرِ راہ گری تھی
کتنوں کے لیے آج وہ منزل کا نشاں ہے
وہ کیسی گھنی چھاؤں ہمیں دے کے گئی ہے
آج اس کا لگایا ہوا ہر پیڑ جواں ہے
وہ اپنا جواں لال جسے سونپ گئی ہے
وہ قافلہ اب اور بھی تیزی سے رواں ہے
نازاں ہیں نذیرؔ اس پہ خواتینِ زمانہ
وہ ہند کی عورت ہے جو خاتونِ جہاں ہے
ہم سوختہ ساماں کا غم سب پہ عیاں ہے
بھارت میں چتا جلتی ہے دنیا میں دھواں ہے

اتنی جاگی فکرِ وطن میں
سو گئی جاکر شانتی بن میں

اِس طرح سے گذر گیا ہے کوئی
جیسے ہر گھر میں مرگیا ہے کوئی

جگن ناتھ آزاد
پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو
یونیورسٹی آف جموں
جموں توی ۱۸۰۰۰۱

مہاتما گاندھی سے اندرا گاندھی تک

گاندھی نے دے کے اپنا لہو، کل کی بات ہے
بخشا تھا اک نکھار تجھے اے وطن کی خاک
کیوں اتنی جلد پیاس تری پھر بھڑک اٹھی
دوروز ہی میں سوکھ گئی کیوں چمن کی خاک

شاید اسی لیے کہ شہیدوں کے خون سے
پاتی رہی ہے روح تری زندگی نئی
مجھ کو یقین ہے کہ پھر اس پاک خون سے
آئے گی تیرے چہرے پہ تابندگی نئی

یہ خوں جو آج پھر ترے دامن پہ ہے رواں
ہندوستاں کی روحِ مجسم کا خون ہے
صدق و صفا کا خون ہے، مہر و وفا کا خون
پاکیزگیِ حسنِ دوعالم کا خون ہے

یہ تو بجا، وطن کے شہیدوں کی بزم میں
آج اس کا مرتبہ ہے بلند اور مفتخر
یہ بھی بجا کہ اس کے لہو کی ہر ایک موج
ظلمات میں بنے گی تجلی کی رَو مگر

قاتل سے پوچھتا ہوں کہ یہ تو نے کیا کیا
قاتل سے پوچھتا ہوں گنہگار ملک و قوم
مارا اسی کو جس کی حفاظت تھی تجھ پہ فرض
آیا تھا تو تو بن کے وفادارِ ملک و قوم

ہندوستاں کی روح میں گولی اتار کر
اے کم شعور! تو نے نہایت بُرا کیا
بے کس بہادری کی نمائش کا یہ فتور
عورت پہ تو نے ہاتھ اٹھایا یہ کیا کیا

اس دور میں کہ جس کو کہیں ابتلا کا دَور
محفوظ تھا وطن کا وقار اس کے ہاتھ میں
ہر اک طرف کہ بادِ خزاں خیمہ زن تھی جب
پوشیدہ تھی چمن کی بہار اس کے ہاتھ میں

کیا خونِ بے گناہ اکارت گیا کبھی
خونِ شہید ہے یہ، کبھی رنگ لائے گا
پھلتا نہیں کسی کو بھی اس طرح کا جنوں
یہ خونِ بے گناہ اکارت نہ جائے گا

سیّد حامد
سابق وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

چند بکھرے ہوئے تاثرات

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے مشاہرے اور شرائطِ خدمت کی چھان بین کرنے اور اس کے بعد کمیشن کو اپنی سفارشات پیش کرنے کیلیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس کمیٹی نے مسئلہ پر غور و فکر کیا اور اساتذۂ جامعات اور ماہرین تعلیم سے مشورہ کرنے کے لیے اپنے اراکین کو مامور کیا۔ میرے سپرد وہ سب کمیٹی کی گئی جو جنوبی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ کرناٹک کے دورے کے بعد ہم لوگ کیرالا آئے۔ ماہرین تعلیم کے ساتھ ترِی وانڈرم میں ہمارے مذاکرات کا آج دوسرا دن تھا۔ کیرالا یونیورسٹی میں اس ریاست کے تعلیمی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے آ کر میرے کان میں یہ روح فرسا خبر پھونکی کہ مسز گاندھی پر آج صبح ان کے مکان میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جائی گئی ہیں۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ مسز گاندھی باوجود ان نکتہ چینیوں کے جو وقتاً فوقتاً ان پر کی جاتی رہی ہیں، اس وقت ہندوستان کی سب سے قدآور اور اہم ترین شخصیت تھیں۔ ہندستان میں پھوٹ ڈالنے والے اور فتنہ برپا کرنے والے عناصر اور رجحانات کو قابو میں رکھنا، ان ہی کا کام تھا۔ انھیں خدا نے وہ قامت اور بصیرت عطا کی تھی جو اتنے بڑے اور پرپیچ ملک کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے انھوں نے بڑی حد تک بہ حیثیت وزیر اعظم اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جس کی بنیاد ان کے عہد آفریں باپ نے ڈالی تھی ذاتی دیانت اور اعلیٰ ظرفی اور بلندیٔ معیار کی بدولت وہ سارے ہندستان کے لیے موجب احترام تھیں۔ ہندستان کی ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس ملی جلی تہذیب کی ترجمانی جس میں ہندستان کی رواداری اور اس کا وسیع ظرف شامل تھے اور جو جدید مغربی تہذیب کی شائستگیوں، رعنائیوں اور علم طرازیوں سے بھی مستنیر تھی، جس قرینہ اور جمال کے ساتھ اندرا گاندھی نے کی، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ وہ ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ماضی اس کے عبوری حال اور تابناک مستقبل کے لیے اس کے منصوبوں اور عزائم کی پیکر تھیں۔

نہرو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سونے کے نوالے اور سنہری شہرت کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ ہرچند کہ بچپن میں ہی سانس انھوں نے سیاست کے ماحول میں ہی لی، لیکن منظرِ عام پر وہ کانگریس کے صدر (۱۹۵۹) کی حیثیت سے آئیں۔ بہ حیثیت صدر کے ان کی کارگزاری نے

جمنا کی لہروں کو شعلہ بار نہیں کیا۔ اور بہ حیثیت وزیر اطلاعات (۱۹۶۴) بھی انھوں نے کارگزاری اور کارسازی کے کوئی ہوشربا نقوش تحریر کے اوراق پر ثبت نہیں کیے۔ بہ ظاہر ایک نازک سی کمزور سی، کم آمیز، کم آزاد حسین خاتون سے زیادہ توقعات کی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ جب یہ سنا گیا کہ وہ جواہرلال نہرو کی جانشین ہوں گی تو خیرخواہوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہوے۔

لال بہادر شاستری جی کے تاشقند میں اچانک انتقال کے بعد جب اندرا گاندھی کو وزارت عظمیٰ کے لیے چنا گیا تو دلوں میں طرح طرح کے اندیشوں نے سر اٹھایا: اس برصغیر کی مہار ایک نازک سی خاتون کے ہاتھ میں دے دینا کہاں کی دانش مندی ہے، حد ہو گئی خاندان پرستی کی! بعض نکتہ چینیوں نے کہا۔ اور شروع شروع میں ایوان میں نئی وزیر اعظم کی کارگزاری اور گفتگو میں عدم اعتماد، ہچکچاہٹ اور لکنت کے انداز ہمدردوں کی حوصلہ شکنی اور عام ہندستانیوں کی تشویش کے لیے کافی تھے لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا گیا، نقشہ بدل گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بظاہر نحیف و نازک خاتون خوش پوش خوش اطوار، خوش رو، نفاست پسند خاتون، دل بھی رکھتی تھی اور دماغ بھی اور آہنی گرفت بھی، وہ دل جس میں جرأت تھی اور وہ دماغ جو روشن تھا اور جس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ہاتھ جن کی پکڑ کبھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سکہ بیٹھتا گیا، اس کی آواز اور انداز میں اعتماد اور گفتگو میں روانی آتی گئی، اور پھر سیاست کی ڈور۔ یاں سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں آگئیں اور ان کے سوال پر جو رہنما اور وزراء اور با اثر اور مقتدر انسان تھے ان کی حیثیت دیکھتے ہی دیکھتے کٹھ پتلیوں کی سی ہو گئی۔ اس نے سیاست کے گر سیکھ لیے اور کہنہ مشق شاطروں کو پے در پے مات دی۔

اور وہ دن بھی آ گیا جب اس کا قد اس پارٹی سے بھی اونچا ہو گیا جس نے اسے اعلیٰ وزارت کے لیے چنا تھا۔ وہ پارٹی اس کی ذات سے کسب اقتدار و اعتبار کرنے لگی۔ ۱۹۶۷ اور ۱۹۷۲ میں اس کے شانوں پر کانگریس پارٹی نے عام چناؤ جیتا۔ ۱۹۷۲ سے تین سال پہلے اس نے بینکوں کو سرمایہ داروں کے شکنجے سے نکال کر قوم کے تصرف میں دے دیا تاکہ وہ خلق کی خدمت بھی کر سکیں کانگریس کے فرسودہ اصنام کو توڑ کر اس نے نئی کانگریس کی بنا ڈالی۔ اس کے نکل آنے سے پرانی کانگریس میں جان ہی نہ رہی اور بڑے بڑے بت سر کے بل گر گئے۔ اور ایسا ایک بار سے زیادہ ہوا۔

باوجود زبان کی نرمی اور لہجے کی شیرینی کے اس نے سب سے مناسب فاصلہ رکھا۔ جہاں کسی نے قریب آنے کی کوشش کی یا یہ ظاہر کیا کہ وہ وزیر اعظم کے مزاج میں دخیل ہے، وہیں اس کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کی نگاہ میں اپنی اہمیت کے پل باندھ سکے۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے دست نگر اور اس کی نگاہِ کرم کے طالب ہو گئے۔ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ کیا مجال کہ دوسرے اُف بھی کر سکیں۔

ایک انگریزی میگزین نے اسے ہندستان کی ملکہ (امپریس آف انڈیا) کہا تھا۔ اس کے بظاہر نازک ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت تھی۔ کہا جاتا تھا کہ کابینہ میں صرف ایک مرد ہے۔ اندرا گاندھی (اور وہ بھی مرد آہن)

مسز گاندھی کے شانے اتنے فراخ نہ تھے جتنے ان کے عظیم باپ کے اور نہ دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر لیکن انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ موثر تھیں۔ فیصلہ اور کام کی راہ میں وہ تکلف، مروت اور مراعات کو حائل نہ ہونے دیتی تھیں۔ فیصلہ کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور چالاکی اور سینہ زوری اور سازش کرنے والوں یا وزارت عظمیٰ کے خواب دیکھنے والوں کی سرکوبی انتہائی شائستہ چابکدستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پہ کوئی سخت لفظ نہ آتا، ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش اور سازشی کو پتہ چل جاتا کہ وہ آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعویدار کو اچانک پتہ چلتا کہ دروازہ اس پر بند کر دیا گیا ہے سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا جو معتوب یا مشتبہ ہوا وہ خواہ کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا۔ اپنا سا منھ لے کر واپس چلا جائے گا۔ اس طرح لوگوں میں احساسِ تناسب بنا رہا اور مرکزی شخصیت کے وزن و وقار کی بالاتری پر آنچ نہ آئی۔

خفگی یا اختلاف کا اظہار براہ راست شاذ ہی ہوتا۔ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کم ہی کی جاتی۔ آپ باتیں کر رہے ہیں کوئی بات اہم یا التفات کی مستحق سمجھی گئی تو سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ آپ کی فراست پر منحصر ہوتا کہ اس اٹھتی ہوئی نگاہ سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں اور ردّ عمل کی بابت کس قیاس کو راہ دیتے ہیں۔

اس نازک اور خوش اندام و خوش قطع عورت کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حکمراں کو رات دن اتنے بڑے بڑے گوناگوں حوصلہ شکن، آشوب مسائل کا سامنا نہیں کرنا

پڑتا جتنے کہ ہندستان کے وزیر اعظم کے حصہ میں آتے ہیں لیکن اندرا گاندھی ان مسائل و مصائب سے ہمیشہ تازہ دم نکلیں۔ ایسے مسائل کے بوجھ کے نیچے مضبوط سے مضبوط کمر ٹوٹ جاتی لیکن یہاں جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ وہی تازگی وہی تبسم، وہی سکون، وہی نفاست، وہی شادابی، وہی شگفتگی۔ گویا ایک نازوں کی پلی ہوئی خوشحال خاتون ہے جس کے چمن کو باد سموم اور جس کے دامنِ دل کو فکروں نے چھوا تک نہ ہو۔ جس کا منتہائے آرزو، خوش باشی اور خوش پوشی ہو، جس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ جو شخص بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ کون ہیں ان سے ملے اسے گمان بھی نہ ہو کہ اس خاتون نے زمانہ کے سنگین سے سنگین، پرآشوب سے پرآشوب، جگردوز سے جگردوز مسائل سے لوہا لیا ہے اور کسی ایسے ہی مسئلے سے نبرد آزمائی کر کے ابھی ابھی آرہی ہے۔ ریشم کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے، سن رکھا تھا لیکن نہ اتنی مضبوط کہ فولاد شرمائے نہ اتنی قاطع کہ سیوف کو رشک آئے۔

اس خوبصورت چہرے کی پاکیزہ کشش کو ہزاروں دلوں نے محسوس کیا ہے۔ نہ معلوم کتنے دل اس انتہائی دلآویز مسکراہٹ سے کھل اٹھے ہیں۔ وہ مسکراہٹ جو مونالیزا کے تبسم کی طرح پُراسرار نہیں لیکن اس سے زیادہ دلکش ہے۔ اور اسے سادہ نہ سمجھئے، پرکار بھی ہے اور رمز آلود بھی۔ کبھی اس میں پایان گفتگو کی آہٹ ملتی ہے، کبھی یہ دانستہ کوشش کر جانے والا بے التفاتی کا گلہ کرتا ہوا نہ جائے۔ کبھی بے محل بات کو ٹالنے کی تدبیر، کبھی دل موہ لینے کا حربہ، کبھی یہ فہمائش کہ ان چند لمحات سے زیادہ مقسوم نہیں ہیں تشریف لے جائیے۔

ایمرجنسی کے دوران اہل نفاذ نے زیادتیاں کیں جس کا خمیازہ مسز گاندھی کو بھگتنا پڑا۔ لیکن وہ سپر انداز نہیں ہوئیں۔ اس وقت سب یہ سمجھتے تھے ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اس وقت بھی ان کے حوصلے پر آنچ نہیں آئی، نہ سکون نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ جادو تھا کہ ویرانہ میں رہتے ہوئے بے منصب جاہ بھی اگر وہ کسی سفارتی جلسے میں چلی جاتیں تو سب لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے، برسرِ اقتدار وزیر خارجہ کو چھوڑ کر

مصیبت اور معزولی کے ان ایام میں کچھ لوگوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی خدمت میں برابر جاتے رہے۔ ایک روز بڑے امتنان کے ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شبنم کی بوندیں آہن کے حصار میں ہیں۔

راقم نے پہلی بار قریب سے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ اس طیارہ سے جس میں وہ سفر کر رہا تھا بمبئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد کئی ایک بار ان مجلسوں میں شریک ہوا جن کی صدر تھیں۔ ان میں سے ایک مجلس قومی یکجہتی کونسل کی تھی۔ ذکر مسلم اقلیت کے اعتماد اور خوشحالی کو بحال کرنے کا تھا۔ اس مجلس میں غفور صاحب (اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ) نے مذاکرہ میں شرکت کرتے ہوئے کہا تھا کہ محترمہ آپ

کسی مسلمان کو صدر یا چیف جسٹس بنائیں یا نہ بنائیں مسلمانوں کو تھانوں میں مامور ضرور کر دیجیے کیوں کہ اس کا بڑا اثر مسلمانوں کے احساس سلامتی و احساس اختیار پر پڑے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جب میں نے قبول کر لی تو وزیر اعظم سے ملنے گیا۔ رخصت کے وقت کہنے لگیں کہ آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ حوصلہ بڑھانے کا یہ ایک طریقہ تھا چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

آسان روی اور طوائف الملوکی کے بعد نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کا نفاذ متاثرہ عناصر کو گراں گزرا۔ ہنگامہ برپا کیا کہ شیخ جامعہ کے پیر اکھڑ جائیں یا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ طلبہ کے گمراہ سربراہوں نے کسی اشارے پر خاک و خون کی تیاریاں کیں۔ خود قلعہ نشین ہو گئے اور معصوم لڑکوں کو آگ میں جھونک دیا۔ پولیس کو دفاع میں گولی چلانا پڑی اور ایک معصوم عزیز کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہی ہو گیا جس کو بچانے کے لیے میں پے در پے جتن کرتا اور خطرے ٹالتا چلا آیا تھا۔ میں نے شدت غم میں استعفیٰ دینے کی ٹھان لی۔ یہ بات دلی پہونچی اور وہاں سے چشم زدن میں دبئی جہاں وزیر اعظم دورے پر گئی ہوئی تھیں ابھی دلی سے بات ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وزیر اعظم کا پیغام پہونچا کہ استعفیٰ دینے کا سوال نہیں ہوتا۔ ثابت قدم رہیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہندستان سے دور اہم امور میں گھرے ہونے کے باوجود مسز گاندھی نے میری ڈھارس بندھانے اور سبکدوشی سے باز رکھنے کا یہ اہتمام کیا۔ یہی نہیں دوسرے روز منھ اندھیرے اس وقت کے وزیر داخلہ (حالیہ صدر جمہوریہ) وائس چانسلر کے مکان پر تشریف لائے، بہ ظاہر بہ چشم خود حالات کو دیکھنے کے لیے، بہ باطن اسی پیغام کو دہرانے کے لیے۔ چند ماہ بعد مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی تو میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی اس خصوصی توجہ نے اس نازک وقت میں میرے دل کے تاروں کو چھو دیا تھا۔ ہر سانحہ کے بعد طالع آزماؤں نے یونیورسٹی کو اپنے ذاتی یا سیاسی مقاصد کے لیے تسخیر کرنا چاہا۔ میں سدِّ راہ بنا ہوا تھا چنانچہ تین سال تک لگاتار ایک گروہ میرے خلاف وزیر اعظم کے کان بھرتا رہا لیکن مسز گاندھی نے نہ رائے بدلی نہ رُخ۔ میں نے البتہ ان سے معذرت کی کہ میری وجہ سے ان کو الجھن میں ڈالا جاتا ہے۔ راقم سطور کے متعلق ان کی جو کچھ رائے رہی ہو اس سے قطع نظر ان کے انتظامی شعور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ احتجاج کی رو میں کسی وائس چانسلر کو سبکدوشی پر مجبور کر دیا جائے۔

اس دردناک سانحے کے بعد یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا تھا، جب کھولنے کا ارادہ کیا تو انتظامیہ نے ہامی نہیں بھری۔ ریاستی حکومت کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر یونیورسٹی کھلی تو بہت بڑا تصادم ہوگا! کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے احتجاج کر رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن کون سنتا تھا۔ جن حضرات نے یونیورسٹی بند کرانے کے ڈول ڈالے تھے ان کی آن تھک کوشش تھی کہ یونیورسٹی کھلنے نہ پائے، لڑکوں کا ایک سال تو ضائع ہو ہی جائے۔ پھر دیکھیں وائس چانسلر کیسے رکتا ہے۔ یہ گتھی بھی مسز گاندھی کے خاموش اشارے نے سلجھائی۔ وزارت داخلہ میں مجلسیں ہوئیں اور یونیورسٹی کھلی، اور سکون اور امن کے ساتھ پڑھائی ہوئی اور ضائع ہوتا ہوا سال موت کے جبڑے سے نکال لیا گیا۔

یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں بڑا ہجوم تھا۔ ضرورت تھی ان میں اضافہ کی۔ ایک عرصہ دراز سے کوئی ہوسٹل نہیں بنا تھا، کمیشن اور وزارت میں کون سنتا۔ یہاں بھی وزیر اعظم کی ذاتی دلچسپی نے دروازے وا کر دیے۔ اور انس زیر خطیر سے جو منظور ہوا تھا ایک نئے ہال کی خوبصورت عمارت کھڑی کر دی گئی جو علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس میں سات سو طالب علموں کے لیے جگہ ہے

یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے ۱۹۶۶ء سے ہندستان کے مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی۔ قربانیاں دیں، یہاں کی تعلیمی فضا مکدر ہو گئی۔ احتجاج کر کر کے لوگ تھک کے بیٹھ گئے۔ مرادآباد میں فسادات ہوئے۔ پھر علی گڑھ شہر میں، اور بازیابیِ کردار کی مانگ دب گئی۔ اس وقت جب یہ مطالبہ ایک عرصے فضا میں نہ تھا، اچانک یہ منظور کر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں ہے اور رہے گی لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی کا حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا۔ حالات کا یہ بھی ایک طنز ہے کہ ۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ نے جس کے ذریعہ مسلمانوں کا مطالبہ منظور ہوا اور روایتی کردار،

بحال کیا گیا۔ بالآخر ہدف اسی کو بنایا گیا جس کے لیے یہ ساری جدوجہد کی گئی تھی۔ بحث چمن خندہ زن ہیں کہ اقلیتی کردار کیا اسی کو کہتے ہیں۔

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

پھر ایک وقت آیا کہ ساری مرکزی یونیورسٹیوں کے لیے ایک مشترک ایکٹ کی تجویز کی گئی۔ یونیورسٹیوں کی خود اختیاری معرض خطر میں پڑ گئی۔ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ میں تو کہرام مچ گیا کہ ایک ہاتھ سے روایتی کردار دیا گیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک بڑی ریلی ہوئی۔ راقم نے اس ریلی کی صدارت کی اس کا رخ آئینی مانگ کی طرف موڑا اور کہا کہ ایک نمائندہ گروہ وزیر اعظم سے ملے، میں اس کی سیادت کو تیار ہوں۔ دوسری یونیورسٹیوں کی نگاہ بھی ہم پر تھی۔ چنانچہ بھان متی کے کنبہ کو لے کر راقم سطور مسز گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں تو یہ عالم تھا کہ تار باجا اور راگ بوجھا۔ میں نے اس اقدام کے مضرات کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ انھوں نے انتہائی شگفتگی کے ساتھ بات کی تہہ تک پہونچنے کی خبر دے دی۔ ہامی تو نہ بھری لیکن ہم مطمئن واپس آئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اس مشترک بل کا سراغ بھی کسی کو نہیں ملا۔ مسز گاندھی کے کام کرنے کا یہی انداز تھا۔ انہیں بات کی تہہ تک پہونچنے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی لیکن اس کا اعلان دوران گفتگو کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں ایک تو یہ کہ جب تک ان کا دفتر جس میں انھوں نے لائق ترین افراد کو جمع کر رکھا تھا، تجویز کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لے، کوئی حتمی وعدہ کرنا بعد میں دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ ملنے والوں کو ان کی جگہ پر رکھ سکتی تھیں تاکہ ضروری فاصلہ درمیان میں رہے۔ اور گفتگو سوال و جواب یا برابری کی سطح پر بات چیت کی شکل اختیار نہ کرلے۔ ان کا طور ڈالفن کا سا تھا جس کی پشت بقول شیکسپیر پانی میں رہنے کے باوجود تر نہیں ہوتی۔ اس بات پر اب اتفاق ہے کہ مسز گاندھی مشورہ بہتوں سے کرتی تھیں لیکن فیصلہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ابتدا میں لوگ سوچتے تھے کہ ان کے مشیران کے لیے فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نہیں، فیصلہ کیا ہو اور کب ہو، یہ سب کچھ وہ خود طے کرتی تھیں۔ فیصلوں کے ضمن میں ایک عالم ان کے انتخاب ساعت کا قائل تھا۔ صحیح وقت پر فیصلہ کرنے کے لیے ان کے پاس گویا ایک چھٹی حس تھی۔ بنکوں کو قومی تصرف میں لانے کا فیصلہ اتنا برمحل اور بر وقت نکلا کہ اس نے ہندستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس وقت سے ان کی سیادت کا سکہ چلنے لگا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے۔

ہر وہ شخص جو آگے بڑھنے اور دوڑنے چلنے کے لیے بے تاب ہو، وہ جمہوریت اور اہل کاروں کی آہستہ خرامی سے گھبرا جاتا ہے۔ کام اگر کرنا ہے تو ان تکلفات اور ضوابط اور لایعنی اور پرتاخیر موشگافیوں کو بالائے طاق رکھنا ہوگا۔ اندرا گاندھی نے بھی یہی کیا۔ لیکن سارا اختیار جب ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ اپنے خطرات بھی ساتھ لاتا ہے۔ پھر انسان دوسروں کی رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور رائے دینے والے بھی اپنی رائے کو صاحب اختیار کی رائے یا رجحان اور افتاد کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں، گویا صاحب اختیار آزادانہ اور پرخلوص رائے سے خود کو محروم کر لیتا ہے۔ اسے جو مشورہ ملتا ہے وہ خود اس کے رجحان کی پھیکی سی نقل ہوتا ہے۔ اپنی آواز کی گونج اس کے کانوں میں آتی ہے اور وہی بھلی لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ اور پیش آتا ہے، صاحب اختیار جو دراصل عوام سے طاقت اخذ کرتا ہے، ان سے کٹنے لگتا ہے، دور ہو جاتا ہے محصور ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ اندرا گاندھی کا ہاتھ عوام کی نبض پر تھا پھر بھی ان سے ان کا رابطہ وہ زندہ اور پیوستہ رابطہ نہیں رہا تھا جس کی بنا گاندھی اور نہرو نے ڈالی تھی۔ ان کو سلامتی اور تحفظ کے لیے ایک حد تک دامن کش اور روپوش رہنا پڑا۔

شروع میں کانگریس کے جن مکھیاؤں نے اندرا گاندھی کو وزیر اعظم کی گدی پر اس امید کے ساتھ بٹھایا تھا کہ حکومت اندرا گاندھی کی ہوگی اور راج وہ کریں گے، انھیں مایوس ہونے میں دیر نہیں لگی یہ "اتالیق" اسی سرعت کے ساتھ ہٹا دیے گئے جس سے نوخیز اکبر نے بیرم خاں کو اختیار اور راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اوّل تو وہ کام کرنے نہ دیتے؛ دوسرے نہرو کی بیٹی دوسروں کی تابع فرمان کب ہونے والی تھی تیسرے وہ اصلاحات جو غریبوں اور کمزوروں کے حق میں تھیں کہنہ دماغوں کو راس کیونکر آتیں۔

اشوک مترا نے جو ایک سکہ بند سول سرونٹ ہیں اور جنھیں

شعبۂ اطلاعات میں اندرا گاندھی کے ساتھ کام کرنے کا اور ان کی مجلسوں اور مشوروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے اسٹیٹسمین میں اپنے مضمون میں اندرا گاندھی کے بیکراں اختیارات کے مضر اثرات کا ذکر اس طور کیا ہے:

"۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے جس وقت دو ٹکڑے ہوئے جس سے سول سرونٹ کے اس حق پر جو آزادرائے دینے سے عبارت تھا، بندشیں لگنا شروع ہو گئیں۔ کمی اتفاق یا کمٹ منٹ کی اصطلاح نے معاملہ کو اور سنگین بنا دیا..... اندرا گاندھی یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت کرنا ان ہی کا فرض اور حق تھا۔ اور اسی اعتقاد کے مطابق ہندستان کے وفاقی نظام کے ڈھانچے کو توڑا مروڑا گیا۔ مسز گاندھی کا کارنامہ زبردست اور ہیبت آفریں ہے۔

اندرا گاندھی نے بہ حیثیت وزیر اعظم ۱۶ رسال کے عرصے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے ملک کے اتحاد پر جراحت نہ آنے دی۔ غریبوں اور کمزوروں کے لیے ان کا دل ہمیشہ پگھلتا رہا اور ان کا نصب العین غریبوں، پسماندوں، مظلوموں کو علم اور خوشحالی سے روشناس کرانے کا تھا۔ انھیں اپنے عظیم باپ کی طرح جو گرم جوشی تائید ملی، ان کی شخصیت میں جو کہربائی طاقت تھی اس کا راز نہ صرف اس روحانی عقیدت میں تھا جو ہندستانیوں کو نہرو خاندان سے تھی، وہ خاندان جو اپنے رنگ روپ قامت، جمال اور خد و خال کے لیے مشہور تھا۔ بلکہ اس احساس میں بھی کہ اتنے خوشحال اور آسائش خو افراد نے وطن کی آزادی کے لیے ساری آسائشیں اپنے اوپر حرام کر لیں اور ساری تکالیف کو گوارہ بنا لیا، اندرا گاندھی کی پرستش اس لیے بھی کی گئی کہ وہ عورت تھیں وہ عورتوں کے شعور اور امکانات کی علامت بھی تھیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس چیز نے جواہر لال اور اندرا گاندھی کی شخصیتوں میں وہ کہربائی سحر بھر دیا جسے کیرزما کہتے ہیں وہ اہل ہند کے دل میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک روشن مستقبل کا تصور رکھتے ہیں اور اصابتِ رائے میں وہ دیانت، ذہانت، لیاقت اور بصیرت سے لیس ہیں۔ وہ ریاستی، لسانی، مذہبی اختلافات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں۔ وہ ملک کو عہد حاضر کے شانہ بشانہ چلانے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب کو تعبیر میں بدلنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے ہندستان کو وسائل اور سائنٹفک اور ٹیکنیکل انفرا اسٹرکچر سے مضبوط کیا۔

وہ ایسی زبان بولتے ہیں جو ہندستان میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اتنے خوشحال اور نفاست پسند ہونے کے باوجود عوام پر جان دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے ناوابستہ ممالک کی سربراہی اعتماد اور قابلیت اور قرینہ کے ساتھ کی۔ اخوک مترا نے ۱۹۶۰ء میں اندرا گاندھی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس ڈھنگ سے کیا ہے" وہ شرمیلی اور لجائی سی تھیں۔ جاننے ان کے چہرے پر سرخی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ اور بولنے میں انھیں تامل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی تنہائی اور حفاظت میں گزری ہو۔"

میں نے ملاقاتوں کے دوران ان سے بات چیت کا آغاز بالعموم انگریزی میں کیا۔ اس خیال سے کہ فاصلہ رکھنے اور ضابطہ کو نباہنے کے لیے بیرونی زبان کارآمد ہے اور مادری زبان میں قرب اور بے تکلفی کا پہلو آجاتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے اردو کی طرف لے آئیں۔ شاید وہ ایک یوپی والے کی غیر مخلوط اردو سننا چاہتی تھیں جو شائستگی کے سبب آداب اور معنویت کی پرتیں اور لطافت کی تہیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ انھوں نے گزشتہ ساڑھے چار سال کے دوران یونیورسٹی میں کبھی مداخلت نہیں کی لیکن اس کے وائس چانسلر کی مدد اور پشت پناہی میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اگر کوئی صلاح دینی ہوئی بھی تو براہِ راست کبھی کچھ نہیں کہا۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اندرا گاندھی کی عظمت کو ان کی زندگی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ موت نے اس میں اضافہ کر دیا۔

ان میں کام کی لگن اور ریاضت کی صلاحیت لامحدود تھی۔ ٹیلی ویژن پر ان کے معالج، (معالج نہیں طبیب کہ ان کو علاج کی نوبت ہی نہ آئی تھی) نے بتایا کہ وہ روز سولہ سترہ گھنٹے کام کرتی تھیں۔ مشکلات کا وہ خیر مقدم کرتیں چیلنج کو دوڑ کر قبول کرتیں۔

میری اندرا گاندھی سے آخری ملاقات ۲۶ ر اکتوبر ۸۴ء کو ہوئی تھی ذاکر حسین کالج ٹرسٹ کی میٹنگ میں۔ بات بات سے شائستہ اور دلنواز شگفتگی اور خندہ جبینی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ آ رہی تھیں۔ شاید اس روز جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں وہ یہاں ہوتیں لیکن ایسا ہونے کو نہ تھا۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

بہ حیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔

وزیراعظموں میں وہی ایسی تھیں جنھیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار انھیں علی گڑھ آنے کی دعوت بھی دی۔ انھوں نے متبسم ہو کر ہامی بھر بھی لی۔ لیکن ہر بار آنا ٹل گیا کہ ایک گروہ کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ نہ آئیں۔ وہ یہاں آتیں تو انھیں زبردست خیر مقدم سے نوازا جاتا۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں۔ علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی کو ان کی صنف اور دلپذیر شخصیت اور ان کے حسن و جمال سے ایک لگتی اور وہ آتیں تو یونیورسٹی کو کچھ دے کر جاتیں۔ میں نے آخر میں انھیں لکھ دیا تھا کہ میں نے طے کر لیا ہے جب تک وزیراعظم نہیں آتیں میں تقسیم اسناد کا جلسہ (کونووکیشن) نہیں کروں گا۔ انھوں نے سوچا کہ جانا چاہیے مگر نہ آسکیں۔ اور جو امید بندھی تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔

اندرا گاندھی اپنے باپ کی طرح نڈر تھیں۔ ذاتی خطرہ کا انھیں احساس تک نہ تھا اور محنت سے دامن چرانا ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ چیلنج کو بنا آنکھ جھپکائے قبول کرتیں۔ خطرہ میں کود پڑنا ان کی ادا تھی۔ ٹیلی ویژن پر پی۔ ایس۔ سبھدرا جوشی نے بتایا کہ تقسیم کے ایام میں گھرے ہوئے اور ستائے ہوئے مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ نکلتیں اور بے دھڑک ان مجمعوں میں چلی جاتیں جہاں ہر لمحہ ان کی جان کا جوکھوں تھا۔ ڈاکٹر ماتھر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نگاہ جزئیات پر بھی اور وہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مامور تھے خاص خیال رکھتی تھیں ایک بار دورے پر ڈاکٹر ماتھر کی سال گرہ پڑی۔ اندرا گاندھی نے ایک خوبصورت سی نظم اس موقع کے لیے لکھی اور تبریک کے ہدیہ اور دلدہی کے وسیلہ کے طور پر انھیں بھیج دی۔

نہرو خاندان کی روایت کے مطابق انھیں اقلیتوں اور ہریجنوں اور آدی باسیوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح سے گہری دلچسپی تھی لیکن باوجود ان کی کوششوں کے یہ لوگ تیر ستم کا نشانہ بنتے رہے۔ مسلمانوں نے اکثر ان کا ساتھ دیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ آندھرا پردیش اور کرناٹکا کے انتخابات کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کچھ بے نیازی برتنا شروع کر دی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو گلہ مند کر دیا تھا۔ تاہم بحیثیت مجموعی انھیں مسلمانوں کی زبان، تمدن اور اطوار سے دلچسپی تھی جس کا تقاضا ان کے بچپن کا ماحول اور ان کا سیکولر اور جمہوری مزاج کرتا تھا۔

اندرا گاندھی کے ہمیشہ تازہ دم رہنے کے دو راز ہیں۔ کام میں انہماک اور کام کرنے کا حوصلہ اور اپنے اوپر غیر معمولی قابو اور ایک مرتب نظام زندگی۔ ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہوئی، ہر چیز ناپی ہوئی تلی ہوئی، مشکل کام قاعدہ سے کیا جائے تو سہل ہو جاتا ہے، آسان کام بے ڈھنگی سے کیا جائے تو زندگی خلش اور خلفشار میں گزرتی ہے۔ ان کی زندگی بہت مرتب اور منضبط تھی۔ اسی وجہ سے وہ مصروف رہتیں لیکن مصروف نظر نہ آتیں۔

۲ر نومبر کی شب میں تین مورتی اندرا گاندھی کے آخری دیدار کے لیے گیا۔ سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خوبصورت چہرا موت کے سایہ میں بھی خوبصورت نظر آرہا تھا اور وہ تراشے ہوئے خدو خال اپنے یونانی زاویوں کو لیے ہوئے اس آہنی قوتِ ارادی کا اعلان کر رہے تھے جس نے ۱۶ سال تک ہندستان کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیا اور جس نے اقوام عالم کی انجمن میں ہندستان کو مقام امتیاز عطا کیا۔ ذہن بیس سال پہلے کی طرف گیا جب ہم اسی طرح جواہر لال نہرو کو آخری خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لیے تین مورتی میں آئے تھے۔

ہر کمال کو زوال ہے۔ لازوال صرف خدا کی ذات ہے۔

(۲)

تاریخ پڑھنا اچھا ہے لیکن اس سے بھی اچھا ہے تاریخ بنانے میں مدد کرنا۔

جواہر لال نہرو نے اپنی چہیتی بیٹی اندرا کو یہ جملہ نینی جیل سے بھیجے ہوئے خط میں لکھا تھا۔ بیٹی کے نام باپ کے خطوط دو کتابوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ پہلی کتاب کا نام تھا 'ایک باپ کے خط بیٹی کے نام' دوسری کتاب کا نام ہے تاریخ عالم کی جھلکیاں۔ یہ خطوط انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ دوسری کتاب کے خاتمہ پر جسے لوٹنے، مکرر (پوسٹ اسکرپٹ) کے عنوان سے جو خط چھپا ہے اس میں جواہر لال نہرو نے اس بات کو مضحکہ خیز قرار دیا ہے کہ ایک ہندستانی باپ اپنی ہندستانی بیٹی کو خط لکھنے بیٹھے تو پتی اور اس کی مادری زبان میں نہ لکھے۔

تاریخ پڑھنے کا جہاں تک تعلق ہے اندرا کو استاد ایسا ملا جس پر بڑے بڑے مورخین کے شاگرد بھی رشک کریں۔ نہرو کے خطوں میں انسان کی تاریخ ابتدائے آفرینش سے تادمِ تحریر قلم بند ہے۔ کاتب نے مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک طائرانہ نظر انسانی تاریخ کے نشیب فراز اور اس کے معنی خیز اور عہد ساز موڑوں اور رجحانات پر ڈالی ہے۔ بظاہر ان خطوں کے لکھنے سے جواہر لال نہرو کا مقصد بیٹی کو تاریخ پڑھانا نہیں بلکہ اس کے اندر تہذیب کے ارتقا اور انسان کے اجتماعی محرکات و عوامل کا شعور پیدا کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی دلاری دختر کی اٹھان کو ایک ایسی نہج پر ڈال دیں جو اسے چھوٹی باتوں، تنگ نظریوں، واہموں، تعصبوں، وسوسوں اور خلفشاروں سے اوپر اٹھا دے اور اس میں وہ جرأت، بلندی نگاہ، وسعت قلب، مہم طلبی، خطر جوئی، وطن پرستی، انسان دوستی، طالع آزمائی، حوصلہ، اعتماد، تیز رفتاری اور مستقبل شناسی پیدا کر دے جو نہرو خاندان کا طرۂ امتیاز تھا اور جو خصوصیات خود جواہر لال نہرو کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ ہم آگے چل کر ان خطوں سے کچھ اقتباسات قارئین کی نذر کریں گے۔ اس انوکھے سلسلۂ خطوط کے متعلق یہاں اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا دوسرا مجموعہ "تاریخ عالم کی جھلکیاں" سات اوپر ایک ہزار صفحات پر حاوی ہے۔ طویل تاریخ نگاری کے درمیان باوجود فنکارانہ ضبط کے بیٹی کی محبت پھوٹ نکلتی ہے، وہ بیٹی جس سے باپ کو صیاد کے ظالم ہاتھوں نے دور کر دیا ہے۔ جواہر لال نہرو نے کبھی کہا نہیں لیکن انھوں نے یہ دیکھا ہوگا کہ بار ہا نہرو خاندان کی یہ چشم و چراغ ہندستان کی تاریخ بنانے میں کسی نہ کسی عنوان مدد ضرور کرے گی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کی بیوی سروپ رانی پوتے کے بجائے پوتی کی آمد سے ملول و مایوس ہیں، پنڈت موتی لال نہرو نے کہا تھا کہ کیا عجب جواہر اور کملا کی یہ بیٹی آگے چل کر ایک ہزار بیٹوں سے بڑھ کر نکلے۔

باپ کی نصیحت (بابت تاریخ سازی) جس سے ہم نے اس مضمون کا آغاز کیا ہے اور دادا کی پیش گوئی دونوں پوری ہوئیں۔ اندرا نے بڑھ کر عہد آفرینی اور تاریخ سازی کا حق ادا کر دیا اور مادرِ وطن نے اپنے ۶۵ کروڑ سپوتوں پر اپنی اور جواہر اور کملا کی اس بیٹی کو ترجیح دی۔ اندرا گاندھی نے، جیسا کہ حزبِ مخالف کے ایک لیڈر نے پارلیمنٹ میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کہا تھا، نہ صرف تاریخ سازی کی بلکہ جغرافیہ سازی بھی۔

جواہر لال نہرو جدید ہندستان کے معمار ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ حال شناس اور مستقبل اندیش تھے۔ اگر ان کی قد آور اور روشن دماغ شخصیت ہندستان میں طلوع نہ ہوتی تو کیا عجب کہ ہمارے وطنِ عزیز کا رُخ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف ہوتا اور ہم واہمہ پسندی، رجعت پرستی اور تنگ نظری کی تاریکیوں سے نکل ہی نہ سکتے۔ علوم اور صنعت اور ٹکنولوجی سے ہمیں کوئی لگاؤ ہی نہ ہوتا۔ یہ اس ملک کی خوش قسمتی تھی کہ اسے سترہ سال تک ایسے شخص کی رہنمائی ملی جسے تاریخ کا گہرا شعور، ارتقا کا شدید احساس، نظر کی وسعت اور پیشرفت کے لیے بے تابی ودیعت ہوئی تھی۔ جواہر لال کی خواہش تھی کہ ان کی لختِ جگر کی شخصیت بھی اسی سانچے میں ڈھلے اور اس کو پورا کرنے کا یہی طریقہ انھیں سجھائی دیا کہ جیل میں بیٹھے بیٹھے اپنی لڑکی کو خط لکھتے رہیں، قلم برداشتہ نہیں تیاری کر کے۔ ان خطوط میں تعلیم سے زیادہ تربیت ہے۔ ارتقا کے سفر میں انسان نے کیا کیا ہفت خواں طے کیے ہیں۔ انسان اپنے راستہ سے کہاں کہاں بھٹکا ہے۔ اس ظالم اور جاہل نے کیا جہالتیں کی ہیں، کون کون سے ظلم ڈھائے ہیں۔ اور یہ مظلوم آفت زدہ وقفِ جستجو انسان کس طرح فطرت کی طاقتوں پر غالب آیا ہے۔ یہ دلکش داستان سحر اور دلاویزی کے ساتھ ان صفحات میں سنائی گئی ہے۔ اندرا نے ارتقا کے سفر، دنیا کی وسعت، اقوام کے تنوع، دلیری، فراخ دلی، راست گوئی اور راست روی اور ثابت قدمی کے سبق ان خطوط میں پڑھے اور اس طور جذب کیے کہ وہ اس کی شخصیت کا جزو بن گئے۔ اس نے ابھی آنکھیں پوری طرح کھولی بھی نہ تھیں کہ آنند بھون سیاست کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ بھارت ماتا۔ بھارت ماتا کی جے اور انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے فضا بوجھل ہوگئی۔ وہ تین سال کی ننھی کی گڑیوں کی تربیت

تلقین اور اصلاح کے لیے) دھواں دھار تقریریں کرنے لگی۔ ان تقریروں میں ربط اور مفہوم جیسا ہوتا ہوگا ظاہر ہے لیکن انقلاب کی فضا میں سانس لینا، اور سیاست کی کشمکش میں آنکھیں کھولنا شخصیت اور کردار کی تشکیل پر شروع سے ہی اثر ڈالنے لگا۔ آنند بھون میں کانگریس کے سارے بڑے رہنما ٹھہرتے اور تدبیریں کرتے کہ جنگ آزادی اب کس ڈھنگ سے لڑی جائے۔ ماں باپ جیل چلے جاتے تو اندرا دادو دادا کے سایۂ عاطفت میں رہتی۔ ۱۲ برس کی ہوئی تو نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی بنائی جو بانر سینا (یعنی بندروں کی فوج) کہلائی۔ اس کا کام تھا سراغرسی کرکے ان ہدایت کا پتہ لگانا جو پولیس اور سیکور ٹی گارڈس (حفاظتی دستوں) کو حکومت کی طرف سے مجاہدین آزادی کے خلاف کاروائی کے لیے دی جاتی تھیں تاریخ کا یہ بھی ایک بڑا طنز ہے کہ یہ نوخیز لڑکی جب بڑی ہو کر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی وزیر اعظم ہوئی اور دنیا نے اس کی فراست اور انتظامی سیاست کا لوہا مان لیا، اس وقت خود اس کے سلامتی دستے (سیکورٹی گارڈس) نے دغا کر کے ان گولیوں کو جو اس کے تحفظ کے لیے تھیں اس کے تن نازک میں اتار دیا اور اس بڑی غداری کا ارتکاب کرتے ہوئے ان کے ذہن میں تھا کہ وہ ایک نیک کام کر رہے ہیں، ان کی اس خیانت نے پولیس پر ایک نہ چھوٹنے والا دھبہ لگا دیا۔ ستم ہے کہ باہر حفاظت اور سلامتی کے انتظام اتنے اعلیٰ، جدید اور مکمل اور گھر میں معمولی سی احتیاط سے اتنی غفلت ہندستان کی سب سے قیمتی زندگی غداری سے کہیں زیادہ نااہلی کی نذر ہوئی۔ اور عذر یہ تراشا گیا کہ خود شریمتی گاندھی نے سیکولرزم کے نام پر سکھ حفاظتی دستے کو ہٹانے نہ دیا۔ ایک پولیس افسر نے ہی اس پر تبصرہ کیا ہے کہ یہ غفلت نری چاپلوسی پر مبنی تھی۔ وزیر اعظم سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری ان پر تھی یا ان کی تحفظ کے لیے مامور وسیع انتظامیہ پر

(۳)

ہندستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، یہ تو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس شاید کم ہی کو ہو کہ یہ دشوار ترین جمہوریت بھی ہے۔ زبان و آہنگ، رنگ و نسل، مذہب و ملت، ذیات و مسلک، ذات پات کے بے شمار اختلاف اور ان کے بدلتے ہوئے اجتماعات نے یہاں کے کارِ کشور نگہداری کو جہانگیری اور جہانبانی سے زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ ماضی اور حال کی کشمکش ہی یہاں چکی کے دو پاٹوں کی طرح کسی کو پیس دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک طرف وہ عقیدے رسوم اور توہمات جن پر ہزاروں سال گزر چکے، دوسری طرف سائنس اور ٹکنولوجی کی وہ آؤ بھگت جس نے ہندستان کو سائنس یافتہ ملکوں کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ ایک جانب سادھوؤں، اور یوگیوں کی بھرمار، دوسری جانب کھرانا، نارلیکر اور چندر شیکھر جیسے سائنسداں جنھیں دنیا نے خلعتِ اعتراف عطا کیا ہے۔ ایک سمت اس دین کے ماننے والے جو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے، دوسری سمت وہ قبائل جنھوں نے مظاہرِ فطرت کے مقابل ابتدائی انسان کے ردِّ عمل کو اپنی زندگی میں منعکس اور اپنے عقاید میں محفوظ کر لیا ہے۔ جہاں جیٹ طیارہ اور بیل گاڑی شانہ بشانہ رواں دواں ہیں۔ جہاں چرخہ اور کرگھا بڑی بڑی فیکٹریوں پر انگشت نمائی کرتا ہے۔ جہاں افلاس، شدید اور شرمناک اور بسیط افلاس ایک محدود طبقہ کی دولتِ قارون اور بے حس اسراف کو گوارا کرتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کسانوں کی ایک کثیر تعداد کھیتی اسی انداز سے کرتی چلی آرہی ہے جیسے وہ چار ہزار سال پہلے کر رہی تھی اور جہاں سبز انقلاب کے باعث ایسے کاشتکار بھی ہیں جو سائنس کی بدولت زرخیزی کے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔ جہاں روحانیت پر فخر مادیت کی بدترین شکلوں کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ جہاں ایسے نفوس کا زرین سلسلہ جنھوں نے خود کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا ہے ان لوگوں کو پنپنے اور سماج میں عزت پانے سے نہیں روک سکتا جن کا دھندا کھانے کی اشیا، اور دواؤں میں آمیزش کی شرمناک ہلاکت خیزیوں پر مبنی ہے۔ جو ملک وسعت اور آبادی کی کثرت اور آب و ہوا اور اجناس و اثمار اور پیداوار کی گوناگونی کے لحاظ سے بجائے خود ایک براعظم ہے۔ جہاں کی قلب کشا وسعت تنگ دلی اور تعصب اور موروثی بدگمانی کی دیواروں کے باوجود زندہ ہے۔ اور سانس لے رہی ہے۔ جہاں قول اور فعل کے تضاد کو سندِ قبول مل چکی ہے۔ جس ملک کے لاشعور میں یہ بات ابھی تک جاگزیں ہے کہ آزادی اہل اختیار کے خلاف قدم اور آواز اٹھا کر حاصل کی گئی تھی۔ ایسے ملک کو زمان و مکان کے سارے فاصلوں

اور زبان اور عقیدے کے بے شمار اختلافوں اور ظن وگمان کی
ساری کرشمہ سازیوں کے باوجود ایک وحدت میں پروئے رکھنا
نظم وضبط اور اتحاد کے ساتھ قدم ملا کر چلانا اور یہ یقین دلانا کہ
کسی فرد، کسی جماعت، کسی مسلک کے ساتھ کسی ناانصافی کو چلنے نہیں
دیا جائے گا آسان کام نہیں ہے۔

شامتِ ہمسایہ نے ہندوستان کی حکمرانی کو اور زیادہ مشکل
بنا دیا ہے۔ پانچ سال کے ایک لوک سبھائی دور میں ہی اس بڑے
ملک کی باگ ڈور کو سنبھالے رکھنا اور کثرت کو وحدت اور اختلاف
کو اتفاق کا تابع فرمان رکھنا ایک بڑا کارنامہ ہوتا لیکن اس وسیع
ملک کی شیرازہ بندی سولہ سال تک کرنا اور اندرونی اور بیرونی
خطرات کا جم کر مقابلہ کرنا اور موافق و معاندین دونوں پر بہ
یک وقت فتح پانا اور وہ بھی ایک خاتون کا ایک ایسے ملک
میں جو بنیادی طور پر قدامت پسند ہے، ایسی بات ہے جس پر لوگ
عرصے تک حیرت کرتے رہیں گے۔

اندرا گاندھی کی ساخت، اٹھان اور ظاہری افتادِ طبع کو
دیکھا جائے تو یہ کارنامہ اور بھی حیرت انگیز نظر آتا ہے۔ ایک
نازک سی ہچکچاتی ہوئی۔ کم آمیز، خاموش اور خوبصورت خاتون
جس نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جسے خدا نے سب کچھ دیا
تھا۔ وجاہت، دولت، نفاست، عیش، آسائش، کس طرح
ہندوستان کے افلاس زدہ عوام کے دل کی یہ دھڑکن بن گئی، یہ
بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس نے کیونکر وہ آہنی عزم اور وہ
فولادی اعصاب پیدا کر لیے جو مصائب، مسائل، مراحل سے اس طرح
عہدہ برآ ہوتے جیسے دامنِ کہسار سے اتر کر ندی خوش خرامی کرتی ہوئی
نظر آتی ہے، روانی، سکون اور اعتماد کی تصویر۔

جواہر لال نہرو کی بیٹی نے بچپن میں کوئی ثبوت اس امر
کا نہیں دیا تھا کہ وہ عام لڑکیوں سے ممتاز ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی
کلیہ ہے کہ ضرورت، اجتماعی اور قومی ضرورت، وقتِ معین پر کسی عہد ساز
اور کارکشا ہستی کو ابھار لے ہی آتی ہے۔ یوں بھی ہمیں اندرا گاندھی
کی ابتدائی سادہ روی اور نزاکت و نفاست پر نہ جانا چاہیے۔ یہ بات
یاد رکھنے کے لائق ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرح نڈر، بہادر، جری اور
بے خوف تھی۔ اور یہ بہادری اور یہ ہمت اسے صرف اپنے باپ سے

نہیں بلکہ اپنی ماں کملا نہرو سے بھی ملی تھی۔ آخر الذکر قبل از وقت
اٹھ گئیں اور ان کی شخصیت سے ملک پوری طرح روشناس بھی
نہ ہو پایا۔ لیکن بیماری کے ایام میں انھوں نے زنداں کی زندگی کو
آرام اور علاج پر کھلی ہوئی ترجیح دی تھی۔

جواہر لال نہرو نے جیل سے بھیجے ہوئے ایک خط میں اپنی
بیٹی کو لکھا تھا کہ بیٹا تمہاری ماں کے سینہ میں شیرنی کا دل ہے۔

اندرا گاندھی نے آنکھیں کھولتے ہی اس فضا میں سانس
لی جس میں جنگِ آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ایامِ طفولیت
میں وہ بلا سوچے سمجھے نعرہ لگانے والوں کی ہمنوا ہو گئی۔ سارے
ہندوستان نے آگے چل کر اندرا کو اپنی تقریریں "جے ہند" کے نعرے
پر ختم کرتے ہوئے سنا۔ لیکن وہ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں
میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ آنند بھون میں اٹھتے بیٹھتے سوتے
جاگتے انقلاب کے تذکرے ہوتے، آزادی کے خواب دیکھے جاتے
اسے حاصل کرنے کے لیے منصوبے بنائے جاتے۔

بارہ سال کی ہوئی تو آزادی طلبوں میں نام بھی درج ہو گیا۔
ماں باپ جیل میں ہوں، ماں بیمار ہو۔ گھر بھرا اسیرِ انقلاب
ہو تو لڑکی کی پڑھائی کا سلسلہ کیسے جاری رہے۔ کملا نہرو علاج کے
لیے سوئٹزرلینڈ گئیں تو اندرا کا داخلہ وہاں کے اسکول میں کر دیا

گیا۔ پھر آکسفورڈ میں' سمر ویل "میں' اور پھر شانتی نکیتن میں۔ ہر بار طویل وقفوں کے بعد۔ اس وقت اندرا میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اسے دیکھ کر یہ شعر پڑھا جاتا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

(اس کے سر پر فہم و فراست کی بدولت اوج کمال کا ستارہ چمک رہا تھا)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بار رقابت کی رو میں یہ کہہ دیا تھا کہ آکسفورڈ میں اس کی طالب علمی اندرا کی طالب علمی سے کہیں زیادہ درخشاں تھی۔ لیکن انگریزی کی مثل ہے کہ ہر شے جو چمکتی ہے زرناب نہیں ہوتی۔ مرحوم کے المناک انجام سے قطع نظر اس کی خود پسندی' ذہانت' طلاقت اور طالع آزمائی نے اسے اس استقامت' اس اصابت رائے' اس وطن پرستی اور اس دوراندیشی اور وسعت نظر سے محروم رکھا جو اندرا کے حصہ میں آئی اس کے ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس بات کا راز ایک وقت بھٹو کی خود غرضی اور اندرا کی ہوشمندی سے ملتا ہے۔

مستقل' متواتر اور باضابطہ تعلیم کی کمی کو دو باتوں نے پورا کر دیا۔ ایک تو تجربہ نے۔ اور تجربہ بھی ایسا کہ کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے خلاف ایک بہت بڑے لیکن مجبور اور بے بس ملک کی جنگ آزادی کا تجربہ۔

جہاں تک اندرا گاندھی کے کردار کی تشکیل کا تعلق ہے دوسری بات کم اہم نہ تھی۔ جواہرلال نہرو کو یہ احساس مضطرب رکھتا تھا کہ ان کے جنگ آزادی میں تن من دھن لگا دینے اور بار بار اسیر فرنگ ہونے کی وجہ سے ان کی بیٹی کی تعلیم خاطر خواہ نہیں ہو پا رہی تھی۔ اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اندرا کو گھول کر پلا دیں وہ سب کچھ جو تعلیم اور تجربہ اور ورثہ نے خود انھیں سکھایا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی نہ صرف لائق میراث پدر ہو بلکہ ہندستان کے زریں' درخشاں اور گنگا جمنی ورثہ سے بھی بہرہ ور ہو' ایک تنگ نظر اور تہی ذہن وطن پرست کی طرح نہیں بلکہ ایسے محب وطن کی طرح جو دل میں تمام انسانیت کا درد رکھتا ہو' اور جس کی نگاہ ارتقائے انسانی کے امکانات پر ہو اور جس کی ساری ہمدردیاں علوم کی پیش رفت کے ساتھ ہوں' اور کمزوروں' مظلوموں' غلاموں' ستم رسیدوں کے لیے جس کا دل دکھتا ہو۔

اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جواہرلال نہرو نے اپنی چہیتی بیٹی پریادرشنی اندرا کو جیل سے خطوط لکھے۔ خطوط کیا تھے ایک سلسلہ تھا مضامین کا انسانی ارتقا اور پیش رفت کے متعلق۔ مکتوب نگار ان خطوط کے دوسرے مجموعہ کے دیباچہ میں جو تاریخ عالم کی جھلکیوں کے نام سے انگریزی میں شایع ہوا لکھا ہے۔

"میں نہیں جانتا کہ یہ خطوط کہاں چھپیں گے' اور آیا یہ چھپیں گے بھی یا نہیں کیونکہ آج کل ہندوستان کی عجیب حالت ہے' اور مستقبل کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے لیکن میں یہ سطور اس وقت لکھے دے رہا ہوں کہ اس کا موقع ہے قبل اس کے کہ اقدامات سد راہ ہو جائیں۔۔۔"

"زندان کی زندگی کے ایسے فائدے ہیں اس کے بدولت فرصت میسر آ جاتی ہے۔ اور فاصلہ بھی۔"

"یہ خطوط ذاتی ہیں اور ان میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جو صرف میری بیٹی کے لیے تھیں۔ اب میں ان کو نکال بھی نہیں سکتا۔۔۔

یہ سطریں دھاگے ہیں جنھیں ایک دھاگے میں پرو دیا گیا!"

آخری خط میں جو پس نوشت (پوسٹ اسکرپٹ) کے نام سے لکھا گیا ہے' مکتوب نگار رقم طراز ہے۔

"جمہوریت کے حدود کو اب ہمیں وسیع کرنا ہوگا تاکہ اس میں اقتصادی مساوات سما جائے۔ یہی وہ انقلاب ہے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔ وہ انقلاب جس کا مدعا اقتصادی برابری ہے۔ کیونکہ جمہوریت کے جسد میں روح اسی طرح پھونکی جاتی ہے' اور جس کا مقصد یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹکنولوجی کی پیش رفت کے

قدم بہ قدم چل سکیں۔
خطوط کا یہ سلسلہ اکتوبر ۱۹۳۰ء سے اگست ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔

یہ خطوط ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ زندانی ادب میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ اٹھارویں صدی کے انگلستان میں رچرڈسن نے ایسے ناول لکھے تھے جو خطوں پر مشتمل تھے بیسویں صدی کے ہندستان میں جواہر لال نہرو نے ایسی تاریخ لکھی جس کی ترکیب خطوں سے ہوئی تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ خطوط اور ان کے لکھنے والے کی شخصیت ہر زاویہ سے اندرا گاندھی پر اثر انداز ہوئی۔ اس کے باوجود کہ بیٹی نے زمامِ اختیار ہاتھ میں لینے کے کچھ عرصے بعد ہی اپنی راہ آپ نکالنا شروع کر دی، تاہم اس کی افتادِ طبع، زاویۂ نظر، رجحان اور شعور بیشتر اسی سانچے میں ڈھل گئے جو باپ نے وضع کیا تھا۔

اندرا گاندھی بڑی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ میراث اور ماحول نے ان پر ایک حد تک بڑائی عائد کر دی لیکن جو بڑائی بالآخر ان سے منسوب کی گئی اس میں ان کی لگن اور محنت کو بڑا دخل تھا۔ ان کو جب آل انڈیا کانگریس کی صدارت تفویض ہوئی (۱۹۵۹) اور جب انھوں نے وزارتِ اطلاعات کا بار سنبھالا (جنوری ۱۹۶۴ء) تو کسی امید افزا اٹھان کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔

۱۹۶۶ء میں جب وہ ہندستان کی وزیرِ اعظم بنیں تو ان کے چہرے پر حیا، تامل اور ہچکچاہٹ اور عدمِ اعتماد کی لہریں اور لکیریں دیکھی جا سکتی تھیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تامل اور ہچکچاہٹ کی جگہ فیصلہ اور اعتماد نے لے لی۔ اور اندرا گاندھی کی جرأت اور پیش قدمی اور سیاسی بصیرت اور طالع آزمائی پر ملک ایمان لے آیا۔ انھوں نے ایک ایسا حس پیدا کر لیا جو انھیں عوام کے احساسات اور ضروریات سے باخبر رکھتا تھا، اور جو انھیں یہ سمجھاتا تھا کہ اہم فیصلوں کے لیے سب سے مناسب گھڑی کون سی ہے۔ انھوں نے لوگوں کو ان کی جگہ پر رکھنا بھی سیکھ لیا، ان کھچڑیوں کی جو اہلِ سیاست پکاتے رہتے ہیں انھیں دم پر آنے سے پہلے خبر ہو جاتی۔ اپنی بابت اس تاثر سے بھی انھیں مدد ملی کہ سرکشی یا سازش یا بدخواہی کبھی معاف نہیں کی جائے گی۔

ان سطور کا نہ یہ مقصد ہے نہ ان میں یہ گنجائش کہ اندرا گاندھی کے کارناموں کا تذکرہ کیا جائے، دنیا جانتی ہے کہ انھوں نے ہندستان کو ایک شیرازہ میں باندھے رکھا۔ اسے سائنس، ٹکنولوجی، صنعت، انفرا اسٹرکچر، زراعتی انقلاب اور وسائل سے مضبوط کیا۔ ہندستان کے کمزور طبقوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ قدامت پسندی اور توہم پرستی اور تنگ نظری اور تعصب کے عساکر کو انھوں نے پیچھے ڈھکیلا۔ انھوں نے جرأت اور فراست کے ذریعہ منوا لیا کہ ہندستان برصغیر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ایشیا کے اہم ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ جوہری توانائی اور خلا پیمائی کی راہ میں بھی ملک نے قدم بڑھائے۔ اندرا کے کارناموں سے ملک کی عزتِ نفس کو شہ ملی اور ملکوں کی انجمن میں اس کی ساکھ بڑھی۔ ناوابستہ ممالک نے ہندستان کے یوگ دان کا اعتراف کیا۔

ہندستان نے اپنی تنظیمی صلاحیت کے ثبوت بھی عالم کو فراہم کر دیئے۔ بنگلہ دیش سے مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد ہندستان میں پناہ گزیں ہوئی۔ اس زمانہ میں مشہور ماہر اقتصادیات گیلبرتھ (GALBRAITH) جو ہندستان میں امریکہ کے سفیر رہ چکے تھے، دلی آئے اور پلاننگ کمیشن کے اراکین اور ماہرین سے یوجنا بھون میں ان کی گفتگو ہوئی جس میں راقم سطور بھی شریک تھا۔ گیلبرتھ نے کہا کہ "مہاجرین کی اس کثیر تعداد کو ٹھہرانے اور کیمپوں کو چلانے میں ہندستان نے غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، خود امریکا کی حکومت اتنے بڑے کام سے اسی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔"

اس کے بعد ہم نے ایشیائی کھیلوں اور ناوابستہ ممالک کی کانفرنس کا بار اپنے فراخ شانوں پر اس اعتماد سے لیا گویا پھول اٹھا رہے ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ اندرا گاندھی کے دور میں ہندستان کی بین الاقوامی قامت اونچی ہو گئی۔

اندرا گاندھی وزیرِ اعظم کی حیثیت سے پلاننگ کمیشن اور نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کی صدر تھیں۔ راقم کو اس کونسل کی مجلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ ان اہم مسائل نے اندرا گاندھی کو کبھی چیں بہ جبیں نہیں پایا۔ اس تابناک چہرے سے اعتماد اور شگفتگی اور آساں روی کی تحریریں کبھی مٹنے نہ پائیں۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور نقش کی طرف اشارہ کروں گا جو دماغ میں محفوظ رہ گیا ہے۔ رمضان شریف میں اندرا گاندھی افطار کے لیے مدعو کیا کرتی تھیں۔ شریک ہونے والوں میں اسلامی ممالک کے سفیر، مقامی آفیسر اور شہر کے مقتدر مسلمان ہوتے۔ ہجوم نہ ہو، اس لیے دو یا تین قطعوں میں دعوت کا مرحلہ طے کیا جاتا۔ افطار کی دعوت حیدر آباد ہاؤس کی عالی شان عمارت میں ہوا کرتی تھی۔ معزز میزبان بہ نفس نفیس جزئیاتِ تواضع پر نگاہ رکھتیں۔ افطار کے لیے خوش پوش خدام کھجور اور شربت لے کر آتے۔ ہر بات قرینہ سے کی جاتی مسز گاندھی کی ہمہ گیر نظر سارے مہمانوں اور ان کی ضروریات کو اس انداز سے احاطہ میں لیتی جس میں وقار کا فاصلہ ہوتا اور مہمان نوازی کا قرب۔ سمجھے جانے میں شان کجکلاہی کی تھی۔

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اِدھر افطار شروع ہوتی اُدھر میزبان خود اس انتظام میں لگ جاتیں کہ وضو کا اہتمام ہے اور صفیں بچھا دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے معمولات و مشاغل کی طرح یہ پروگرام بھی پہلے سے ڈھلا ہوا رہتا لیکن،

وہ اک نظر جو بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

———— مہمانوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے

———— نماز کے بعد کھانے پر پر تکلف ضیافت ہوتی۔ سارا پروگرام ایک ایک پل تک درست لیکن کسی کو یہ احساس نہ ہوتا کہ میزبان یا محفل خوش خرامی یا خوش وقتی اور آساں روی سے محروم ہیں۔ عجیب سُرعتِ خراماں تھی کہ وقت کی تیز روی یا تنگدامانی ایک آن بھی محسوس نہ ہوتی۔ رفتار تیز ہونے کے باوجود کشائش اور کشودگی کی فضا بنی رہتی۔ یہ تیز رفتار آساں روی، یہ پُر حرکت سکون، گزرتے ہوئے وقت کا یہ دلفریب پھیلاؤ، یہ خنک گرمی، یہ سادہ پُرکاری، یہ سب وہ ٹھنڈی شعاعیں تھیں جو میزبان کی شخصیت، اس کے اوقات کی تراش خراش، اس کی تربیت یافتہ تجربہ، ریاضت، عالی ظرفی اور اعتماد سے پھوٹ کر ساری محفل کو اپنی آغوش میں لے لیتی تھیں۔

ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو کے دوران میں اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ وہ بچی جس کے والدین اکثر اسیرِ فرنگ رہتے ہوں، شروع سے ہی فیصلے کرنے پر مجبور اور اس کی خوگر ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول دونوں نے اندرا کو فیصلہ کی فراست اور صلابت سے لیس کر دیا تھا۔ گویا یہ ساری تیاری اس زمانے کے لیے تھی جب یہ بچی سولہ سال کے طویل عرصے تک دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گوناگوں جمہوریت کی پاسبان بنے گی۔

اندرا گاندھی کا خمیر ریاضت اور جرأت سے بنا تھا وہ ریاضت جسے ولولے اور باقاعدگی نے تھکن سے کوسوں دور رکھا تھا۔ وہ جرأت جو خاموش اور بے صدا تھی۔ ایک صاحب نے جو بہ حیثیت ایک معتمد رہبر اور بزرگ رفیق کے ایک انتخاب میں اندرا گاندھی کے پروگرام کے ذمہ دار رہے تھے بتایا کہ انھوں نے نیم شب تک کا پروگرام رکھا۔ اندرا گاندھی نے اصرار کر کے ۱۲ بجے رات کے بجائے ڈھائی بجے صبح کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروگرام صبح پانچ بجے ختم ہوا۔ اور آخری جلسہ والے صبح تک انتظار کرتے رہے۔ اور خود اندرا گاندھی جنھوں نے ایک دن سے دوسرے دن کو ملا دیا تھا ذرا سے وقفہ کے بعد دوسرے دن سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو گئیں۔

ایک اور ایسے ہی بزرگ نے جن کی سفارت کی رانہ بصیرت کا ایک جہاں قائل ہے، فرمایا کہ ان کی ایک تجویز پر غور کرنے کے لیے جو انھوں نے نیم شب کے بعد بھیجی تھی دوسرے دن سویرے ہی انھیں یاد کیا گیا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ وہ تجویز تو آج اس وقت آپ کے سامنے آتی جب آپ تیار ہو کر اپنی میز پر بیٹھتیں۔ فرمایا کہ انھوں نے ایک طریقہ نکالا تھا کہ اہم کاغذات اس وقت بھی ان کے پاس پہنچ جائیں جب وہ آرام کرنے کے لیے چلی گئی ہوں۔ یہ اس ہستی کا شیوہ ہے جو سترہ اٹھارہ گھنٹے روز کام کرتی تھی۔ کام کو اجازت تھی کہ آرام کے اوقات پر بھی چھاپہ مارا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی محنت اور اس قدر تناؤ اور کش مکش کے باوجود وہ تھکی کیوں نہ تھیں شاداب و شگفتہ و تازہ دم ہونے کے بجائے پریشان اور آشفتہ حال کیوں نہیں نظر آتی تھیں۔ اس کا جواب ایک تو مقصدیت میں ملے گا جس کا نشہ ہر درد سر کے لیے تریاق ہے، دوسرا انضباطِ اوقات و معمولات

میں جو تضیع وقت کی کوفت اور بے بسی کے احساس سے بچاتا ہے، تیسرا اس سرور اور توانائی میں جو کامیابیوں کا ایک سلسلہ اپنے جلو میں لاتا ہے؛ چوتھا اس طاقت اور انبساط میں جو رہنما اپنے کثیر تعداد پیروؤں کی عقیدت، محبت اور تائید سے حاصل کرتا ہے، اور پانچواں اس دیبی صفت، اس خداداد صلاحیت، اس مضبوط ریڑھ، ان فولادی اعصاب، میں جو اللہ تعالےٰ اپنے ان بندوں اور بندیوں کو عطا کرتا ہے، جن کے ہاتھ میں وہ اپنی مخلوق کی باگ دے دیتا ہے۔

میں نے شروع میں اس مراسلاتی تعلیم و تربیت کا ذکر کیا تھا جو اندرا گاندھی کو اپنے فخرِ روزگار باپ سے ملی۔ اس خیال سے کہ قارئین کو ان خطوط کی نہج کا اندازہ ہو جائے، میں چند اقتباسات درج کر رہا ہوں۔

احیائے علم

۵ اگست ۱۹۳۲

وہ ہنگامہ اور افراتفری جس نے سارے یورپ کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، احیائے علم[۵] کے برگ و بار لائی۔ اس کی شروعات سرزمینِ اطالیہ سے ہوئی لیکن بصیرت اور غذا کے لیے اسے صدیوں کی مسافت طے کر کے قدیم یونان سے رجوع کرنا پڑا۔ یونانِ قدیم نے اسے حسن سے محبت کرنا سکھایا، اور خود اس نے جسمانی حسن میں ایک شے کا جو زیادہ گہری تھی اضافہ کیا۔ یہ شے ذہن اور روح سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ شہر میں پیدا ہوئی اور شمالی اطالیہ کے شہروں نے اسے پناہ دی اور پروان چڑھایا۔ فلورنس خصوصاً ابتدائی نشاۃ ثانیہ کا مخزن بنا۔

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں فلورنس میں دانتے (DANTE) اور پیٹراک (PETRARCH) پیدا ہوئے، جو اطالوی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فلورنس ایک عرصہ تک یورپ کا مالی دارالسلطنت تھا۔ یہ بڑے بڑے مہاجنوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ یہ مالدار آدمیوں کی چھوٹی سی جمہوریت تھی جو اکثر اپنے بڑے آدمیوں کے ساتھ برا برتاؤ روا رکھتے تھے۔ اس شہر کا نام ہرجائی یا گرگٹ فلورنس پڑ گیا تھا۔ لیکن مہاجنوں، ظالموں اور جابروں کے تسلط کے باوجود اس شہر نے پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں تین بہت بڑے آدمی پیدا کئے۔ لیونارڈو دا ونچی[۱]، مائکل انجلو[۲] اور رافیل[۳] تینوں کے تینوں بڑے فنکار اور مصور تھے۔ اور پہلے دونوں کئی دوسرے زاویوں سے بھی بڑے تھے۔ مائکل انجلو ایک عظیم سنگتراش تھا۔ وہ سنگ مرمر کی چٹانوں سے دیو قامت پیکر تراشتا تھا، اور وہ ایک عظیم معمار اور آرکیٹکٹ بھی تھا۔ روم کا عظیم الشان سینٹ پیٹر کلیسا بیشتر اسی کا کارنامہ ہے۔ وہ نوے سال تک جیا اور مرتے دم تک اس کلیسا پر کام کرتا رہا۔ وہ ناخوش جیا، سدا بے چین رہا۔ ہر وقت سطح کے پس پردہ حقیقت کی تلاش مضطرب رکھتی۔ وہ ہر لمحہ سوچتا رہتا، ہر وقت حیرت انگیز کاموں سے نبرد آزما ہوتا۔

عمر کے لحاظ سے ان تین بڑوں میں سب سے بڑا لیونارڈو تھا اور کئی اعتبار سے ان سب سے زیادہ محیر العقول بھی۔ مصوری دماغ سے کی جاتی ہے، ہاتھ سے نہیں "یہ اسی کا قول ہے۔ بہت بڑا مصور اور سنگتراش ہونے کے علاوہ وہ ایک عظیم سائنسداں اور مفکر بھی تھا۔ کوئی گھڑی ایسی نہ گزرتی جب وہ کوئی نہ کوئی تجربہ نہ کرتا، کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کوشش نہ کرتا اور اشیا اور حوادث کے اسباب و علل ڈھونڈنے میں سرگرداں نہ ہوتا۔ وہ ان بڑے سائنسدانوں میں سب سے پہلا ہے جنھوں نے جدید سائنس کی نیو ڈالی۔ اس کا قول تھا کہ شفیق فطرت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ دنیا میں جہاں جائیے کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور مل جائے گی..... قدرت کے علاوہ خود بھی اپنا استاد تھا۔ لاطینی زبان اور ریاضی اس نے تیس سال کی عمر میں سیکھنا شروع کی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ ایک عظیم انجینئر تھا۔ اور اس نے خون کی گردش کا پہلی بار پتہ بھی اسی نے لگایا۔ جسم کی ساخت نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوا "کہ خبیث اور درشت لوگ جن کی عادتیں بری ہیں اور جن

---

[۱] LEONARDO DAVISCI [۲] MICHEL ANGELO [۳] RAPHAEL

[۵] RENAISSANCE

کی نظر سطحی ہے' انھیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ انھیں انسانی جسم جیسا خوبصورت پراسرار اور گرانقدر مکان رہنے کے لیے ملے۔ ان کے لیے تو کافی ہوتا بورے کی طرح کا بدن جس میں غذا داخل ہو سکتی اور اس میں سے نکل سکتی۔ کیونکہ ان کا مقصد غذا حاصل کرنا اور بالآخر نکال دینا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ بازار سے چڑیاں خریدتا اور انھیں آزاد کر دیا کرتا۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ کوششیں تھیں جو لیونارڈ نے پرواز کے لیے کیں۔ وہ کامیاب تو نہیں ہوا لیکن اس راہ میں اس نے کافی مسافت طے کر لی۔۔۔: اس کی زندگی فطرت کے ساتھ پیہم ایک مکالمہ تھی: وہ ہمیشہ سوالات کرتا رہتا اور تجربے کر کے ان کے جواب ڈھونڈتا رہتا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر آن ہاتھ بڑھا کر مستقبل کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔"

فلورنس کی تاریخ سازشوں' بدذات حکمرانوں اور جابر شاہزادوں کے وجود سے داغدار ہے' لیکن ہمیں یہ سب کچھ گوارا ہے اور اس کے خون چوسنے والے حاکم بھی' صرف اس لیے کہ اس شہر نے ہمیں اتنے بڑے بڑے لوگ دیئے۔۔۔ جب ہم خوبصورت شہر سے گزرتے ہیں تو ماضی زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم "دانتے" کو جاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں اور اس کی محبوبہ بیٹرس[1] کو جو ہوا کو شمیم بیز کرتی ہوئی جا رہی ہے۔ سامنے تنگ گلی میں لیونارڈو جاتا ہوا نظر آتا ہے' خیالات میں گم' زندگی اور قدرت کے اسرار و رموز پر غور و فکر کرتا ہوا۔

بہ تدریج نشاۂ ثانیہ سفر کرتی ہوئی دوسرے مغربی ممالک پہنچ گئی۔ بڑے بڑے فنکاروں نے پتھر اور کنوس میں جان ڈال دی یوروپ کی گیلریاں اور میوزیم ان کی تصویروں اور مجسموں سے لبریز ہیں۔ سترہویں صدی میں ہالینڈ نے بڑے بڑے مصور پیدا کیے ان میں سے ریمبراں[2] خصوصاً قابل ذکر ہے اور اسپین میں ویلاسکویز[3]۔۔۔۔۔ اگر تمہیں ان بڑے چترکاروں میں دلچسپی ہے' تو گیلریوں میں جاؤ اور ان کی تخلیقات کو دیکھو۔

اس دور میں سائنس آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ کلیسا سے اس کی سخت لڑائی ہوئی۔ کیونکہ کلیسا سوچنے اور تجربہ کرنے کی عادت کے خلاف تھا۔ اس کے مطابق دنیا کائنات کا مرکز تھی اور سورج اس کا طواف کرتا تھا اور ستارے آسمان میں جڑے ہوئے تھے۔ کوپرنکس[4] نے اس عقیدہ سے اختلاف کیا اور یہ ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس طرح اس نے کائنات کے متعلق جدید تصور کی بنا ڈالی۔۔۔ برونو کو چرچ نے ۱۶۰۰ میں روم کے اندر نذر آتش کر دیا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ آخر دم تک اصرار کرتا رہا کہ زمین' سورج کا طواف کرتی ہے اور ستارے خود خورشید ہیں۔ اس کا ہمعصر گلیلیو[5] جس نے دوربین بنائی' نسبتاً کمزور نکلا۔ جان بچانے کے لیے اس نے اس عقیدہ سے برملا توبہ کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی نہیں۔ اسے تاہم کافی عرصہ زنداں میں میں گزارنا پڑا۔

سولھویں صدی کے ممتاز سائنسدانوں میں ہاروے[6] تھا۔ جس نے بالآخر دورانِ خون کے نظریہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ سترہویں صدی میں ہمارے سامنے سائنس کا ایک عظیم ترین نام آتا ہے: اسحٰق نیوٹن[7]۔ وہ ایک بہت بڑا ریاضی داں تھا جس نے کشش ثقل کے قانون کا انکشاف کیا یعنی چیزیں گرتی کیوں ہیں اور اس طرح قدرت کے سربستہ رازوں میں سے ایک کو پالیا۔

وہ ناوابستہ تحریک کی روح رواں' دولت مشترکہ کی اہم سیاسی رہنما اور نیوزی لینڈ کی بہت اچھی دوست تھیں۔

ڈیوڈ لانگ

(وزیر اعظم نیوزی لینڈ)

---

[1] BEATRICE [2] REMBRANT [3] VALASQUEZ [4] COPERNICUS [5] GALBLIO [6] HARVEY [7] ISAAC NEWTON

ظ ۔ انصاری
۳۲ شیریں نزد کولابہ
پوسٹ آفس بمبئی ۔ ۵

قتل کی رات اور بعد کی ایک سوچ

۳۱ اکتوبر کو دن کے کوئی گیارہ بجے مغربی دہلی میں ایک نوجوان نے گھبرائے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے فون کا پیغام مجھے سنانے کے لیے دُہرایا۔ Z.G. IS SHOT DEAD اس کا بھائی صفدر جنگ تھانے میں ملازم ہے غالبًا۔

میرے پاس دو سردار جی بھی کھڑے تھے اور پراپرٹی کے لین دین کی بات چیت میں منہمک تھے۔ ان کے کان تک آواز نہیں گئی۔ دوسری طرف ایک گپتا جی آئرن مرچنٹ تھے، انھوں نے دریافت کیا: "کیا کہا اس شخص نے؟" میں نے جواب دیا: "کچھ نہیں۔" پھر ہم گپتا جی کی کار سے روانہ ہونے لگے تو میں نے قریب کے بنگلے سے اپنا سامان بھی اٹھا کر کار کی ڈگی میں رکھ لیا۔ انھوں نے کہا: "یہ کیا؟" میں نے ٹپیا: "کچھ نہیں۔" اگر شہر میں خریداری کرتے وقت زیادہ دیر ہوگئی۔ تو وہیں سے اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ اور آج بمبئی واپسی کا ارادہ ہے۔"

تینوں حاضرین نے سمجھا کہ ابھی تین چار گھنٹے تک تو بمبئی کے لیے کوئی گاڑی ہے نہیں۔ اور پھر دن کے دن ریزرویشن نہیں مل سکتا۔ میں نے دبی زبان سے کہا کہ "آج مل جائے گا راجدھانی سے۔" بات ختم۔

میرے چہرے سے، لب و لہجے، حرکات و سکنات سے تینوں میں کسی کو بھی گمان نہ گزرا کہ کوئی بڑا سانحہ ہوگیا ہے۔

شہر کے باہر باہر گھوم گھام کر جب میں چاندنی چوک کے پنجاب نیشنل بینک پہنچا تو گپتا جی نے پوچھا۔ بازار میں کچھ ہلچل سی نظر آتی ہے؟ میں اوپر گیا، بینک سے رقم لی اور رقم دی۔ اتر کر آیا تب تک انھیں خبر مل چکی تھی، گولی چلنے کی۔ انھوں نے اضطراب کے عالم میں مجھے بھی سنائی اور جب دیکھا کہ اس بے حس آدمی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تو آخر بزنس مین تھے، سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟"

"ہاں ہفتوں، مہینوں پہلے سے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ان کی ادھر کی تقریروں پر وقتِ آخر کا سایہ دکھائی دے رہا تھا مجھے" میں نے جواب دیا اس کے بعد دونوں طرف مکمل خاموشی اسی معنی خیز خاموشی میں انھوں نے مجھے گاڑی سے اُتار دیا اور میں اسکوٹر سے اسٹیشن پہنچا۔ دو گھنٹے بعد، راجدھانی کے تجارت پیشہ مسافروں کی ایک لمبی لائن ٹکٹ گھر کے سامنے لگی تھی۔ بمبئی کے ٹکٹ واپس کرنے کے لیے اور جیسا کہ قیاس کیا تھا، بڑی آسانی سے ریزرویشن مل گیا۔

مگر اس رات ٹرین میں آنکھ نہیں جھپکی۔

ملک کو ملکہ نے کہاں چھوڑا ہے؟ اِن ٹیگریشن کے کسی مرحلے پر یا ڈِس اِن ٹیگریشن کے چوراہے پر؟

نیکی کا فرشتہ داہنے شانے پہ سے سوال کرتا،

بدی کا فرشتہ بائیں شانے پر سوال میں تلخی ملاتا۔

ملک کو ملکہ نے کیا زبردست وقار بخشا، کس قدر طاقتور کردیا۔

ہاں رگ پٹھے تو ضرور مضبوط کیے لیکن جگر کا فعل بہ اندرونی تندرستی!

سترہ گھنٹے گزر گئے۔ گاڑی سلامتی کے ساتھ بمبئی پہنچ گئی۔ ظاہر انظر آتا تھا کہ یہاں ابھی تک خبر ہی نہیں پہنچی۔ ہمارا یہ شہر بھی کیا ہوشمند شہر ہے کہ آفت پھٹنے سے پہلے یہاں لوگ مکان، دوکان، بازار کاروبار سنگوانے میں لگ جاتے ہیں۔!

اور اب ان کی چتا ٹھنڈی ہو جانے کے بعد ہفتہ بھر میں جو واقعات، بیانات، یادیں، تذکرے سامنے آئے ہیں انھوں نے سوچ کو اتنی غذا دی ہے کہ اندرا جی کی سیکڑوں تقریروں اور ان پر مضامین کے انبار سے بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

دور سے دیکھنے اور اخباروں کے کالموں کے ذریعے انھیں جاننے والے سوچتے ہوں گے کہ پہلے عبدالرحمٰن انتولے نے اور بعد میں وسنت ساٹھے نے ہندستان کے لیے پارلیمنٹری ڈیماکریسی کے سسٹم کو ناقص بتا کر صدارتی طرزِ حکومت کا جو پرچار زوروں میں شروع کیا تھا، اس کے پس پردہ اندرا جی کا اشارہ تھا؟

اب کھلا کہ نہیں۔ ان کا اگر اشارہ ہوگا تو صرف اسی قدر کہ موجودہ دور میں جتنے سسٹم کام کر رہے ہیں۔ سب پر کھل کر بحث ہونی چاہیے۔ انھوں نے ستمبر کے اپنے ایک انٹرویو میں (جو فلم اور اخبار کے لیے مسز فاطمہ ذکریا نے لیا تھا) دل کی بات کہہ دی۔

"مجھے احساس ہو چکا ہے کہ فی الحال دنیا میں جتنے نظام (عالمی نظام) کام کر رہے ہیں سبھی کے سب کہیں نہ کہیں فیل ہو گئے ہیں۔ خلائی پرواز اور کمپیوٹر کے اس نیو کلائی نظام کا تقاضا ہے کہ تو میں اپنے اپنے طور پر اپنے مسائل کا حل سوچیں اور کھل کر ہر ایک سسٹم پر تبادلہ خیال کریں۔

کیا کہا؟ طاقت کی مرکزیت؟ مرکز اور ریاستوں کے باہمی رشتے کا توازن؟ وہ تو خیر ایک مسئلہ ہی، لیکن وہ بھی ضمنی ہے۔ اصل مسئلہ طاقت کی متوازن تقسیم کا ہے صوبوں اور مرکز کے ہی نہیں بلکہ خود صوبوں اور اور علاقوں اور خطوں کے درمیان۔ طاقت (اختیار) کی لامرکزیت ضروری نظر آتی ہے مجھے،

"جو دعوے اور وعدے ہم کرتے ہیں، وہ پورے نہیں ہو پاتے تو نیتوں کا کھوٹ نہیں، بلکہ کارگزار مشینری کے ناقص ہونے کے کارن، رہنماؤں کی صفوں میں چھوٹے چھوٹے مسائل اور مفادوں سے الجھے رہنے کا جنون اس قدر ہے کہ بڑے مقصد دھرے رہ جاتے ہیں۔ ان کی تعمیل کے لیے وقت ہی نہیں رہتا،

بڑی بڑی ذمہ داریاں چھوٹے آدمیوں پر آ پڑی ہیں۔ وہ ان کے اہل نہیں ثابت ہوتے،

"دوسروں میں کیڑے نکالنے اور ناکامیوں، کوتاہیوں، بدعنوانیوں کی رٹ لگانے سے ایک منفی رویہ عام ہوتا ہے۔ ہر شخص اس فضا میں سوچنے لگتا ہے کہ جب دوسرا ایسا کر رہے ہیں تو میں کیوں نہ کروں! نتیجہ یہ کہ بدعنوانی فضا پر طاری ہو جاتی ہے اور اچھے کام اس غبار میں چھپ جاتے ہیں بہتری کی امید کمزور پڑتی ہے۔ اگر اس کے بجائے کامیابیوں اور بھلائیوں کو اچھالا جائے تو دوسروں کو بھی حوصلہ ملتا ہے اور فضا روشن ہوتی ہے

"ارے بھئی، اب میں کیا یوگا کروں! یوگا کے آسنوں کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟ ہمارا وقت ختم ہونے آیا۔

اس طرح کی باتیں انھوں نے کہیں یعنی ان کا ذہن جس طرح کام کر رہا تھا۔ دنیا کے بڑے سے بڑے اعزاز حاصل کر چکنے کے بعد تلخ و ترش سچائیاں، جو اندرا جی کے دل و دماغ پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں، وہ ان سے واقف و آگہ ہی تھیں۔

پہلا۔۔۔ تو میں تو صرف دو رکے شارے سے گھر میں ذرا جیسے بیٹھ کر جب وہ زبان کھولتی تھیں اور مخاطب کو اس پردہ کشائی کے قابل پاتی تھیں تو ان کی اس شخصیت باطنی ہستی اس مقام پر جلوہ گر نظر آنے لگی تھی جہاں دنیا کے بڑے بڑے مفکر بالآخر پہنچتے ہیں۔

جب میں آخری چند مہینوں کی، خاص کر ستمبر کے اس انٹرویو کی سطروں کے درمیان انھیں پڑھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں تو یوں نظر آتا ہے کہ ان کے پاؤں ملک کی کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں اور سر آسمان کا تھال

اٹھانے ہیں سب۔

یوں نظر آتا ہے کہ کوئی تریموری ہے جس میں درگا کا جلال اور لکشمی کا جمال تو ہے ہی گاؤں کی گوری یا کرشن کی گوپی کا شعاؤ بھی سمایا ہوا ہے جس کی فطرت میں تقاضا ہے اور شوخی۔

یہ ایک وجود میں اتنی زبردست وسعت یہ بلا کی سمائی اور گہرائی کہاں سے آگئی تھی؟

بڑے دادا بڑے باپ کے آغوشِ تربیت میں پلنے سے؟

بڑے بڑوں کی صحبت سے؟

مطالعے کے شوق سے؟

خودگری اور خودنگری سے؟

دنیا بھر کے سیر و سفر سے؟

اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھنے سے؟

وقت اور حالات کے نظم و ضبط سے؟

خود کو طوفانی دھاروں میں بے محابا ڈال دینے سے؟

یا ہیجانی سیاست کی وادیٔ پرخار میں ایک ایک قدم تول کر رکھنے اور آزمائشوں سے سیکھتے رہنے کے سبب؟ اب جبکہ اندرا جی کا ایک ایک قول و فعل ہمارے سامنے آرہا ہے ہم تقابلی مطالعے کی ٹیکنیک سے کام لے کر خود ان کی زندگی سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ رسمی تعلیم کہاں تک پائی تھی؟

کہیں تک نہیں۔

جابجا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لیے۔ جس مضمون میں جی لگا اسے محنت سے پڑھا اور نصاب کی کتابوں سے باہر بھی مطالعے کو وسعت دیتی رہیں۔ جی لگتا تھا، جن پریوں کی کہانیوں میں۔ باپ کے کہنے سے پڑھنا پڑتی تھی گیری بالدی اور ابراہم لنکن کی سوانح حیات ــ بالآخر ذوق کو تربیت ملتی گئی اور تاریخ عالم کے روشن ورق آنکھوں پر کھلتے گئے۔

الہ آباد، بمبئی، نینی تال، پونہ، شانتی نکیتن، مدراس، بانڈیچری، سوئزرلینڈ، آکسفورڈ، گاندھی آشرم، جیل خانے۔ ہر جگہ کی تعلیم مختلف تھی نظام تعلیم مختلف تھا، زبانیں مختلف تھیں، لوگ اور ان کے آداب مختلف تھے، تقاضے مختلف تھے۔ جواہر لال کی بیٹی کا سب سے بڑا ٹیچر تو خود تاریخ تہذیب اور پولیٹکل سائنس کا اعزازی پروفیسر جواہر لال نہرو ہی تھا۔ اور پھر اس کا بڑا سا گھر، جہاں اول تو آزادی کی جنگ کی شطرنج بچھی رہتی تھی اور آخر حکومت اور اقتدار کی رسہ کشی کے سرے تنے رہتے تھے۔ دونوں زبردست تربیت گاہیں جن میں قدم رکھنے والے چھوٹے اور معمولی سے لوگ، بڑے، نکلتے تھے اور بڑے بڑے نامور، اپنی اتھلی خودغرضیوں کے ساتھ، چھوٹے ثابت ہو جاتے تھے۔

یہاں ان دونوں طرح کی تربیت گاہوں میں اندو پریہ درشنی کو اندرا گاندھی بنتے بنتے جو زندہ چلتی پھرتی کتابیں پڑھنے کو ملیں ان میں متن سے زیادہ حاشیے اور حاشیوں سے زیادہ بین السطور کی ان لکھی عبارت اہم نکلتی تھی۔ وہ جانے انجانے میں ان عبارتوں کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہوتی گئیں، اسے پورے کا پورا، بھلا کون پڑھ سکتا تھا۔

خبر نہیں، کب سے یہ بحث چلی آتی ہے کہ انسان ایک مقررہ نصاب تعلیم، مقررہ سبجکٹ کو اول تا آخر حاصل کرے تب تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ ایک شے ملازمت، ایک پیشے ایک مقررہ نظام عمل پر قائم رہے تب اس کے کردار

اور اطوار میں گہرائی اور استواری آتی ہے یا اس کے برخلاف اس خیال کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ راہ تو تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی میں کولھو کے بیل کا، یا خوبی کے ساتھ کہو تو قدامت پسند مذہبیت کا آئیڈیل کردار پروان چڑھتا ہے ہاں انسان کی سرگرمی، اس کا ماحول، اس کا مطالعہ اور بیوپار اگر مختلف حالتوں اور طرح طرح کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ اگر وہ جگہ اور جھکاؤ بدلتا رہے تو وجود میں وسعت اور ہمت کے ساتھ زمانے کے سرد و گرم میں سہار پیدا ہوتی ہے مضامین کی تقسیم در تقسیم اور تخصیص در تخصیص کے ہمارے موجودہ دور میں تعلیم اور تربیت کے یک رخے پن کا رونا سب رو رہے ہیں لیکن علم و ہنر کے شاخ در شاخ ہوتے چلے جانے کے باعث کوئی اس کا مداوا نہیں کر پاتا۔ اگر ایک مضمون کے کسی ایک مخصوص دھارے میں ڈوبیں نہیں تو عمومی اطلاع اور عام آگاہی کے بل پر کوئی موتی ہاتھ نہیں آتا۔ اور اگر ڈوبیں تو بس اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جواہر لال نے اس عمر رسیدہ بحث میں پڑ کر دیکھا۔ جب بھی وہ کسی سائنسی یا علمی کانگرس کو خطاب کرتے کسی نہ کسی پہلو یہ مسئلہ ضرور اٹھاتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجربے نے انھیں دوسری رائے کا حامی بنا دیا تھا۔ کیوں کہ جب بھی انھوں نے اپنی وزارتی ٹیم کے لیے انتخاب کیا تو یہ خیال رکھا کہ وہ شخص جس نے کسی ایک موضوع پر عمر بسر کی ہو اسی موضوع کی وزارت یا تو اسے سپرد نہ کی جائے یا دیر تک اس کے قبضۂ قدرت میں نہ رہنے پائے۔

جسٹس محمد علی کریم بھائی چھاگلہ کو قلمدان وزارت دیا تو قانون کا نہیں، تعلیم کا، وزارت خارجہ کا، اور کرشنا مینن کو وزارت خارجہ نہ دی، ڈیفنس سپرد کر دیا۔ ساری مثالیں ایسی ہی ملیں گی۔ انھیں یہ خیال ضرور تھا کہ جس نے ایک موضوع کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے وہ اس پر اٹل نظریے اور پختہ، بے لوچ رائیں رکھتا ہوگا۔ دوسروں کی نہیں سنے گا۔ عجب نہیں کہ اسی طرح کا تصور ذمہ دار ہو، اس بات کا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو اس کی طالب علمی کے دوران برابر گردش میں رکھتے تھے، کہاں پونہ، دکن کے برہمنوں کا تعلیمی تہذیبی مرکز، کہاں شانتی نکیتن بنگالی ویدانتیوں کی ہنستی کھیلتی شاعرانہ درس گاہ پھر مسیحی

مشن کے اسکول، یوروپ کی بہترین تعلیم گاہ اور تفریح گاہ جنیوا......
اور پھر برطانوی قدامت کا ہر زوہ روشن خیال آکسفورڈ!

ملی جلی ہندی اردو انگریزی تو گھر کی زبان ہوئی۔ فرنچ اور تامل جنوب میں جانی، مراٹھی سے واسطہ رہا پونہ میں اور بنگالی رس ملا بولپور کی دلفریبی میں۔ شادی ہوئی گجراتی پارسی سے زبانیں اپنے ساتھ کلچرل رنگ و آہنگ بھی رکھتی ہیں۔ اپنا ماضی و حال بھی رکھتی ہیں طبیعتوں کی نرمی اور گرمی بھی رکھتی ہیں۔ کہیں ایک رجحان کی شدت ہے اور کہیں دوسرے مزاج کی حدت یا نرمی الگ الگ زبانوں کی فضا میں دیر تک ٹھیر کر سانس لینے والا اگر بالکل ہی غبی نہیں ہے تو اثر لیے بغیر اور اس کی کیفیت اپنی روح میں ٹپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہی معاملہ موضوعات اور مضامین کا ہے۔ اور پھر جغرافیائی اثرات جن سے ہم فوری طور پر آگاہ نہیں ہوتے، مگر وہ ہمارے اطوار پر کسی نہ کسی روپ اور حد میں اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ شانتی نکیتن میں گرو دیو کے ہوتے، موسیقی، مصوری اور تربیت کا چرچا تھا تو آکسفورڈ میں کتاب اور لکچر کا، ہوم ورک اور جنرل نالج کا، حوالے کی کتابوں کا۔ پر یہ روشنی کو سارے روشن پر پڑے لگے، لیکن وہ خود کہیں جم کر نہیں رہی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی انداز آئیڈیل ہے، لیکن یہ ضرور جتانا چاہتے ہیں کہ اس عمل کے تسلسل سے اس کے وجود کو رنگارنگی تازگی اور شگفتگی نصیب ہوتی رہی۔ مناظر اور مظاہر کے تغیرات نے اس کی شخصیت میں گہرائی کے ساتھ وسعت اور نظر میں دور تک رسائی، خیالات میں بے تعصبی اور نظریات میں ہمہ گیری پیدا کی۔

پھر، چوں کہ نظریاتی تعلیم کے ساتھ ساتھ ویسی ہی ہمہ جہتی تربیت بھی میسر آتی رہی، تو شخصیت اسی فولادی مگر لوچدار سانچے میں ڈھلنے والی تھی جس میں وہ ڈھل کر سامنے آئی: سب میں گھلی ملی اور سب سے بلند قامت۔

بظاہر یہ معمولی سی بات ہے کہ سارے عالمی نظام آج کے مسائل کے سامنے فیل ہوتے نظر آتے ہیں۔ کسی کے پاس انسان کے دکھ درد کا مکمل علاج نہیں، کوئی اور کہتا تو ہم اسے چڑچڑاپن، سنکی پن،

لگی ہیں کہہ کر جھٹک دیتے۔ اندرا گاندھی نے وقت آخر کے سامنے میں کہا، دنیا کی تیسری با اختیار رہنما کی حیثیت میں کہا، وزارت عظمیٰ کی بلندی سے کہا اور ہجوم کے بیچ تنہا ہستی کے حال میں ڈوب کر کہا تو یہ آج کے سوچنے سمجھنے والوں کے لیے ان کے حامیوں، ہتکی باتوں، بدگمانوں سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

یہاں سے دیکھیے تو اس شخصیت کے باطن کا سراغ ملتا ہے اور خود ہماری کئی بدگمانیاں یا خوش فہمیاں دھل جاتی ہیں۔

وہ گجرات جاتی ہیں تو سراتھی ہیلاؤں کے جھرمٹ میں گجراتی ساڑھی پہنے گربا ناچ کے چکر کاٹنے لگتی ہیں، بنگال پہنچتی ہیں تو سنی پوری ڈانسروں کے بیچ گھل مل جاتی ہیں شملہ جاتی ہیں تو ایک خاموش پرفضا بنگلے "RETREAT" پر ریجھ جاتی ہیں، الہ آباد کے "سوراج بھون" کے حق ملکیت سے دست برداری لکھتی ہیں تو ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، رو دیتی ہیں۔ مہاراشٹر میں ان کی آرتی اتاری جا رہی ہے اور وہ ٹھیٹھ مراٹھنوں کی طرح کھلی جا رہی ہیں، راجستھان میں گھر کی بہو سمان اٹکھیلیاں اور چھیڑ خانیاں کرنے لگتی ہیں۔ ہر حال میں مگن ہیں، ساڑھی بدلتی ہیں تو شرما کر پوچھ بیٹھتی ہیں — "یہ اچھی لگتی ہے نا؟" (یعنی کیا میں اس لباس میں اچھی لگتی ہوں؟۔ نری کوری گھریلو عورت!) اور پارٹی محنت کی خاطر گتھم گتھا ہونے والے جغادریوں، کانگریس یا رلی منسٹری بورڈ کی بیٹھک میں قدم رکھتی ہیں تو سناٹا ہو جاتا ہے۔ جیسے شریر بچوں کی کلاس میں سخت گیر استانی قمچی لیے آپہنچی ہو۔

ان کے ساٹھ برسوں کے اتار چڑھاؤ کا قول و فعل کا آسائش اور آزمائش کا، اقتدار اور بے اقتداری کا سارا نقشہ پھیلایا جائے اور اول تا آخر، پھر دور و نزدیک سے دیکھا جائے تو یہ کھلتا ہے کہ وہ بیک وقت مختلف حالتوں، ذہنی کیفیتوں، رنگینیوں اور نیرنگیوں میں پیچیدگیوں اور سادگیوں میں جینے والی بے حد تنہا خاتون تھیں وہ روپ جسے بناوٹ سمجھا گیا، صرف بناؤ تھا۔ اور وہ پوز جسے سیاسی ہنر اشمار کیا گیا، سنگھار تھا۔ ایک جاندار عورت کا فطری حق۔ بس!

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

★

فضل نقوی

شہادت کے چراغ

اندرا اے راہِ آزادی کی میرِ کارواں
اندرا اے عظمتِ ہند کی تابندہ نشاں
گاندھی کے پیغام کو تو نے کیا پھر سے جواں
فخر کرتا ہے شجاعت پر تری ہندوستاں

جسم میں بھارت کے اپنا خون تو نے بھر دیا
اکبر و پرتاپ اور گاندھی کو زندہ کر دیا

عزم اور ہمت کا مرکز بن گئی تھی گفتگو
ہر عمل کا تیرے سکہ چل رہا تھا چار سو
ملک کی اور قوم کی رکھی ہے تو نے آبرو
زندگی دیتا رہے گا تیرا پاکیزہ لہو

ساری دنیا میں ہوئے روشن محبت کے چراغ
ہیں ہمالہ کی بلندی پر شہادت کے چراغ

تیرے نازک جسم پر قاتل کی ہر گولی کا وار
کر رہا تھا ساری دنیا کے کلیجے کو فگار
لال تھی چشمِ فلک اور سرخ تھا ابرِ بہار
تیرے غم میں غرق ہو کر رہ گئے لیل و نہار

تیری مظلومی پہ جتنے حادثے تھے رو گئے
ہند کی تاریخ کے اوراق زخمی ہو گئے

ظلمِ قاتل کو تڑپ کر دیکھتا تھا آسماں
مرکزِ صبر و وفا تھی خون میں ڈوبی زباں
اک چراغِ زندگی تھا گولیوں کا ہر نشاں
آگے بڑھتا ہی رہا تیرے عمل کا کارواں

قصر جو تو نے بنائے ہیں وہ جھک سکتے نہیں
اب قیامت تک ترے اُپدیش رک سکتے نہیں

وامق جونپوری
لال کوٹھی
پوسٹ، کجگاؤں
ضلع، جونپور

ہم بزدل ہیں

یہ رقصِ شرر
یہ سوکھے شجر
نفرت کا سفر
صحرا صحرا
دریا دریا
لمحہ لمحہ
صدیاں صدیاں
رنگین ہیں خونِ انساں سے
بے بس ہیں ہمارے عصیاں سے

ہم قاتل ہیں
ہم بزدل ہیں
ہم خون کے پیاسے
جان کے بھوکے
رقصِ شرر کے ماہر ہیں
نفرت کے سفر میں شاطر ہیں
ہم سوکھے شجر کے مالی ہیں
ان زخمی شاخوں کو دیکھو جو برگ و ثمر سے خالی ہیں
ہم وحشی درندے اپنے خون آلود نوکیلے پنجوں سے
تاریخِ وطن لکھ جائیں گے

ہم بزدل ہیں
ہم جاہل ہیں
ہم قاتل ہیں
یہ ہاتھ ہمارے خونِ شہیداں کے بہنے میں شامل ہیں
کرتے ہیں سہاگن کو بیوہ
کرتے ہیں غیرت کو رسوا
بچوں کو یتیم اور ماؤں کی گودی کو اجاڑا کرتے ہیں
ہم بام و در کے نقشوں کو شعلوں سے بگاڑا کرتے ہیں
ہم گولیوں سے چھلنی چھلنی تصویرِ گلاب و سرو سمن کر دیتے ہیں
ہم لالہ و نرگس کا دامن انگاروں سے بھر دیتے ہیں
انساں سے نفرت ہے ہم کو
یزداں سے نفرت ہے ہم کو
گیتا کو جلا دیتے ہیں ہم
بھگوان سے نفرت ہے ہم کو
گرو بانی کے ہم دشمن ہیں
قرآں سے نفرت ہے ہم کو

اک قوم جسے کہتے ہیں سب
اس قوم کے حصّوں بخروں کو ہم گھُن بن کر کھا جائیں گے
ہم زہر ہیں جو اس قوم کے رگ ریشوں میں سما کر دم لیں گے

ہم وائرس اس نفرت کے ہیں
ہم کینسر اس لعنت کے ہیں
جو دشمن ہے یک جہتی کی
جو دشمن ہے آزادی کی
دیکھا نہیں کیا تم نے ہم کو
ہم امن و سخن کے قاتل ہیں
جانا نہیں کیا تم نے ہم کو
ہم جانِ وطن کے قاتل ہیں
سمجھا نہیں کیا تم نے ہم کو
ہم سبزہ و گل شاخ و غنچہ خوشبوئے چمن کے قاتل ہیں
ہم بزدل ہیں۔ ہم بزدل ہیں

ہم درباں بن جاتے ہیں کہیں
تو قزاقِ بازار کہیں
ہم پاکر موقع چشم زدن میں کر دیتے ہیں وار کہیں
ہم ہندو نہیں اور سکھ بھی نہیں
ہم مسلم یا عیسائی نہیں
ہم کچھ بھی نہیں ہم کچھ بھی نہیں
بس قاتلِ ابنِ آدم ہیں
بس قاتلِ بنتِ حوّا ہیں
ہم دشمن ہر ایمان کے ہیں
ہم مانند اک شیطان کے ہیں
وہ چاہے لکشمی بائی ہوں
یا چاہے باپو گاندھی ہوں
وہ چاہے گرو گووند جی ہوں
یا چاہے جون آف آرک وہ ہوں
سقراط ہوں یا ابنِ مریم
یا ہوں وہ حسین ابن حیدر

یہ لوگ ہمیں مل جائیں اگر
پھر قتل انھیں کر دیں گے ہم
ہم جنگل کو گیدڑ کی طرح پھر واپس جانا چاہتے ہیں
ان شہروں سے نفرت ہے ہمیں
ان چمنیوں سے ہم ڈرتے ہیں
محنت کے حقیقی راج محل
یہ چاندی جیسا تاج محل
یہ مندر مسجد گردوارے
یہ گرجا منڈف مینارے
یہ بجلی ریل اور طیارے
ان سب کو ملا کر مٹی میں
ہم اپنے اندھیرے غاروں کو پھر اک دن جا کے بسائیں گے
اور ننگے دھڑنگے ناچیں گے
تلوار کی گت پر گائیں گے
اور لڑتے جھگڑتے آپس میں کیڑوں کی طرح مر جائیں گے
قانون ہمارے جوتوں کی نوکوں پہ ہمیشہ رہتا ہے
اور سخت حکومت ؟
نا بابا !
سختی سے ہمیں ڈر لگتا ہے ——— ہم بزدل ہیں۔

مجروح سلطانپوری

۲۔ چنائے کالونی
جوہو روڈ، جوہو، بمبئی

سورج ہے لہو تیرا

(مادرِ عالم اندرا شہید کے نام)

گردش میں ہے قرنوں سے یہی خون کہ جس سے — قشقہ ہے برہمن کا مسلماں کا وضو ہے
ٹپکا ہے وہی آج ترے پاک بدن سے — قاتل یہ سمجھتا ہے کہ یہ تیرا لہو ہے

داغ اس کا چھپائے نہ چھپے لوحِ جبیں سے — شعلے میں لپیٹیں کہ تہِ خاک دبائیں
نیزے پہ شقاوت کے اچھالا ہے جب اس کو — تب اس کی ہر اک بوند نے دی ہیں یہ صدائیں

پھر میری نوا چرخ پہ روشن ہوئی آؤ
سورج کو بجھا سکتے ہو لوگو تو بجھاؤ

جب یوں ہے تو اے ماں ترے فرزند سلامت — چن کر یہ تری خاک سے سب پھول وطن کے
اس طرح بکھیریں گے سرِ عرصۂ عالم — موسم ہی بدل جائیں گے سب تیغ و کفن کے
تو چین سے سو جا کہ ہمیں اس کی خبر ہے — پوشیدہ ترے بام کے نیچے بھی ہے کوئی
قاتل کے اٹھے ہاتھ پہ سایہ ہے کسی کا — سایہ یہی کہتا ہے کہ پیچھے بھی ہے کوئی

کوئی بھی ہو کیا غم ہے کہ اے مادرِ عالم
ہم لے کے اٹھیں گے تری آواز کا پرچم

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
۶- پروفیسرس فلیٹ، بابو گنج
فیض آباد روڈ، لکھنؤ

وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

ممکن ہے کہ "شرفائے ادب" کے نزدیک یہ حوالہ کچھ کم عیار ہو مگر مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آزادیٔ وطن کے بعد میری شناخت کا امتیازی پہلو مشاعرہ اور مشاعروں میں شعرا کا تعارف کرانا ٹھہرا ہے ـــ اس عنوان نے اگر ایک طرف مجھے اس بات کا موقع فراہم کیا کہ میں اپنے عہد کے بیشتر چھوٹے بڑے شعرا و ادبا سے شرفِ ملاقات حاصل کر سکا تو دوسری طرف آسمانِ سیاست اور حکومت کے ان چاند ستاروں سے بھی متعارف ہوا جن کی جنبشِ قلم سے ملکوں اور قوموں کی تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں۔ سیاسی اکابرین، وزرا، سفرا، امرا، والیانِ ریاست، حکام، صدرِ جمہوریہ، گورنر صاحبان، ممتاز سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی ایک طویل فہرست ہے جن سے گزشتہ پچیس تیس برسوں میں میرا سابقہ پڑا اور ان کے غیر محتاط لمحات میں ان کے ادبی ذوق، سخن وری اور سخن فہمی کے وہ مظاہر دیکھے جو ان کے منصبی فرائض اور عہدوں کے بوجھ تلے دب کر کراہ رہے تھے۔ شعر و ادب کی محفلوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری نے اس وقت بھی شرکت کی جب کہ وزارتِ عظمیٰ کا بار ان کے کندھوں پر تھا۔ صدرِ جمہوریہ فخر الدین علی احمد حفاظتی اقدامات کی پرواہ کیے بغیر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ان کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے شعرا اور سامعین کے درمیان سیکیورٹی والے فاصلہ حائل کر دیں۔ ہمارے موجودہ صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ اپنے منصب کی پرواہ کیے بغیر نہ صرف مشاعروں میں تشریف لاتے ہیں بلکہ اردو کے ایک بہت ہی جذباتی وکیل بن کر تقریر بھی کرتے ہیں۔ حافظ محمد ابراہیم، ہیمو رنانند، جنرل شاہ نواز، دیو کانت بروا، جیوتی باسو، ہیم وتی نندن بہوگنا، ڈی انجیا، اٹل بہاری باجپئی، جگنا تھ مسرا، اکبر علی خاں، شنکر دیال شرما، وجے لکشمی پنڈت، خورشید عالم خاں، ضیاء الرحمٰن انصاری، چندر جیت یادو، ایڈوانی، گوپالا ریڈی، رام نریش یادو، چنّا ریڈی، نرائن دت تیواری، وسنت ساٹھے، ڈی این سالوے، بوٹا سنگھ، جگ موہن، دلی، کھرانہ، شیلا کول، محسنہ قدوائی، تارکشوری سنہا، یونس سلیم، ہمارے موجودہ گورنر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی اور نہ جانے کتنے اور، ان میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنے ذوق و شوق کی آسودگی کی خاطر مشاعروں کے لیے وقت نہ نکالا ہو، مسز اندرا گاندھی نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی مشاعرہ میں شرکت کی ہو، مگر یہ میری بدقسمتی رہی کہ مشاعرہ میری ان کی

ملاقات کا عنوان نہ بن سکا۔

میں نے سب سے پہلے قریب سے انھیں اس دن دیکھا جب انھوں نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ یہ ۲۴ جنوری ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ میں جشنِ جمہوریہ کے سلسلے میں ہونے والے لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو تھا۔ یہ شاید دوسرے دن کی بات ہے کہ مرکزی جمعیتہ العلما ہند کی جانب سے کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی کے لان پر عید ملن کی ایک تقریب تھی۔ اگر میرا حافظہ درست ہے تو یہ پہلا عوامی جلسہ تھا جس میں محترمہ اندرا گاندھی نے بحیثیت وزیر اعظم کے شرکت کی تھی۔ صوفے کے ایک سرے پر مفتی عتیق الرحمن صاحب اور دوسرے سرے پر محترمہ اندرا گاندھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک کم سن لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ جسے مفتی صاحب نے بلا کر بٹھا لیا تھا تاکہ ایک حدِ فاصل قائم رہے۔ اس موقع پر اپنی استقبالیہ تقریر میں مفتی صاحب نے اندرا جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جب بھی ہم لوگ کسی مسئلہ پر آپ کے والد محترم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنا چاہتے تھے، وہ فوراً ترجیحی طور پر ہم لوگوں کو بلا لیتے تھے اور ہمارے مسائل کو حل کر دیتے تھے، امید ہے کہ بحیثیت وزیر اعظم کے آپ اپنے والد کی اس روایت کو قائم رکھیں گی" اندرا جی نے اس دن ایک بہت ہی چہکتی ہوئی صاف اور شفاف تقریر کی تھی اور مفتی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جب آپ مجھ سے نہیں بلکہ وزیر اعظم یعنی پنڈت نہرو جی سے ملنے آتے تھے تو میں سب سے پہلے آپ کو ان سے ملوا دیا کرتی تھی، اور جب آپ مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائیں گے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں آپ سے کیوں نہ ملوں گی" اندرا جی کے اس جملے پر پورا مجمع قہقہہ زار بن گیا تھا۔

صبح و شام کے چکر اور ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ وقت گزرتا جا رہا تھا اور مختلف ادبی تقریبات کے سلسلہ میں دہلی میں میری آمد و رفت کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ سیاست سے ۱۹۵۲ء کے بعد میرا براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے باوجود خواہش کے کبھی یہ حوصلہ پیدا نہ ہوا کہ میں ان تمام مراحل سے گذر کر جن سے سیاسی لوگ گزرا کرتے ہیں، میں اندرا جی سے ملاقات کا کوئی عنوان پیدا کرتا۔ بزم شنکر و شاد کے سالانہ انڈو پاک مشاعروں کے بعد پنڈت نہرو کبھی کبھی کچھ منتخب شعرا کو بلا کر ان کا کلام سنتے تھے۔ سیاسی مصروفیات کی بنا پر یہ صورتِ حال شاید اندرا جی کے زمانے میں پیدا نہ ہو سکی، البتہ اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی ضرورت سے ان سے ملنا چاہتا تھا تو ضابطہ کے تحت اس کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک بار بزم شنکر و شاد اور دہلی کلاتھ ملز کے مرکزی کردار ڈاکٹر بھرت رام نے مشاعرہ کے دوسرے روز کچھ شعرا کو رات کے کھانے پر اپنی کوٹھی پر مدعو کیا۔ خبر یہ گرم تھی کہ عشائیہ کے بعد ایک مختصر سی شعری نشست ہوگی جس میں محترمہ اندرا گاندھی بھی شریک ہوں گی۔ مگر جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو محترمہ اندرا گاندھی تو تشریف نہ لا سکیں البتہ محمد یونس خاں صاحب جو اس زمانے میں شاید وزیر اعظم کے ذاتی ایلچی تھے، ان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ چنانچہ اس روز بھی اندرا جی سے ملنے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

نہرو خاندان سے میری عقیدت اور اس کے افراد سے ملنے کی تمنا میں نے اپنے ننہال سے ورثہ میں پائی تھی جس کی سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز شخصیت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ ان سے میری خالہ کا عقد ہوا تھا، آزادی کے قبل گرمیوں کی تعطیل میں جب کبھی میں ٹانڈہ جاتا یا ان دنوں میں جب مولانا مدنی آزادی کے بعد سلہٹ

کے بجائے رمضان شریف ٹانڈہ میں گزارتے تو جد و جہد آزادی کی پوری تصویر میری نگاہوں میں پھر جاتی جس میں جلیل القدر علمائے کرام کے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور نہرو خاندان کے افراد قید و بند کے مصائب کو رقصاں و غزلخواں طے کرتے ہوئے نظر آتے۔ میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا تھا اور ان کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز سے کما حقہٗ واقفیت بھی حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی سے دو سال قبل یعنی ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں میں نے عملی طور پر حصہ بھی لیا تھا اور ان جماعتوں کے امیدواروں کی موافقت میں تقریریں بھی کی تھیں۔ جو مسلم لیگ کے خلاف تھیں اور کانگریس کی معاون تھیں۔ اسی زمانے میں موجودہ ممبر پارلیمنٹ پروفیسر ہاشم قدوائی اور ان کے رفقائے کار کے ساتھ مل کر ہم لوگوں نے کل ہند پیمانے پر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن (مسلم لیگ کی طلبائی جماعت) کے خلاف نیشنلسٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی تاسیس کی تھی جس کا تفصیلی تذکرہ ہمارے ناموں کے ساتھ مس ریڈی کی کتاب اسٹوڈنٹس موومنٹ ان انڈیا میں مل سکتا ہے، جو نیا زمانہ پبلی کیشن لکھنؤ نے آزادی سے قبل ۱۹۴۶ء میں شائع کی تھی۔ اسی وقت سے ہماری ذہنی اور فکری وابستگی نہرو خاندان کے افراد کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک میں نے گورکھپور کی سرگرم طلبائی سیاست میں حصہ لیا تھا اور کانگریس کی معاون طلبائی تنظیموں کے مختلف عہدوں پر فائز بھی رہا۔ ۱۹۵۱ء میں میں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ لیکن نہرو خاندان جس نے نہ صرف ہندستان کی جد و جہد آزادی میں حصہ لیا بلکہ نئے ہندستان کی تعمیر و تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، میری عقیدت کم نہ ہوئی اور میں ہمیشہ اس موقع کا متلاشی رہا کہ اس کے افراد کو قریب سے دیکھوں۔

اندرا جی سے میری پہلی اور آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایک بہت ہی بڑے سیاسی سانحہ سے دوچار ہو چکی تھیں۔ جنتا پارٹی کی حکومت برسر اقتدار تھی اور اس کی تمام تر توجہ اندرا جی کے خلاف انتقامی کارروائیوں کی طرف مرکوز تھی۔ سرکاری عدالت اور عوام کی عدالت دونوں نے ان کو رد کر دیا تھا۔ صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں ہے مگر میں جس دن ان سے ملا تھا اس کے دو ایک روز کے بعد وہ پنار آشرم ونوبا بھاوے سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی تھیں۔ ہوا یوں کہ میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا۔ بہت دنوں سے کلپ ناتھ رائے ممبر پارلیمنٹ (جو بعد میں مرکزی حکومت میں پارلیمانی امور کے وزیر ہوئے) سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں جب میں ادبیات انگریزی کا لکچرر تھا، میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے مل کر ان کی خیریت پوچھتا چلوں۔ چنانچہ میں فیروز شاہ روڈ والی ان کی کوٹھی پر پہنچا، وہ حسب معمول مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو رہی۔ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو وہ بولے کہ "میں اندرا جی کے یہاں جا رہا ہوں اگر موقع ہو تو آپ بھی چلیے" میں فوراً تیار ہو گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سیاسی اور ذاتی سطح پر اتنے بڑے جھٹکے کے بعد ان کی افتاد مزاج اور ان کی شکل و صورت پر کیا ردعمل ہوا ہے۔ اندرا گاندھی — بین الاقوامی سطح پر جن کی شہرت کا ڈنکا بجا تھا، جنھوں نے ہندستان کی تعمیر و تشکیل میں اپنے خونِ جگر کو صرف کیا تھا، جن کے اسلاف نے مادرِ وطن کو آزاد کرانے میں طرح طرح کی قربانیاں دی تھیں، جنھیں ہندستان کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا — وہ اتنے بڑے انقلاب اور عروج و زوال کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد کہیں ایسا

تو نہیں کہ عام انسانوں کی طرح پست حوصلہ ہوگئی ہوں۔ ہم لوگ ٹیکسی پر راستہ طے کر رہے تھے مگر میرے تصورات میں اندرا گاندھی کا پورا ماضی، ان کے اسلاف، ان کے کارہائے نمایاں سب کے سب گردش کر رہے تھے، دس گیارہ بجے دن کا عمل ہوگا کہ ہم لوگ ان کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ بنگلے کے لان پر شامیانہ لگا ہوا تھا، جس میں کم و بیش تیس چالیس عورتیں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھیں، ان عورتوں کی خواہش تھی کہ وہ اندرا جی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھنچوا لیں۔ دالان میں کرسیاں دو قطاروں میں رکھی ہوئی تھیں۔ جن پر کچھ مخصوص سماجی اور سیاسی کارکن بیٹھے ہوئے ملاقات کے منتظر تھے۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی، چہرے جانے پہچانے لگے مگر میں ان کے ناموں سے ناآشنا تھا۔ صرف بیگم سلطانہ حیات اللہ انصاری کو میں پہچان سکا۔ کلپ ناتھ رائے ان دنوں مسز گاندھی کے بہت قریب تھے، انھوں نے جنتا حکومت کی پارلیمنٹ میں مسز گاندھی کے کارناموں، ان کے اکتسابات اور ان کے مناقب و فضائل پر ایک بے باک، "نڈر" اور بے خوف تقریر کی تھی۔ ایک ایسی فضا میں جب کہ گڑے مردے اکھاڑے جا رہے تھے اور انتقامی کارروائیاں اپنے شباب پر تھیں اور جن سے خود مسز گاندھی بھی محفوظ نہ تھیں، کلپ ناتھ رائے کی پارلیمنٹ میں وہ تقریر ان کی وفاداری کا ثبوت فراہم کرتی تھی — اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں اندرا جی انھیں پسند کرتی تھیں۔ میں کلپ ناتھ رائے کے ہمراہ لان سے گزرتا ہوا دالان میں پہنچا، دالان کے آدھے حصّہ میں لوگ بیٹھے تھے اور آدھے حصّہ کو پارٹیشن کر کے ڈرائنگ روم سے ملحق کر دیا گیا تھا۔ کلپ ناتھ رائے بغیر کسی تامل اور تکلف کے پارٹیشن کیے گئے حصّہ میں داخل ہو گئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ یکایک مسز گاندھی ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکلیں اور ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کلپ ناتھ رائے نے جھک کر قدم بوسی کی اور میں نے آداب کیا، انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، کلپ ناتھ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ہیں، ہمارے گرو، کالج میں مجھے انگریزی پڑھائی ہے، اردو کے شاعر ہیں"

"گرو جی آپ نے اس کو بھی کوئی سبق سکھایا ہے" انھوں نے کلپ ناتھ کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر زندہ دلی سے مجھ سے پوچھا۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میری ملاقاتیں ملک کی اہم شخصیتوں سے رہی ہیں اور میں کسی سے کبھی مرعوب نہیں ہوا، مگر اندرا جی نے جب آنکھ ملا کر مجھ سے یہ سوال کیا تو میری صلاحیتیں سہم گئیں اور میں نے بڑی ہمت کر کے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"میڈم! میں نے اس کو یہ سکھایا تھا کہ اچھے دنوں میں جس کے ساتھ رہنا خراب دنوں میں اس کا ساتھ مت چھوڑنا"

ایک لمحے کے توقف کے بعد انھوں نے دوبارہ کلپ ناتھ کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولیں۔

"ہاں ہاں یہ سبق تو اس کو یاد ہے۔ مسلمانوں کا کیا حال ہے"

میں اس سوال کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ مگر جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اس لیے بغیر کچھ سوچے سمجھے میں نے کہا۔

"میڈم، عام انتخابات کے وقت تو وہ آپ کے خلاف تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ساتھ ہو رہے ہیں۔ تھوڑا سا وقت لگے گا۔"

ہر دو خاندان کے افراد کا چہرہ ان کے دلی جذبات و
احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے
جواب پر مسز گاندھی تھوڑا سا جھلا گئیں اور بولیں
"آپ یہ کہہ رہے ہیں اور ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا
ہے کہ بہت سے انصاری لیڈر جو ایک کانفرنس میں
یہاں آئے ہوئے ہیں جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں"

اتنی دیر میں میں اپنے حواس جو مرعوب اور پراگندہ
تھے دوبارہ مجتمع کر چکا تھا۔ اس میں اندرا جی کے انداز گفتگو
اور مشفقانہ برتاؤ کا بھی بڑا دخل تھا کہ میری سہمی ہوئی
صلاحیتیں بہت جلد اپنے معمول پر آ گئیں۔ میں نے اعتماد
کے ساتھ جواب دیا۔

"میڈم! ہندستان نہ تو چند انصاری لیڈروں
کا نام ہے نہ ان خوش بختوں کا جنھیں آپ ذاتی طور پر جانتی
ہیں، میں تو ان کروڑوں عوام کی بات کر رہا ہوں جو بغیر کسی
سیاسی بصیرت کے الکشن کے روز اِس بکس یا اُس بکس میں اپنا
ووٹ ڈالتے ہیں"

ابھی میں اپنا جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ انھوں نے
سر سے پاؤں تک مجھے دیکھتے ہوئے کہا
"یہ آپ کو کیسے معلوم"

میں بولا "کلپ ناتھ نے ابھی آپ کو یہ بتلایا ہے کہ
میں شاعر ہوں اور مشاعروں میں جاتا ہوں۔ اس طرح مجھے
ادبی پلیٹ فارم سے کم و بیش پچاس ہزار عوام کا سامنا
اوسطاً ہر مہینے میں کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ دیکھتا رہتا ہوں
کہ شعراء کے مختلف اشعار پر ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔
الکشن کے فوراً بعد جو مشاعرے ہوئے ان میں ان اشعار کو
سراہا گیا جن میں تبدیلی کا استقبال کیا گیا تھا مگر اب ایسے
اشعار پر داد مل رہی ہے جن میں جنتا حکومت کے موجودہ
نظام پر تنقید کی جاتی ہے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے
کہ موجودہ حکومت دن بدن عوام میں ناپسندیدہ ہوتی جا رہی
ہے"

اندرا جی نے ایک بار پھر مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔
اور بولیں۔

"میں کیا بتاؤں آجکل تو میں افواہوں میں گھری
ہوئی ہوں۔ آج ہی کسی نے مجھے یہ بتایا کہ میں ڈیڑھ گھنٹے
تک (ایک متعصب فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے لیڈر کا
نام لیا جو مجھے یاد نہیں ہے) گفتگو کرتی رہی۔ حالانکہ
میں نے ابھی تک انھیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرے بارے
میں طرح طرح کی افواہیں لوگ پھیلا رہے ہیں"

ابھی ہم گفتگو کے اسی مرحلہ پر تھے کہ اندرا جی
کا کوئی سکریٹری اندر آیا اور اس نے کہا۔

"میڈم راجستھان کی بہت سی لیڈیز آئی ہیں بڑی
دیر سے آپ کی منتظر ہیں۔ آپ کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتی
ہیں"

ہم نے اجازت چاہی، کلپ ناتھ نے جھک کر ان
کے قدم چھوئے، میں نے آداب کیا۔ اندرا جی آگے بڑھتی
ہوئی رکیں، مجھ سے بولیں
"جب بھی دلی آنا، مجھ سے ضرور ملنا"

اور پھر وہ اس شامیانے میں چلی گئیں جو لان پر لگا
ہوا تھا اور جس میں بہت سی عورتیں ان کی منتظر تھیں۔

جب ہم ان کے بنگلے سے نکلے تو دوپہر کا سورج
ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔

اندرا جی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، میں ان کی
زندگی میں بارہا دلی گیا، مگر ان سے ملاقات کا کوئی عنوان پیدا
نہ کر سکا۔ حالات کی تیز دھوپ کے باوجود ان کا وہ شگفتہ

(باقی ص۵۵ پر)

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی
شعبۂ اردو ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ

اب کے تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہے

مشہور مجاہدِ آزادی اور اردو تحریک کے قافلہ سالار قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے اپنی گراں قدر تصنیف "تحریکِ خلافت" میں اندرا جی کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔
"مختلف جلسے سیشن کے اوقات کے باہر میدان میں ہوا کرتے تھے جن میں مختلف لیڈران تقریریں کرتے تھے۔ ان جلسوں میں میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی دیکھی جس کی عمر کا اندازہ اس وقت میں نے ۶-۷ سال کیا۔ وہ گاندھی ٹوپی پہنے جہاں دیکھو بڑی متانت سے خاموش بیٹھی ہے۔ بی۔ اے میں میرا مضمون نفسیات (سائیکولوجی) تھا اور اس میں میں نے پڑھا تھا کہ سات سال سے کم عمر بچے سے یہ امید کرنا کہ وہ خاموش بیٹھے سخت ظلم ہے۔ اس لئے مجھے اس بچی کی متانت اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی اور میں نے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ جواہر لال جی کی لڑکی اندرا ہے۔"

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں اس ملک کی باگ ڈور جسے سنبھالنی تھی اس کے اندر غور و فکر اور ملکی معاملات و مسائل کو سمجھنے اور اس میں دلچسپی لینے کا جذبہ اس کی ابتدائی عمر سے موجود تھا۔ سیاست کی پیچیل اور سنگلاخ منزلوں کو عبور کرنا تھا تو غالب کی طرح پُرخار راہوں کو دیکھ کر خوش ہونے کا انداز بھی اُسے شروع سے حاصل تھا۔ غیر شعوری کی منزل میں بھی شعور اور سنجیدگی کا کیسا عرفان نصیب ہوا تھا جو اکثر پختہ عمر سیاست دانوں کو بھی نہیں ملتا۔

اندرا جی اس دنیا سے اس وقت رخصت ہوئیں جب وہ شہرت اور مقبولیت کے بامِ عروج پر تھیں۔ دنیا کی چند بڑی شخصیتوں میں اُن کا شمار تھا۔ اُن کی اپنی شخصیت ایسی بن گئی تھی کہ دنیا کے معاملات میں اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور بعض اوقات ان کی آواز بین الاقوامی سطح پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ناوابستہ ممالک کی کانفرنس ہندوستان میں منعقد ہوئی صرف اُن کی ذاتی شخصیت کی بنا پر۔ اُن سے زیادہ باوقار کوئی دوسرا نہیں تھا جو ایسے نازک وقت میں اس تحریک کی رہنمائی کر سکتا۔ جواہر لال جی نے اس تحریک کی آبیاری کی تھی۔ اندرا جی نے اسے طاقت ور بنا کر پیش کیا۔ اپنی شخصیت کی چھاپ ڈال کر اُسے مستعد و مستحکم کیا اور دنیا کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

مسئلہ فلسطین اور عرب و عالمِ اسلام کے سیاسی مسائل میں انھوں نے ہمیشہ کھُل کر دلچسپی لی اور اُن کی حمایت میں واضح نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ فلسطین کے مسئلہ میں امریکا اسرائیل کی مدد کرتا رہا لیکن اندرا جی نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی اور امریکا سے مرعوب ہو کر کبھی مصلحت کا رویہ نہیں اختیار کیا بلکہ فلسطینیوں کے موقف کی پرزور تائید کرتی رہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کے بیباک رویوں نے اس تحریک کو بھی بے پناہ طاقت بخشی اور اس کی طرف بھی دنیا کو سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اُن کی آخری رسوم میں یاسر عرفات نے یہ کہہ کر

تاریخی خراجِ عقیدت پیش کیا تھا کہ میں اندرا جی کے بغیر ہندستان کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا۔ مضمون کی ابتدائی سطروں میں اُن کا جو تعارف آپ پڑھ چکے ہیں اس کے بعد یا سر عرفات کے اس جملے پر غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ انھوں نے صرف ایک شخصیت نہیں بلکہ اس تاریخ کے گلے میں اپنے خراجِ عقیدت کا ہار ڈال دیا ہے جو اس مدّت میں ترتیب پاتی رہی جس کا ایک ایک لمحہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اندرا جی نے اُسے اپنے قابو میں رکھا ہے اور ہر ہر قدم پر اُن کی طرف سے زندگی کا حق ادا ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے ساتھ بہنا نہیں سیکھا تھا بلکہ اس کے دھاروں کو صحیح رخ پر موڑ دینا ان کا شیوۂ زندگی تھا۔ ظاہر ہے یہ کام اتنا مشکل اور صبر آزما ہے کہ اس کی تکمیل میں شخصیتیں فنا ہو جاتی ہیں لیکن تاریخ کبھی فنا نہیں ہوتی ہے۔ گردشِ لیل و نہار میں اُن کے کارنامے گم نہیں ہوتے اور راہوں کے گرد و غبار میں بھی اُن کے پیروں کے نشانات نظر آتے رہتے ہیں۔ اندرا جی بھی اسی طرح کی تاریخ سازی کی نذر ہو گئیں وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں لیکن ایک نئی تاریخ کے ساتھ۔ وہ تاریخ جو ۶۷ سال کی عمر سے شروع ہوئی تھی ضرور ختم ہو گئی لیکن وہ تاریخ جو ان کے بعد شروع ہوئی ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو گی اس میں ان کا خون شامل ہے جو ہمیشہ چمکتا رہے گا اور تاریخ نویسی پر تاریخ سازی کے جذبہ کی فضیلت کا اعلان کرتا رہے گا۔ دنیا کے ہر معاملے کی طرح اس میں بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ انھوں نے اس ملک کے اتحاد اور سالمیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور بالآخر وہ اسی مقصد کے لیے قربان ہو گئیں۔ مارنے والوں نے یہ سمجھا تھا کہ اُن کا خون جم کر خشک ہو جائے گا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس واقعہ کے فوراً بعد اس ملک میں پارلیمنٹ کا الیکشن ہوا تو جیسے ایک دم وہ تازہ اور سُرخ ہو گیا اور اس میں حرکت اور گردش پیدا ہو گئی۔ پارلیمنٹ میں کانگریس کی غیر معمولی اکثریت جس کا ریکارڈ ماضی میں نہیں مل سکتا اس نے یہ ثابت کیا کہ اختلافات کے باوجود اس ملک نے جسے متحد رکھنے کے لیے اندرا جی نے جان دی تھی اس نے واقعی پہلی بار متحد ہو کر انھیں اپنا نذرانۂ عقیدت اس شکل میں پیش کیا تھا۔

میں نے ۱۹۵۲ء سے ہر طرح کا الیکشن دیکھا تھا۔ اس میں ۱۹۷۷ء بھی شامل ہے جب عوام نے کانگریس کو اقتدار سے محروم کر دیا تھا اور خود اندرا جی ہار گئی تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء کا وہ تاریخی الیکشن بھی ہے جب عوام نے محض ڈھائی سال کے بعد ہی کانگریس کو دوبارہ اقتدار دیا تھا اور اندرا جی وزیر اعظم ہوئی تھیں۔ ان الیکشنوں میں عوام کا جوش میں نے دیکھا ہے۔ اُن سے ٹکرایا بھی ہوں اور لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملا ہے لیکن ۱۹۸۴ء کے الیکشن کی کیفیت بالکل دوسری تھی۔ میں نے اپنی تقریروں میں اس کا اظہار بھی کیا کہ اس الیکشن میں عوام کا جوش موجوں کی طغیانی اور دریا کی روانی کو مات دے رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر کوہِ گراں اُس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا اور جو بات میں محسوس کر رہا تھا اور دیکھ رہا تھا اس کا عملی نمونہ بھی سامنے آ گیا۔ یہ الیکشن کا جوش نہیں اندرا جی کے خونِ ناحق کا جوش تھا جس نے عوام کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں اکثر جلسوں میں یہ کہتا تھا کہ یہ الیکشن نہیں تھا بلکہ اندرا جی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا ایک ذریعہ اور موقع تھا۔ تو پوری فضا نعرے سے گونج اٹھتی تھی اور ہر جلسہ میں مجھ سے فرمائش کی جاتی تھی کہ میں یہ بات ضرور کہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر بھی دیکھا کہ دیہات کی عورتیں اندرا جی کی تصویر کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور اپنے سروں کو جھکا کر اس طرح کھڑی ہو جاتی تھیں جیسے وہ واقعی اندرا جی کے سامنے کھڑی ہوں۔ الیکشن کی گاڑیوں پر اس طرح کے پوسٹر لگے ہوئے تھے اور گاؤں میں پہونچتے ہی عقیدت و احترام اور بے لوث محبت کا یہ مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے اکثر جگہ عورتوں کو روتے ہوئے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو دکھایا۔ وزیر اعظم راجیو

گاندھی کی تصویر کو دیکھ کر اس طرح کی کیفیت بڑھ جایا کرتی تھی اور اس موقع پر دیہاتی عورتوں کی باہمی گفتگو سننے کے قابل ہوتی تھی۔ ان کا ایک ایک جملہ محبت سے بھرا ہوتا تھا۔ اور اُن کے چہروں کے نقوش اُن کی دلی کیفیات کی ترجمانی کرتے تھے۔ میں ڈومریا گنج ضلع بستی کے ایک جلسۂ عام میں شریک تھا جس میں وزیر اعظم راجیو گاندھی آنے والے تھے۔ قاضی جلیل عباسی ایم پی وہاں سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ میں مختلف جگہوں پر دورے کرتا ہوا وہاں پہونچا تھا۔ سیکڑوں لوگ مجھے ایسے ملے جو میری تقریریں سن چکے تھے۔ اُن لوگوں نے مجھ کو روک کر کہا کہ اتنا بڑا مجمع پھر نہیں ملے گا۔ آپ اپنی تقریر میں اندراجی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والی بات ضرور کہہ دیجئے گا۔ یہ عجیب اتفاق کہ یہ بات میرے ذہن میں آگئی تھی اور جہاں میں اُسے پُرزور انداز میں کہتا تھا وہاں عوام کے علاوہ خواص اور سیاسی رہنما تک تالیاں بجانے لگتے تھے۔ اس جلسہ میں جب میں نے اپنی تقریر کو زیادہ پرجوش بنایا اور ایک خاص تمہید کے ساتھ یہ بات کہی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا مجمع ایک اضطراب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ اضطراب کچھ ایسا ہی تھا جیسے میرؔ نے کہا تھا کہ جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے۔ اسی جلسہ میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ فضائے آسمانی میں ہیلی کاپٹر نظر آیا تو پورا ماحول راجیو گاندھی زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا اور عورتیں دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ہیلی کاپٹر کی طرف نگاہیں لگائے ہوئے تھیں۔

وہ الیکشن کا آخری دن تھا۔ زبردست کہرے کی بنا پر وزیر اعظم کا ہیلی کاپٹر وقت پر روانہ نہیں ہو سکا اور وہ نہیں آسکے۔ اُن کا پیغام موصول ہوا۔ اس وقت عوام کے چہروں پر مایوسی چھا گئی تھی اور وہ بجھے بجھے رخصت ہو رہے تھے۔ ہم لوگ یہ سمجھے کہ اس کا اُلٹا اثر ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عوام نے ووٹ دینے کا فیصلہ تو کر ہی لیا تھا وہ اندراجی کے بعد راجیو گاندھی کو دیکھنا چاہتے تھے جنھوں نے ایسے نازک ترین وقت میں ملک کی قیادت سنبھالی تھی۔ وزیر اعظم کے علاوہ اس وقت اُن کی حیثیت اس نوجوان بیٹے کی تھی جسے اپنی ماں کی لاش پر آنسو بہانے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اس کے شانوں پہ ملک کا یہ بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔

اندراجی کی زندگی میں ان کی پالیسیوں اُن کے خیالات اُن کے افکار و نظریات سے اختلاف کی بڑی گنجائشیں تھیں وہ اب اُن کے بعد بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ گفتگو ہوتی رہے گی لیکن غالباً اس کی تردید کوئی نہیں کر سکے گا کہ وہ جرأت و ہمت کا پیکر تھیں۔ اُن کے دل میں اس ملک کو بنانے سنوارنے اور متحد رکھنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ وہ کسی مسئلہ پر فیصلہ دیر میں کرتی تھیں لیکن غور و فکر کے بعد جب رائے قائم کر لیتی تھیں تو پھر کوئی خوف کوئی خطرہ کوئی مصلحت اُسے تبدیل نہیں کرا سکتی تھی۔ وہ نتائج سے بے نیاز ہو کر کام کرتی تھیں، لیکن ہمیشہ اچھے نتیجہ کی امید رکھتی تھیں۔ زندگی کو شیش محلوں میں محفوظ رکھنا اور باہر کی تیز و تند ہواؤں سے بچائے رکھنا انھیں کبھی پسند نہیں تھا۔ یہ مزاج جواہر لال جی کا بھی تھا لیکن اندرا جی پوری زندگی اس کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ وہ اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے ساتھیوں اور پارٹی کے کارکنوں میں بے خوفی اور مستعدی پیدا کر دیتی تھیں۔

۱۹۷۷ء میں کانگریس ہار گئی اور خود اندراجی بھی شکست کھا گئیں۔ وہ رات کا عجیب و غریب لمحہ تھا جب ریڈیو نے اس کا اعلان کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شے میں کوئی حرکت باقی نہیں رہ گئی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی ہے۔ حوصلے پست تھے اور مستقبل بالکل غیر یقینی لیکن اندرا جی لیڈر تھیں وہ صورت حال کو صحیح طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر اُن کی طرف سے بھی سرد مہری کا اظہار ہوا تو پارٹی کو نقصان پہونچے گا چنانچہ الیکشن ہارنے کے بعد بھی میدان کو چھوڑا نہیں بلکہ اس پر اپنی گرفت اور زیادہ مضبوط کر دی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ وہ اور اُن کی پارٹی زبردست شکست سے دوچار ہوئی ہے وہ کبھی

پیچھے نہیں دیکھتی تھیں۔ اُن کی نگاہیں ہمیشہ مستقبل پر لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی انھوں نے یہی کیا۔ وہ نئے عزم و ارادہ کے ساتھ سامنے آئیں، پورے ملک کا دورہ شروع کیا۔ دیہاتوں اور قصبات کو بھی نہیں چھوڑا۔ سیلاب آیا تو بہ چشم خود اس کا معائنہ کرنے اور عوام کو تسلی دینے کے لیے پہنچیں بیلچی کا سفر ہاتھی سے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے فضا ایک بار پھر اندرا گاندھی زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی اور یہ احساس ختم ہو گیا کہ وہ وزیر اعظم نہیں ہیں۔ اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں تھا لیکن دلوں پر حکومت اندراجی کی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ۔ وہ دور کتنا اذیت ناک تھا۔ ذاتی طور پر اندراجی پر مقدمات میں ملوث کر دی گئی تھیں۔ ٹھہرنے کے لیے بعض وقت گیسٹ ہاؤس نہیں ملتے تھے۔ ایک شب کے لیے جیل بھی جانا پڑا۔ جنتا پارٹی نے زمین و آسمان اُن کے لیے تنگ کر دیے تھے انھیں اندازہ نہیں تھا کہ جنتا کے نام پر پارٹی بنانے سے کیا ہوتا ہے ہندوستان کی جنتا اب بھی اندرا گاندھی کے ساتھ تھی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایمرجنسی کے دوران حکام نے بہ طور خاص اور کچھ وزرا صاحبان نے بھی عوام کے ساتھ کھلواڑ کیا اور اُن پر زیادتیوں کی بھرمار کی گئی۔ انھوں نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اندراجی کو صحیح صورتِ حال سے باخبر کیا جائے۔ خود سنجے گاندھی بھی اس کے مضر نتائج کا اندازہ نہیں کر سکے۔ ان کے المناک حادثے کے بعد میں نے ایک مفصل مضمون "قومی آواز" میں لکھا جس میں اس صورتِ حال کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا تھا۔ اسے اب دُہرانا نہیں چاہتا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دورانِ ایمرجنسی اندراجی سے ملاقات کر کے اُن کی خدمت میں ایک جامع اور مفصل خط بھی پیش کیا تھا جو مولانا کی خود نوشت سوانح حیات "کاروانِ زندگی" کے حصہ دوم میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا اُس وقت کی فضا اور حالات سے بے چین تھے اس خط میں اُن کے اضطراب اور ان کے خدشات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بہت واضح انداز میں انھوں نے سب کچھ بیان کیا ہے لیکن اس میں اس کا اظہار بھی ہے کہ اندراجی کو حالات نہیں بتائے گئے اور انھیں ہر طرح سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ مولانا کے خط کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اس سلسلہ میں آپ کی مجبوریوں اور دشواریوں کا مجھے احساس ہے جو آپ کو اتنے بڑے ملک کی ان نازک حالات میں قیادت و انتظام میں پیش آ رہی ہیں لیکن میری شروع سے یہ مخلصانہ رائے رہی ہے کہ آپ کو خدا نے جو غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں، عزم صمیم اور جلد فیصلہ کرنے کی جو قابلیت عطا کی ہے اس سے آپ ان مشکلات پر غالب آ سکتی ہیں۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ آپ تک صحیح حالات و واقعات پہنچنے نہیں دیے جاتے ورنہ آپ اس صورتِ حال کو کسی طرح باقی رہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔"

"میں آپ کو اس سلسلے میں بڑی حد تک مظلوم بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کو انتظامیہ کے ذمہ داروں نے بالارادہ یا بلا ارادہ بہت بدنام کیا۔"

"آپ سے زیادہ اس خودداری و خود اعتمادی کی قدر کرنے والا اس کی حفاظت کی ضرورت کو سمجھنے والا اور ہر قیمت پر اس کو باقی رکھنے والا مشکل سے ملے گا اس لئے کہ اس کے حصول میں آپ کے خاندان کا بنیادی حصہ ہے اور آپ نے اس پودے کو اپنے خون پسینہ سے سینچا ہے۔ آپ اپنی قیادت کے زمانہ میں اور اپنی آنکھوں کے سامنے اس پودے کو مرجھاتا اور جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں۔"

اسی زمانہ میں اندراجی مولانا سے ملنے کے لیے رائے بریلی سے اُن کی قیام گاہ تکیہ گئیں۔ اُن کے ساتھ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی، نرائن

وت تیواری اور محسنہ قدوائی بھی تھیں۔ یہ عید کا موقع تھا۔ کئی اکابرینِ ملت بھی مولانا سے ملنے تشریف لے گئے تھے اُن میں مولانا ابواللیث صاحب بھی تھے جو اس وقت جماعت اسلامی ہند کے امیر ہیں۔ وہ کچھ دنوں قبل جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ اُن کا تعارف بھی اندراجی سے کرایا گیا۔ اس وقت مولانا سے اندراجی کی جو گفتگو ہوئی وہ بھی مذکورہ بالا اقتباسات کے بعد درج ہے:

"میں نے کہا میں آپ کو ایک طرح سے مظلوم سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے حقائق و واقعات کو آپ کی نظر سے اوجھل رکھا اور آپ کو ملک کے صحیح حالات اور لوگوں کے جذبات کا علم نہیں ہونے دیا۔"

عوام نے بڑی امیدوں کے ساتھ جنتا پارٹی کو اقتدار دیا تھا لیکن سب کچھ ان کی بندر بانٹ کی نذر ہوگیا۔ وہ آپس میں کرسی کے لیے لڑتے رہے اور اندراجی شب و روز عوام سے رابطہ استوار کرتی رہیں۔ اسی زمانہ میں اعظم گڑھ کا وہ تاریخی الیکشن ہوا جہاں سے کانگریس نے نئی کروٹ لی تھی۔ پارلیمنٹ کا ضمنی الیکشن تھا۔ کانگریس کی امیدوار مسز محسنہ قدوائی تھیں۔ میں اس الکشن میں گیا تھا۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما خیمول میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ اندراجی نے کئی روز تک دورے کیے۔ اس الیکشن میں یہ بات قابلِ دید تھی کہ کانگریس کا ہر چھوٹا بڑا آدمی اپنے کو رضاکار سمجھ رہا تھا اور اندراجی نے سب کے اندر ہمت جوش جذبہ اور محنت و مستعدی کا صور پھونک دیا تھا اور اپنے رویوں سے یہ بتا دیا تھا کہ اسی الیکشن سے کانگریس کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوگا۔ مسز محسنہ قدوائی کی اپنی شخصیت کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ انھوں نے اپنے اخلاق و طرزِ گفتار سے پورے حلقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور مخالف کیمپ میں اقتدار کے سایہ کے باوجود سراسیمگی تھی۔ کانگریس الیکشن جیت گئی اور پورے ملک میں کانگریسیوں نے خوشیاں منائیں۔ اندراجی نے ثابت کر دیا کہ اخلاص و وفا کا چراغ تیز آندھیوں سے بھی جل سکتا ہے۔ یہ جیت تنہا اندراجی کی شخصیت کی جیت تھی اور جیسا کہ انھوں نے کہا تھا۔ یہیں سے نئی تاریخ کا آغاز ہوا۔

مشرقی اضلاع میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اندراجی ایک قافلہ کے ساتھ دورہ کر رہی تھیں۔ بستی کا دورہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور شریک رہا ہوں۔ سیکڑوں میل کا سفر کار پر وہ کرتی تھیں دوسرے تھک جاتے تھے لیکن وہ تھکنا جانتی ہی نہیں تھی۔ بھنگا بہرائچ کی تحصیل ہے وہاں کشتی پر سوار ہو کر رات میں بارہ بجے پہونچیں اور اس وقت بھی ہزاروں کا مجمع ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اتردلہ ضلع گونڈہ سے اندراجی ڈومریا گنج جا رہی تھیں۔ کاروں کا طویل سلسلہ تھا۔ راستے میں قاضی جلیل عباسی ایم۔ پی کا گاؤں پڑتا تھا۔ سڑکوں پر لوگوں نے خیر مقدمی پھاٹک بنا رکھے تھے اور بہت بڑا مجمع اکٹھا تھا۔ اس قافلہ میں خود قاضی صاحب بھی تھے جس کی اطلاع اندراجی کو تھی۔ وقت کم تھا آگے جلسہ میں شریک ہونا تھا لیکن لوگوں نے گاڑی روک لی اور اندراجی کو پھولوں سے لاد دیا۔ میں جلدی سے اپنی گاڑی سے اترا اور لوگوں کو ہٹانا چاہا تو مجھے یہ کہہ کر الگ کر دیا گیا کہ آپ اندراجی کو دیکھنے بھی نہیں دیں گے۔ اتنے میں ایک ضعیف عورت لاٹھی کے سہارے آئی اور جس گاڑی پر اندراجی تھیں اس کے پاؤں دان پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ اپنی زبان میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے کس کے سہارے پر ہم لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اندراجی فوراً گاڑی سے باہر آگئیں اس عورت کو دلاسہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بے حد متاثر تھیں اور نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں۔ لوگوں نے کہا یہ قاضی جلیل عباسی کا گاؤں ہے مجھے بتائیں وہ میرے ساتھ موجود ہیں۔ اس طرح کے جلسوں میں اندراجی اکثر یہ بات کہتی تھیں کہ میں اقتدار میں نہیں ہوں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی لیکن میں آپ کے دُکھ میں شریک ہونے کے لیے آئی ہوں۔ اُن کا جلسہ ختم نہیں ہوتا تھا کہ فضا اندرا گاندھی زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھتی تھی۔ اس طرح دھیرے دھیرے پورا ملک اس طرح کے نعروں سے گونجنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فیض کی زبان میں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اُٹھتے ہی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے۔

بالآخر ۱۹۸۰ء میں پارلیمنٹ الیکشن کا اعلان ہوگیا۔

جنتا پارٹی بنی تھی تو ۱۹۷۷ء میں مرارجی ڈیسائی وزیراعظم تھے اس وقت چودھری چرن سنگھ اس عہدہ پر تھے لیکن اس طرح کہ وزیراعظم کی حیثیت سے انھوں نے پارلیمنٹ کا سامنا نہیں کیا۔

پورے ملک میں تبدیلی کے آثار نمایاں تھے۔ اندرا جی نے اپنی شخصیت سے سیاسی فضا کو تہہ و بالا کر دیا تھا اور ہر جگہ ہر موقع پر اُن کی کمی محسوس کی جا رہی تھی، ایک دلچسپ واقعہ ابھی تک ذہن میں تازہ ہے۔ چودھری چرن سنگھ کا پروگرام بستی شہر میں تھا دن میں ۱۱ یا ۱۲ بجے۔ سرکاری پروگرام میں یہ وضاحت تھی کہ وزیراعظم دن میں تقریر اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ایک گھنٹہ آرام کریں گے۔ اسی دن اندرا جی کا پروگرام بھی تھا۔ بارہ بنکی سے بنارس تک اور درمیان میں ہر ضلع میں کم از کم دو جگہ اور یہ سب ایک ہی دن میں۔ دونوں پروگرام دیکھ کر ہم لوگوں نے اندازہ کیا کہ موجودہ وزیراعظم جتنی دیر آرام فرمائیں گے اتنی دیر میں اندرا جی چار پانچ میٹنگوں میں شریک ہوتی ہوئی آگے نکل جائیں گی انھیں نہ کھانے سے مطلب نہ آرام سے۔ زندگی کو شیشہ کی طرح بچانا نہیں بلکہ فولاد کی طرح ٹکرانا انھیں زیادہ پسند تھا۔

الیکشن ہوا۔ کانگریس جیتی اور اندرا جی بھی جیت کر پھر وزیراعظم ہو گئیں۔ حالات کا اندازہ کر کے میں اپنی الیکشنی تقریروں میں یہ بات یقین و اعتماد کے لہجہ میں کہتا تھا کہ کانگریس جیتے گی اور اندرا جی وزیراعظم ہوں گی۔ ۱۹۷۷ء میں یہ بات میں نہیں کہہ سکتا تھا اور کبھی اس انداز میں کبھی بھی نہیں لیکن ۱۹۸۰ء میں میری یہ بات عوام کے نعرہ ہائے تحسین سے ہم آہنگ ہو چکی تھی۔ صرف ڈھائی سال کے عرصہ میں لب و لہجہ کا یہ فرق بھی حالات کی بنا پر تھا۔ اس یقین و اعتماد کو اندرا جی نے پیدا کیا تھا اور آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ صحیح تھا۔

دنیا کی سیاسی تاریخ میں یہ ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ پورے ملک نے ایک موقع پر جو اجتماعی اور بھرپور فیصلہ کیا تھا صرف دو ڈھائی سال بعد اسی ملک نے اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی اور جسے اقتدار سے ہٹا دیا گیا تھا اُسے پھر شان اور وقار کے ساتھ دوبارہ اقتدار سونپ دیا گیا۔ یہ تاریخ جب بھی بیان ہوگی اندرا گاندھی کی شخصیت کا ذکر ناگزیر ہوگا کہ انھیں کی ذات سے یہ تاریخ مزین ہے۔

جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اندرا جی اب دوبارہ برسرِ اقتدار نہیں آئیں گی اور کانگریس کو پھر یہ دن دیکھنے نصیب نہیں ہوں گے۔ بعض عناد پرستوں کے سامنے یہ مسئلہ زیادہ اہم تھا کہ اُن کا کاروبار کس نوعیت سے چل سکتا ہے اس میں ادبی سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی ہر سطح پر کام کرنے والے شامل تھے۔ ایسے لوگ جنھوں نے کانگریس کے دور میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام سے اپنی تنظیم کو منسوب کر کے فائدے اٹھائے تھے۔ انھوں نے بھی یہ رشتہ منقطع کر لیا۔ اس طرح کا ایک واقعہ لکھنؤ میں بھی پیش آیا جس نے ہم لوگوں کو فکرمند بنا دیا۔ چنانچہ میں نے اور میرے دوست مشہور شاعر رئیس انصاری نے باہمی مشورہ سے اُسی زمانہ میں نہرو لٹریری ایسوسی ایشن قائم کی۔ اور اس کے نام سے جلسے کیے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس احساسِ کمتری پر ضرب لگائی جائے جو اس دور میں پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی اطلاع ایک مفصل خط میں اندرا جی کو دی تھی اور ۱۹۸۰ء میں جب وہ دوبارہ وزیراعظم ہوئیں تو نہرو لٹریری ایسوسی ایشن کا ایک وفد قاضی جلیل عباسی ایم۔ پی کی سرکردگی میں دہلی جا کر اُن سے ملا۔ رئیس انصاری اور میں اس میں شامل تھا۔ اندرا جی نے ہم لوگوں کی پوری بات بڑے غور سے سنی میں نے اپنا گزشتہ خط انھیں یاد دلایا اور ایسوسی ایشن کے قیام اس کے پس منظر اور اس کے مقاصد کو بیان کیا۔ کہنے لگیں اسی جذبہ نے کانگریس کو دوبارہ طاقت اور اقتدار دیا۔

۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش بنا بیاست سے علیٰحدہ ہو کر میں نے ادبی سطح پر غور کیا تو مجھے نظر آیا کہ ہندوستان کے اردو شاعروں نے اس موضوع پر سیکڑوں نظمیں کہی ہیں۔ میں نے محنت کر کے اُن سب کو جمع کیا اور ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو گیا۔

ابھی دو سال قبل وہ شائع ہوا۔ تو میں نے اندرا جی کو یہ لکھ کر اجازت مانگی کہ اس مجموعہ کو آپ کے نام منسوب کرنا چاہتا ہوں۔ بنہایت خوشی کے ساتھ اجازت دی اور میں نے اس شعر کے ساتھ اُن کے نام انتساب کر دیا۔

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۹ اگست ۱۹۳۳ء کو اندرا جی کے نام خط میں لکھا تھا:

" لوگ عمل سے اس لئے گریز کرتے ہیں کہ وہ نتائج سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ عمل کے معنی ہیں کھٹکا اور خطرہ۔ دُور سے عمل خطرناک نظر آتا ہے قریب سے دیکھو تو وہ اتنا برا نہیں۔ وہ ایک اچھا ساتھی ہے اس کی بدولت زندگی کی خوشی اور ذوق دوبالا ہوجاتا ہے۔ بہت سے لوگ اونچے پہاڑوں کو سر کرتے ہیں اپنی زندگی اور اعضا کو خطرے میں ڈال کر صرف اس لئے کہ پہاڑ کی چڑھائی شادمانی لاتی ہے اور موانع کی تسخیر کے جلو میں انبساط آتی ہے" انقلاب زندہ باد "

اس طرح کے خطوط " ایک باپ کے خط بیٹی کے نام " اور " تاریخ عالم کی جھلکیاں " میں موجود ہیں۔

اندرا جی کی پوری زندگی پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ان خطوط نے ان کی شخصیت کو بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے ان حقیقتوں کو تلاش کیا تھا جو ان خطوط کی تہوں میں پوشیدہ تھیں اور وہ روشنی حاصل کر لی تھی جس سے جواہر لال جی نے اُن کے دماغ کو روشن کرنا چاہا تھا۔

۱۹۸۰ء میں جب وہ دوبارہ وزیر اعظم ہوئی تھیں تو اُن کے بیٹے سنجے گاندھی اُن کے دستِ راست تھے۔ اقتدار سے محرومی کے دَور میں انھوں نے نوجوانوں کو پورے ملک میں متحد کیا تھا اور الیکشن کے بعد اُن کی شخصیت بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی کہ اچانک وہ ہوائی حادثہ کا شکار ہوگئے۔

یہ حادثہ اندرا جی کے لیے کتنا سخت تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ غالباً اٹل بہاری باجپئی نے یہ کہا تھا کہ اس حادثہ پر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ سورج دوپہر میں غروب ہوگیا ہے۔ میں نے سنجے گاندھی پر ایک مضمون ۷ جولائی ۱۹۸۰ء کے قومی آواز میں لکھا تھا اور اس میں یہ تحریر کیا تھا:

" وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنی مشہور زمانہ ہمت و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے موت کو ایک زندہ حقیقت کی طرح تسلیم کیا ہے اس حادثہ کے بعد انھوں نے صرف ایک جملہ کہا کہ ملک مجھ سے اور میرے بیٹے سے بڑا ہے۔ یہ جملہ تاریخ بن گیا۔ اس میں خود ایک تاریخ جھلک رہی ہے ———— جوان بیٹا جو ان کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کے خوابوں کی تعبیر اُن کا سیاسی مشیر اور رفیق کار تھا ایسا بیٹا رخصت ہوا ہے جس کے لیے ماں کی حیثیت سے انھوں نے یہ کہہ دیا کہ میں اس سے زیادہ اور کیا کھو سکتی ہوں لیکن اُن کی نگاہ میں ملک بہرحال اہم اور بڑا ہے "

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو صبح ۹ بجے انھیں رخصت ہونا تھا اور ۳۰ اکتوبر کی شام کو بارہ گھنٹے قبل ایک جلسۂ عام میں انھوں نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک حرف " تاریخ بن گیا " میں رہوں یا نہ رہوں۔ مرے خون کا ایک ایک قطرہ اس ملک کو طاقت دے گا " اس ملک سے اُن کا مخلصانہ تعلق اور اس سرزمین سے اُن کی والہانہ محبت اور یہاں کے عوام سے اُن کی وفاداری اور تعلق اس ایک جملہ میں موجود ہے۔ اُن کے بعد راجیو گاندھی نے ملک کی قیادت کا بوجھ اُٹھایا تو اپنے طرزِ عمل سے انھوں نے بھی یہ ثابت کیا کہ ملک کا اتحاد اس کی سالمیت اور اس کا وقار و اعتبار کتنا اہم ہے۔ ان مسائل پر اُن کی نگاہ آج بھی مرکوز ہے۔

۱۹۸۲ء میں قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی انگریزی کتاب
AUSPECTS OF POLITICS AND SOCIETY
چھپی تو اس کی رسم اجرا کے لیے اندرا جی سے درخواست کی گئی۔ قاضی صاحب کے برادر خورد قاضی جلیل عباسی ایم۔ پی نے اس سلسلے میں انتظامات کیے۔ اندرا جی کی مرضی سے یہ طے ہوا کہ تقریب اُن کی رہائش گاہ پر منعقد کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دلی میں موجود ادیبوں دانشوروں صحافیوں کے علاوہ سیاسی حضرات کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ میں اس تقریب کی نظامت کے لیے لکھنؤ سے بطور خاص حاضر ہوا تھا۔ وقت کم تھا۔ اندرا جی جیسے ہی پنڈال میں آکر اپنی کرسی پر بیٹھیں میں نے انھیں یہ کہہ کر مخاطب کیا "ہمارے عظیم ملک کی عظیم وزیر اعظم اندرا جی" انھوں نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا مسکرائیں اور پھر کچھ سوچنے لگیں۔ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے صاحبزادے قاضی محمد ارشد عباسی نے انھیں گلدستہ پیش کیا۔ اندرا جی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی اور کتاب مجھے دینے لگیں میں نے عرض کیا آپ اپنے ہاتھوں سے قاضی صاحب مرحوم کے صاحبزادے کو دیدیں۔ اندرا جی نے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کتاب ان کو دیدی۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور قاضی جلیل عباسی کی مختصر تقریروں کے بعد جب میں نے اندرا جی سے درخواست کی تو پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔ اندرا جی نے بات یہاں سے شروع کی کہ اتنی اچھی اردو کے بعد میں کیا کہوں۔ واقعہ یہ ہو کہ اچھی اردو جہاں بولی جاتی ہے فضا کا رنگ بدل جاتا ہو۔ اندرا جی نے اپنی تقریر سے بھی فضا کا رنگ بدل دیا۔ وہ کچھ دنوں قبل غالباً سعودی عرب کے دورے سے واپس آئی تھیں۔ مصروفیت بہت تھی لیکن وہ وقت سے زیادہ بیٹھیں اور بہت مفصل تقریر کی۔ تقریب کے اختتام پر میں نے عرض کیا اندرا جی آپ نے اردو کی تعریف میں ایک خوبصورت جملے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا میں اسی زبان کا ایک دعائیہ شعر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اور پھر عرض کیا آخر میں بہت ادب اور احترام کے ساتھ اردو کی طرف سے ایک شعر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میں ایک سکنڈ کے لیے رکا تو اندرا جی نے کہا پڑھیے۔ میں نے عرض کیا ؎

سارے جہاں کی شامِ غم صبحِ بہار بن گئی
میری سحر کا مسئلہ آج بھی زیرِ غور ہے

۱۹۸۰ء کے پارلیمنٹ الیکشن میں کانگریس نے اپنے منشور میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا تھا۔ میرا اشارہ اسی طرف تھا۔ اندرا جی کو اردو کے مسئلہ سے دلچسپی تھی، انھیں کی ایما پر اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ ریاستوں میں کچھ کام آگے بڑھا۔ بہار نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا تھا لیکن ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک یو۔پی میں ایسا نہیں ہو سکا۔

۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ہنگامہ ہوا تو لال بہادر شاستری وزیر اعظم تھے۔ ایک آرڈی ننس کے ذریعہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم کر دیا گیا تھا پورے ملک کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان تھا۔ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک کُل ہند عظیم الشان کنونشن لکھنؤ میں ہوا۔ اس کی ایک الگ تاریخ ہے جو میں لکھ رہا ہوں۔ اس میں ایک بنیادی بات یہ طے ہوئی تھی کہ اس تحریک کو سیاسی نہیں بنایا جائے گا اور شروع سے آخر تک اس کو اولڈ بوائز چلائیں گے۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اولڈ بوائز کے بجائے سیاسی ہاتھوں کا کھلونا بن گیا۔ یہ ایک افسوس ناک کہانی ہے۔ اس کا ہر لمحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اندرا جی وزیر اعظم ہوئیں تو یہ مسئلہ ان کے سامنے آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس مسئلہ کو لے کر سیاسی پارٹیاں اپنا کام نکالنا چاہتی ہیں اور اس وقت اپنے حق میں فیصلہ کی خواہش مند ہیں۔ آج بھی اس کی تردید نہیں کی جا سکتی اس وقت یہ مسئلہ خالص سیاسی نوعیت کا ہو کر رہ گیا تھا اور اب اندرا جی بھی اس کو اس نگاہ سے دیکھ رہی تھیں چنانچہ جب کانگریس کے وہ تمام لوگ جو مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے اور اس تحریک میں پیش پیش تھے جن میں قاضی جلیل عباسی (جو اس تاریخی کنونشن کے داعی بھی تھے) ضیاء الرحمٰن انصاری اور عزیز امام صاحب مرحوم سر فہرست تھے۔ اندرا جی سے ملے تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ مسئلہ بالکل اہم نہیں ہے مسلمان جیسا چاہتے ہیں وہ ہونا چاہیئے لیکن اس وقت اگر یہ مسئلہ حل ہو گیا تو سیاسی پارٹیاں اس کو اپنی فتح تصور کریں گی۔ اور اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گی۔

سیاسی پارٹیاں اس مسئلہ میں واقعی کس حد تک مخلص تھیں اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب جنتا پارٹی کی حکومت بنی اور وہ سارے لوگ جو اب تک، اس مسئلہ کو استعمال کر رہے تھے۔ اس پوزیشن میں آگئے کہ چشم زدن میں وہ حل کر سکتے تھے لیکن پوری مدت گذر گئی اور بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ ۱۹۸۰ء میں اندرا جی دوبارہ وزیر اعظم ہوئیں تو کچھ دنوں بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کر دیا گیا۔ مسلمان خوش ہوئے اور کانگریس کو سیاسی فائدہ بھی حاصل ہوا اندرا جی دونوں محاذ پر کامیاب رہیں۔

میرا ارادہ تھا کہ میں ایک مختصر تاثراتی مضمون لکھوں گا لیکن لکھنے بیٹھا تو بات آگے بڑھتی چلی گئی اور اب بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ بہت کچھ رہ گیا میں نے کہیں عرض کیا ہے کہ اندرا جی کے نظریات اور افکار و خیالات اور کہیں کہیں ان کے طرز عمل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی پوری زندگی میں اس کی بڑی گنجائش ہے لیکن ان کی شخصیت اور اسکے وقار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشرق و مغرب نے اس کا لوہا مانا۔ ان کی آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ لیکن زندگی میں اسے دبایا نہیں جا سکتا۔ خلیل جبران نے لکھا تھا:

"تم میرے ہاتھ کو زنجیروں سے باندھ سکتے ہو
اور میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال سکتے ہو
لیکن تم میری روح کو غلام نہیں بنا سکتے کیونکہ
یہ آزاد ہے باد صبا کی طرح جو آسمان کی بے
کراں وسعتوں میں منڈلاتی پھرتی ہے"

وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں : صفحہ ۴۶ کا بقیہ

شاداب چہرہ، ان کی شفیق مسکراہٹ، ان کا بے تکلف مگر باوقار لب و لہجہ، ان کی وہ چمکدار ذہین آنکھیں آج بھی میرے تصورات میں زندہ اور محفوظ ہیں

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

میں ان سے اس وقت ملا تھا جب وہ وزیر اعظم نہیں تھیں اور عوام نے بھی اُن کو رد کر دیا تھا مگر ان کے تیور اس بات کے غماز تھے کہ آنے والے دنوں میں جیسے ہی غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں گے، ان کی خدمات اور ایثار کا روشن اور تابناک چہرہ عوام کی نگاہوں میں اپنی صحیح قدر و قیمت کے ساتھ اُبھرے گا اور وہ پھر کروڑوں دلوں کی ملکہ بن جائیں گی ــ مستقبل نے ثابت کیا کہ ان کے یہ تصورات صحیح تھے۔

عبدالرحمان خاں نشتر
سابق وزیر اطلاعات اترپردیش

"کس قدر بے باک روح اس ناتواں پیکر میں تھی"

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی قوم کے اتحاد و سالمیت اور طاقت کی علامت تھیں۔ ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے جو عظیم قربانیاں دیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جنگِ آزادی کے مجاہدین کی صفِ اوّل میں تھیں، وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے اس ملک کو ترقی و خوشحالی سے ہمکنار کرنے میں قابلِ ذکر کارنامے سرانجام دیے جنھیں تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ قوم کو معاشی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں۔ ان کے متعدد پروگرام اس کے شاہد ہیں کہ وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ساری منزلیں سر کر لینا چاہتی تھیں۔ جتنی برق رفتاری سے وہ فیصلے کرتی تھیں اسی برق رفتاری کے ساتھ انھیں عملی جامہ بھی پہنانا چاہتی تھیں۔ ان کی قیادت میں چلنے والے کاروانِ ترقی کی تیز گامی کو دیکھ کر بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا تھا ؎

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی بلند حوصلگی اور ان کا عزم آہنی تھا جو ان کو اس صدی کے دوسرے لیڈروں سے ممتاز کرتا تھا۔ صبر آزما حالات اور بڑی سے بڑی مشکلات ان کا راستہ نہیں روک سکتی تھیں۔ صنفِ نازک ہونے کے باوجود یہ عزم آہنی، یہ جرأتِ بیباک اور یہ جسارت آفریں اندازِ فکر و عمل یقیناً ساری دنیا کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا اور یہ ان کے امتیازی اوصاف تھے جن میں ان کا کوئی مدِمقابل نہ تھا۔ وہ جو ٹھان لیتی تھیں کر گزرتی تھیں خواہ اس میں کتنی ہی رکاوٹیں اور حوصلہ شکن دشواریاں ہی کیوں نہ حائل ہوں۔

شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے دورِ حکومت میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیے ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ ملک کو ترقی کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ بینکوں کو قومیانے اور صرفِ خاص (پریوی پرس) کے خاتمہ کا فیصلہ نیز بیس نکاتی پروگرام کا آغاز اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ وہ ملک کو خوشحالی اور خود کفالت سے ہمکنار کرنے، غریبوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور ملک کی ہمہ گیر ترقی کو یقینی بنانے کے لیے کس درجہ آرزومند تھیں۔ درحقیقت ان کی ذات گرامی پیکرِ عزم و عمل تھی۔ ملک کو خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے کی دھن انھیں ہمیشہ مضطرب رکھتی تھی۔ ان کے لیے قومی مفاد مقدم ترین اور ذاتی مفاد سے بالاتر تھا۔ ان کے تمام پروگراموں اور پالیسیوں کے پیچھے یہی ایک جذبہ کارفرما تھا کہ کس طرح ملک کو آگے بڑھایا جائے، اقوامِ عالم

میں اسے سربلند کیا جائے اور اس کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں تمام سہولتیں فراہم کی جائیں، انھیں آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے اور ان کا دامن مسرت وشادمانی سے بھر دیا جائے۔

غریبوں، کمزوروں اور مظلوموں کی تو وہ مسیحا تھیں، وہ انھیں زندگی کی جملہ آسائشیں مہیا کرنے، ان کی دادرسی کرنے، انھیں تحفظ فراہم کرنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے پُرعزم تھیں۔ بنکوں کو قومیانے کے پیچھے بھی یہی جذبہ کار فرما تھا کہ غریبوں، کمزوروں اور ناداروں کی بنکوں تک رسائی ہو سکے، انھیں قرضے مل سکیں اور وہ مختلف قسم کے کاروبار اور صنعتوں کے ذریعہ اپنی معاشی حالت بہتر بنا سکیں اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ چنانچہ جن بنکوں سے صرف سرمایہ دار اور دولتمند افراد ہی مستفید ہو سکتے تھے، ان کے دروازے غریبوں اور ناداروں کے لیے بھی کھل گئے اور انھیں یہ موقع فراہم کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے جوہر دکھلائیں۔

ان کا بیس نکاتی پروگرام جہاں ایک طرف ملک کی ہمہ گیر ترقی کا ضامن ہے وہیں دوسری طرف غریب، کمزور، پسماندہ اور پامال افراد کی فلاح وخوشحالی کا بھی نقیب ہے۔ وہ لوگ جو غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہے تھے، جو بے سروسامان تھے، جن کا کوئی پُرسان حال نہ تھا، انھیں شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے اس پروگرام کے تحت سہارا دیا، ان کے حوصلے بلند کیے اور ان میں ایک نیا اعتماد پیدا کیا اور ان کی اس زندگی کو جو ان کے لیے اجیرن تھی، خوشحال، شادکام اور بامراد بنایا۔ درحقیقت ان کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا جو کمزوروں، مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی زبوں حالی پر تڑپ اٹھتا تھا۔

انھیں اپنے دیش اور اس کے عوام سے بے پناہ محبت تھی، وہ ان کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک تھیں، عوام بھی اپنی محبوب رہنما پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ ملک کے جس گوشے میں بھی جاتیں لوگ بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا کر بھی ان کی بات سننے اور ان کے درشن کرنے کے لیے کثیر تعداد میں جمع ہو جاتے اور تہہ دل سے ان کا خیر مقدم کرتے۔ حقیقتاً اندرا گاندھی لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایک قلیل عرصہ کے لیے حکومت سے محروم ہو گئیں تو بھی ان کی رہائش گاہ پر ان کے درشن کے لیے آنے والوں اور اپنے دکھ درد کی کہانی سنانے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ وہ ان سب کی دلجوئی کرتیں اور ان کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔

درحقیقت وہ اخوت ومحبت، یگانگت وہم آہنگی امن وآشتی، اتحاد واتفاق اور قومی یک جہتی کی بہت بڑی علمبردار تھیں۔ انھیں ملک کا اتحاد اور اس کی سالمیت سب سے زیادہ عزیز تھی جس کیلئے انھوں نے اپنی جان بھی قربان کر دی اور اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا کہ "میرے خون کا ہر قطرہ میرے دیش کو استحکام بخشے گا" اقوام عالم میں اپنے ملک کا وقار بھی انھوں نے بلند کیا۔

اندرا جی نے نہ صرف ہندستان بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنی قیادت کا لوہا منوا لیا۔ چنانچہ سو سے زائد ناوابستہ ملکوں نے اتفاق رائے سے انھیں اپنا سربراہ منتخب کیا۔ ناوابستہ تحریک کی سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے ترقی پذیر اور تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے آواز بلند کی۔ ان کی بیش بہا خدمات نے ناوابستہ تحریک کو بے حد تقویت پہنچائی اور دنیا ان کے تدبّر ودانائی کی قائل ہو گئی۔

اندرا جی کے دور حکومت میں ہندستان نے ہر اعتبار
(باقی صفحہ ۷۲ پر)

علیمہ پروین

"اک تو نہیں تو سارا زمانہ اداس ہے"

وہ دن کچھ عجیب سا تھا۔ عجیب سا بھی اور اداس بھی شاید مجھے ایسا محسوس ہوا ہو۔

کوئی ۲ بجے کا وقت ہوگا کام سے فارغ ہوکر ذرا لیٹی تھی آنے والے نئے رسائل بھی دیکھ رہی تھی اور اندراجی کی نرم نرم میٹھی میٹھی سیدھی دل میں اتر کر دل کی رگوں کو دل کے تاروں کو ہلا دینے والی آواز بھی سنتی جا رہی تھی ان کی ایک تقریر کا ٹیپ میری بیٹی بتی نے لگا رکھا تھا وہ اندراجی پر دل و جان سے فدا تھی۔

دروازہ ایک زور دار آواز کے ساتھ کھلا اور آندھی طوفان کی طرح سائیکل اندر لاتا ہوا میرا منجھلا بیٹا فرمان چیخ کر بولا۔

"امی۔ امی۔ سنا آپ نے۔ اندرا گاندھی کو کسی نے گولی مار دی"

میرے سر پہ جیسے کسی نے چھت گرا دی میں اٹھ کر بیٹھی اور زور سے بولی۔

"پاگل ہوگئے ہو کیا؟"

اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹ نمایاں طور پر کپکپا رہے تھے۔ نڈھال نڈھال سا آکر وہ اگلے برآمدے کے تخت پر بیٹھ گیا اور بولا۔

" ہاں امی! میں ماسٹر صاحب کے یہاں گیا تھا اور بھی آٹھ نو لڑکے تھے۔ ماسٹر صاحب نے پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا اسی نے خبر دی اندراجی کو کسی نے گولی مار دی ..... وہاں بھگدڑ مچ گئی ماسٹر صاحب دھوتی بنیائن پہنے ہی باہر بھاگے اور میں بھی آ گیا۔ راستے میں لوگ جگہ جگہ گھیرا لگائے کھڑے ہیں۔ امی پورے شہر میں سناٹا سا چھا گیا ہے!

نہیں! مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

بتی رو رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ اندراجی کو کچھ نہیں ہو سکتا کچھ نہیں۔ امی وہ تو اتنی اچھی ہیں اتنی پیاری ان کو کون گولی مار سکتا ہے"

"بیٹی ..... ہوگا کوئی ظالم، سنگدل، درندہ ..... اٹھو تم سب دعا مانگو!"

میرے سب بچے قبلہ رو ہو کر دست بدعا تھے اور میں سوچ رہی تھی۔

یہ دعائیں اندرا گاندھی کے لیے ہو رہی ہیں۔ اپنی مقبول ہر دلعزیز وزیر اعظم کے لیے۔ دیوی جیسی اس عورت کے لیے جو مہربان بھی ہے اور عظیم بھی، جو دلوں میں بھی رہتی ہے اور دماغوں پر بھی حکومت کرتی ہے، جو نرم و نازک ہوتے ہوئے بھی فولاد کی طرح سخت اور مضبوط ہے، جو لچکدار جسم رکھتے ہوئے بھی مونگے کی چٹان کی طرح اٹل ہے جس کی نرم نرم آواز میں پھولوں کی نرمی بھی ہے اور تلوار کی کاٹ بھی، جس کی بڑی بڑی گہری گہری آنکھوں میں ایک ایسی

مقناطیسی کشش ہے جو ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ پھر آخر وہ کون تھا جو اس کشش سے کھنچ نہ سکا۔ میں نے ان کو صرف ایک بار دیکھا تھا بہت قریب سے لیکن وہ میرے دل میں رہتی تھیں۔ میرے گھر میں ہر وقت ان کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ ٹی وی پر ان کو دیکھتے ہی بچے چلانے لگتے۔

"امی آئیے۔ جلدی سے آئیے اندرا جی بول رہی ہیں۔"

تیز تیز چلتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، سر پر پڑا ہوا آنچل درست کرتی ہوئی لوگوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتی ہوئی۔۔ ان کا ہر روپ پرکشش تھا ہر انداز خوبصورت تھا۔ وہ گوشت پوست کی عورت ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات ایک آسمانی مخلوق، ایک ماورائی ہستی اور کسی دوسری دنیا کا وجود معلوم ہونے لگی تھیں۔ بچپن سے کان ان کا نام سنتے آ رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستانیوں کے آئیڈیل اور ہیرو تھے۔ ان کی بیٹی ان سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں۔ وہ عورتوں میں دیوی بنکر پوجی جانے لگی تھیں اور نئی نسل ان کو ماں کہنے لگی تھی۔

ہاں، وہ نئی نسل کی ماں تھیں۔ تب ہی تو میرے بچے بلک بلک کر ان کے لیے ان کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میرا چھوٹا بچہ شاذی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے منھ بسور بسور کر کہہ رہا تھا۔

"اللہ میاں۔ اندرا جی کو ٹھیک کر دیجئے!"

میری آنکھوں میں ان کا سراپا گھوم رہا تھا اور کانوں میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔

کافی عرصے کی بات ہے۔ جب جنتا پارٹی کا دور تھا۔ دو برس کی مختصر سی ناکام زندگی کے بعد حکومت دم توڑنے لگی تھی اور اندرا گاندھی اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ اپنی ناکامی کے باوجود ان کی شہرت، ان کی عزت اور محبت میں کمی نہیں آئی تھی بڑی ہی کوششوں اور جان توڑ سازشوں کے بعد ان کو پس منظر میں ڈھکیلنے والے چند افراد کے علاوہ کوئی دل ان کے پیار اور عزت سے خالی نہ تھا۔ جو جنتا ہر کی پیٹ میں آ کر زمین سے اکھڑ گئے تھے وہ بھی اب اندرا گاندھی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ وہ رائے بریلی آئی تھیں۔ نیشنل کالج میں جلسہ تھا۔ میں بھی پہنچی، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی عورتوں کا ایک سیلاب تھا جو اٹھا پڑا تھا۔ مردوں کا بے پناہ ہجوم تھا جسکی تھاہ نہ مل رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہاتھوں میں گیندے کے پھولوں کے ہار اٹھائے "ماتا جی" کی منتظر تھیں ۔۔۔: گندے میلے کچیلے لوگ بھی تھے اور صاف براق جیسے لباس والے لوگ بھی۔

میلی کچیلی دھوتیوں والی دیہاتی عورتیں بھی تھیں اور قیمتی ساڑھیوں میں لپٹی خوشبوؤں میں بسی خواتین بھی تھیں ۔۔۔: سب کے دل ایک آواز کے لیے دھڑک رہے تھے، سب کی آنکھیں ایک سراپا کی منتظر تھیں۔

پھر آخر، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، ان کی کار آ کر سامنے رکی۔ مجمع جوش سے بے قابو ہو گیا۔ فلک شگاف آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

"اندرا گاندھی۔ زندہ باد۔ اندرا گاندھی زندہ باد"

وہ مسکراتی ہوئی کار سے اتریں۔ لوگوں نے ہر سمت سے ان کو گھیر لیا۔ اسی زمانے میں وہ ذرا دبلی ہو رہی تھیں پریشانیوں اور مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں نے ان کے کندن جیسے رنگ کو میلا کر دیا تھا پھر بھی ان کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک ماند نہیں پڑی تھی۔ سب کے بیچ ہوتی ہوئی بچوں کے رخسار تھپتھپاتی عورتوں کے کندھے چھوتی ہوئی وہ اسٹیج پر گئیں۔ کئی لوگوں نے تقریریں کیں لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا گیا، بچے ان کو چھونے کے لیے بے قرار تھے۔ ایک صاحب نے ایک گندی سی میلی بچی کو ڈانٹا۔

"ارے! اے ادھر کیوں آ رہی ہو چلو بھاگو!"

اندرا جی کو چھو کر دیکھنے والی وہ بچی سہم کر پلٹی ہی تھی کہ دو ہاتھوں نے بڑھ کر اسکو تھام لیا۔

"ٹھہر و بچی: آؤ: میرے پاس آؤ!"

وہ مسکرا کر جھکیں اور بچی کو چوما، پھر اپنے گلے میں پڑے ہار اتار کے اور اسکی گردن میں ڈال دیئے اور مڑ کر ساتھ میں کھڑے لوگوں سے کچھ کہا۔ شاید کہا ہو۔ بچوں کو اس طرح سے ڈانٹا نہیں جاتا ہے

بچی خوشی خوشی بھاگی آئی اور ماں سے بولی۔
"اماں! اماں دیکھو اندرا ماں نے ہمیں ہار دیا اور ہمیں چوما بھی؟"
ماں نے اسکو لپٹا کے زور سے چوم لیا۔ یوں جیسے تصور میں اندرا جی کو چوما ہو۔
کچھ عورتیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ اندرا جی کو قریب سے دیکھنے کے لیے ہر دل بے تاب تھا، پیچھے والی عورتیں احتجاج کر رہی تھیں، ایک دوسری کو ڈھکیل کر سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
"واہ! واہ! اکیلے تم ہی انھیں دیکھنے والی تھوڑی ہی ہو ہمیں بھی دیکھنے دو"
کوئی کہہ رہی تھی ہم فلاں گاؤں سے آئے ہیں کوئی کہہ رہی تھی پانچ کوس پیدل چلی ہوں کوئی کہہ رہی تھی دو پہر سے آکے بیٹھی ہوں
اندرا جی نے سب کو دیکھا، مسکرائیں۔
اس وقت اس دن ان کے ساتھ خورشید عالم خاں بھی تھے محسنہ قدوائی بھی تھیں سنجے سنگھ تھے اور بھی بہت سے مقامی لیڈر تھے کچھ غیر ملکی نامہ نگار بھی تھے۔ بہر حال، انکا زوال ہوتے ہوئے بھی دو دن سے زیادہ ان کا عروج تھا۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہوگا کہ چاند پر خاک ڈالنے سے چاند چھپا نہیں چاند چھپا نہیں۔ گہرے سیاہ بادلوں سے جھانکا اور پوری چمک دمک کے ساتھ نکل آیا۔ اندرا جی نے دوبارہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ کتنی خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں ترقیوں اور کامرانیوں نے قدم چومے۔ ملک کو نئی زندگی اور نئی روشنی ملی۔ کونے کونے میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ گوشہ گوشہ انکے وجود کی خوشبو سے معطر تھا۔ لیکن، یہ آواز، ملک کی یہ ترقی، یہ کامیابیاں، حاسدوں کو پسند نہ آئیں ...... اللہ! کون تھا وہ کون تھا؟ ۔ میرا دل رو رہا تھا۔
وہ رائے بریلی آنے والی تھیں۔ اسی شہر میں جس سے ان کو دلی پیار تھا جس کی ترقی کے لیے وہ دن و رات کوشاں تھیں جس شہر کو انھوں نے نام اور شہرت عطا کی اس شہر میں ان کے خیر مقدم کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ میں نے سوچا تھا اس بار ان سے ملوں گی ضرور مگر آہ ...... اب؟ اب؟ بہر حال دل میں ایک امید تھی۔ آس تھی۔ شاید وہ بچ جائیں۔ وہ اچھی ہوں۔ خبر آئے آپریشن کامیاب رہا۔ وزیر اعظم اب خطرے سے باہر اور رو بہ صحت ہیں۔
خدایا یہ خبر جھوٹی ہو۔
نرمان پھر باہر گیا۔ ہنگامی حالات میں شائع شدہ ایک ہندی اخبار کا ایک ورق لے آیا۔ اندرا گاندھی کی بڑی سی تصویر اور ان پر قاتلانہ حملہ کی خبر۔!
اللہ! دل خون ہو گیا۔
یہ مسکراتی ہوئی صورت۔ یہ خوبصورت آنکھیں۔!
دو بجے سے لیکر شام کے ۶ بجے تک وہ عالم تھا کہ بیان سے باہر بچے بار بار باہر جاتے اور اندر آتے۔
ریڈیو اور ٹی وی خاموش تھے۔ میرے یہاں کھانا پکنے کا کوئی انتظام نہ تھا ایک ایک پیالی چائے پی کر سب ان کی خیریت کے منتظر تھے۔:
آخر شام کے بلیٹن میں، پر درد لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں اناؤنسر نے بتایا۔ کیا بتایا۔! آہ، اندرا گاندھی اس دنیا میں نہیں رہیں!
میرے گھر میں قیامت کا سماں تھا۔ ہم سب رو رہے تھے بچی کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ جیسے جیسے ٹی۔ وی پر عوام کی بے قراریاں اور سینہ کوبیاں دکھائی جاتیں دل خون ہوتا جاتا میرے شوہر کی آنکھیں بار بار تر ہو رہی تھیں، ماتمی دھن دل کے ٹکڑے کیے دے رہی تھی۔
وہ رات!!!
خدایا کتنی سیاہ، بھیانک اور اداس رات تھی۔!
پورا شہر غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دکانوں پر بیشتر تو تھی چہل پہل نہ تھی۔ سینما ہال سنسان پڑے تھے سڑکیں ویران تھیں۔ نہ گیتوں کی آوازیں تھیں نہ لڑکوں کا شور۔ ہر گھر میں خاموشی کا راج تھا۔
صبح ہوئی۔
ٹی۔ وی پر ان کو بار بار دکھایا جا رہا تھا۔ ہائے وہ نرم چہرہ خاموش تھا۔ خوبصورت آنکھیں بند تھیں۔ مسکراتے لب ساکت تھے جس جسم میں ۱۶۔ ۱۷، سوراخ ہوئے ہوں اس جسم کے چہرے پر کسی

تکلیف اور اذیت کے آثار نہ تھے۔ ایسا لگ رہا تھا تھک کر سو گئی ہوں۔ ان تھک کام کرنے والی ہستی آج بے خبر سو رہی تھی۔ راجیو گاندھی کا صبر و ضبط بے مثال تھا۔ سینے میں ایک بیٹے کا دل تھا خدا جانے اندر کیا کیا قیامت بپی ہو گی۔ ممی سامنے تھیں مگر خاموش بے حس و حرکت۔ ہر وقت متحرک رہنے والا جسم دوسروں کے ہاتھوں کی جنبش پر مجبور ہو گیا تھا۔

"جب تک سورج چاند رہے گا۔ اندرا تیرا نام رہے گا۔"
یہ آوازیں صرف دہلی میں ہی نہیں پورے ملک میں گونج اٹھیں۔ دلوں سے نکلی ہوئی یہ آوازیں۔ ایک سادہ لوح آدمی چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

"ارے راجیو بھیا۔ ماں مر گئی۔ ماں مر گئی۔"
راجیو گاندھی عزم و ہمت، صبر و استقلال کی صورت بنے کھڑے تھے۔ ایک عظیم ملک کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی اور عظیم ماں کا درد دل میں۔! جوان بھائی کی چتا کو آگ لگائی تھی تو ماں نے پیٹھ پر ہاتھ رکھا تھا لیکن جب ماں کی چتا کو آگ دکھائی تو پیٹھ پر کوئی نہ تھا۔ ملک کا بوجھ تھا۔ بے پناہ ذمہ داریاں تھیں۔ میں نے دیکھا وہ خاموشی سے ماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لب ساکت تھے ایک ہاتھ بیٹی کے شانے پر تھا۔!

سورج غروب ہو رہا تھا جلتی ہوئی چتا کا دھواں فضا میں بکھر رہا تھا پھیل رہا تھا۔ وہ عظیم جسم شعلوں میں گھر کر خاکستر ہو گیا مگر نام باقی ہے اور باقی رہے گا۔ تاریخ کے اوراق میں، ہند کی فضاؤں میں، لوگوں کے دلوں میں، نئی نسل کی رگ رگ میں، آج وہ ہم میں نہیں ہیں پھر بھی دل کے اندر موجود ہیں۔ جب جب ان کی آواز کا ٹیپ بجتا ہے ان کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔! مسکراتا ہوا نرم نرم چہرہ۔ گہری گہری آنکھیں سیاہ بالوں میں چمکتی ہوئی چاندی کے تاروں جیسی وہ لٹ! جو ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیتی تھی۔

وہ شہید ہو کر زندہ جاوید بن گئیں۔ شہید مرا نہیں کرتے زندہ رہتے ہیں۔ وہ بھی زندہ ہیں۔ ہمارے ساتھ ہیں ہمارے سروں پر ہیں وہ اب بھی اپنے پیارے ہندستان کے اوپر ہیں۔ برفانی بلند چوٹیوں پر گنگا کی شفاف لہروں میں، میدانوں کی تیز ہواؤں میں، جنگلوں کی خوبصورتی اور ہریالیوں میں۔! ذرے ذرے میں۔

وہ امر ہیں اور امر رہیں گی۔ ظالموں نے اندرا جی کا جسم مٹا دیا لیکن یہ بھول گئے ان کی شہادت ان کو زندۂ جاوید بنا دے گی۔ وہ ہمارا آئیڈیل تھیں اب ہیرو بن گئیں۔ انھوں نے کہا تھا میرے خون کا ایک ایک قطرہ دیش کے لیے بہے گا انھوں نے اپنی بات سچ کر دکھائی خدا جانے کس گھڑی ان کے منھ سے یہ الفاظ نکلے تھے، ہواؤں میں جاری ہو گئے یہ الفاظ اور ان کے خون کے قطروں کے ساتھ پگھل کر ہندستان کی زمین میں جذب ہو گئے۔ اس دھرتی میں شہیدوں کا خون جذب ہے۔ گنانے بیٹھوں تو ایک لمبی فہرست بن جائے۔ سب مادرِ وطن کے لیے شہید ہوئے اور امر ہو گئے۔ تاریخ نے ان کے نام سنہرے حروف میں محفوظ کر لیے۔ قیامت تک ان کو کوئی مٹا نہیں سکتا وہ جگمگاتے رہیں گے۔ ان ناموں میں اندرا جی کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ آج سب کی آنکھیں ان کے جانشین راجیو گاندھی کی طرف لگی ہیں۔!

ان سے بڑی ہی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے وہ صرف ہمارے ملک کے وزیر اعظم ہی نہیں ہمارے خاندان کے ایک فرد ہیں۔ محبت، پیار اور اپنے پن کا یہ رشتہ اندرا جی نے قائم کیا ہے۔ پیار کی یہ ڈور اندرا جی نے باندھی ہے جو ہمیشہ بندھی رہے گی۔ لوگوں کے دلوں سے! زندگی کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے دلوں کی ڈور نہیں ٹوٹتی۔ کبھی نہیں۔! ●●

عمر انصاری
۲۰۔ امین آباد پارک لکھنؤ

قتلِ ماہ

عجب عالم ہے دل کی دھڑکنوں کا
یہ کس کا ذکر، کیسی گفتگو ہے
جگر کا ہو لہو، یا چشم و دل کا
لہو جس کا بھی ہو آخر لہو ہے

یہ نقشِ پا ہیں راہِ دل میں کس کے
ابھی گزرا تھا ہو کر کون اِدھر سے
نہا کر خوں میں دھرتی پر گرا کون
اُبلتا ہے لہو ہر چشمِ تر سے

لہو میں تر ہیں جس کی آستینیں
وہ بیگانہ تو اپنا ہی لگے ہے
محافظ روپ دھاریں قاتلوں کا
مجھے تو سب تماشا ہی لگے ہے

پرستارانِ مذہب تو سبھی ہیں
جسے انسان کہتے ہیں کہاں ہے
اہنسا وادیوں کی سر زمیں پر
یہ کیسی آگ، یہ کیسا دھواں ہے

چتا کی آگ کتنی مشتعل ہے
کوئی زندہ جلایا جا رہا ہے
تری دھرتی پہ اے دھرتی کے مالک
غضب کیسا یہ ڈھایا جا رہا ہے

اندھیری شب میں یوں اے رہ نوردو
کہیں کرتا ہے قتلِ ماہ کوئی
جلاتا ہے کوئی آپ اپنی فصلیں
صبا کی روکتا ہے راہ کوئی

سمجھتا کیوں نہیں انسان آخر
اگر یہ واقعی پاگل نہیں ہے
تشدد، آپ خود اک مسئلہ ہے
تشدد، مسئلے کا حل نہیں ہے

مخمور سعیدی
۳۲۰۷، پھاٹک تیلیاں
ترکمان گیٹ دہلی ۔ ۶

سورج کا قتل
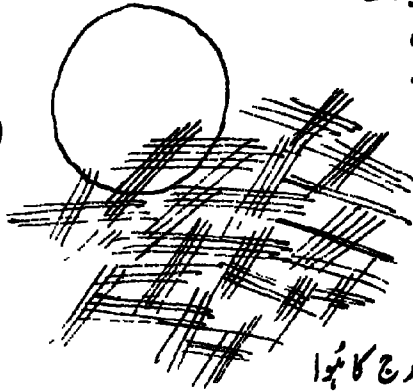
ہُوا پھر قتل سورج کا ہُوا
حدِ نظر تک تیرگی چھائی
لہو میں آسماں ڈوبا
زمیں نے خوف و دہشت کا کفن پہنا

غنیمِ شب کا لشکر شاہراہوں پر نکل آیا
درندوں کی طرح جھپٹا
دیارِ زندگانی کے مکانوں پر، مکینوں پر
کدورت کے سیہ خنجر اتارے
صاف اور شفاف سینوں میں
لگا دی آگ بڑھ کر نور و نکہت کے خزینوں میں
دھواں اٹھنے لگا وحشت کا بازاروں سے، گلیوں سے
سلگتے بام و در گرنے لگے ظلمات کی اندھی گپھاؤں میں
اندھیرا موت کا بھرتا گیا روشن فضاؤں میں

مگر سورج تو ہر شب قتل ہوتا ہے
پہنتی ہے زمیں کالا کفن اور آسماں بھی خون روتا ہے
اندھیرا روشنی کو روز ہی مغلوب کرتا ہے
پھر اس کے بعد یوں ہوتا ہے
سورج سرخرو ہو کر اندھیری شب کے مقتل سے نکلتا ہے
اور اپنے قتل کے ناکام منصوبے پہ ہنس کر مسکراتا ہے
اندھیروں کا تفاخر
روشنی کی مسکراہٹ کے تلاطم میں اچانک ڈوب جاتا ہے
یہ سورج آج جس کے قتل پر نازاں
غنیمِ شب کا لشکر ہے
یہ سورج بھی
کل اپنے قتل کی ناپاک سازش پر
ہنسے گا، مسکرائے گا
اندھیرے منفعل ہوں گے
اُجالا سرخرو ہو کر پھر اپنی مملکت میں لوٹ آئے گا

عالم فتحپوری
اختر منزل، کشمیری بازار
آگرہ

باپ بیٹی کی ملاقات

(۳۱ اکتوبر کو عالمِ ارواح میں)

نہرو

میری بیٹی، میری اندو، میری پریہ درشنی
تو شہیدانِ وطن میں آج شامل ہو گئی
تو نے لکھا خون سے تاریخ کا ایسا ورق
سرخرو جس سے رہے گا حشر تک رُوئے شفق
جو کہا پہلے وہی کر کے دکھایا تو نے کام
رہتی دنیا تک رہے گا میری بیٹی تیرا نام
دیدیا دادا کی تو نے پیش گوئی کا ثبوت
تو میری بیٹی نہیں تھی، تھا بہادر اک سپوت

ہاں تو میں نے بھی سنبھالا تھا اسی بھارت کا راج
تو نے پہنایا مگر اس کو وہ اک پُر نور تاج
شانتی اور ایکتا کے جس میں ہیں لعل و گہر
جس کی جانب اٹھ نہیں سکتی ہے دشمن کی نظر
شو دیے جو میں بنا کر چھوڑ آیا تھا وہاں
تو نے اُن سب میں محل سے پھونک دی ہے جان
تو نے رکھائی ہے نہرو خانداں کی آبرو
خانداں کا ذکر کیا ہندوستاں کی آبرو

ماتیرہ نہرو، بھگت سنگھ، چندر شیکھر، بھکشی

ستہ حیا، شاہِ ظفر، اشفاق و تیسک، گاندھی جی
سب کی روحیں آ رہی ہیں تجھ کو لینے کے لیے
اور مجھ کو بھی مبارک باد دینے کے لیے
سرمۂ چشمِ ریاست بن گئی ہے تیری خاک
سب لگے کہنے لگے ہندوستاں کی جانِ ذی رگ

بے حیا، وحشی، کمانی، بدمعاش و بدچلن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ جہاں، ننگِ وطن
جانے کب سے سوچتے تھے ظلم ڈھانے کے لیے
زندگی کے تیری دیپک کو بجھانے کے لیے
گولیاں برسائیں تجھ پر، تجھ کو گیا زخمی کیا
ہائے بھارت ماں کے دل کو چھلنی چھلنی کر دیا
یہ نہ سوچا تجھ کو مارا تو امر ہو جائے گی
راشٹر ماتا آنے والی نسل کی کہلائے گی
تیرے دشمن تھے جو کل تک، جو مخالف تھے ترے
مورتی تیری بنا کر اب وہ پوجیں گے تجھے
تو نے رکھ لی میری عزت، تو نے رکھ لی میری لاج
تجھ کو روئے گی ریاست، تجھ کو روئے گا سماج
تو نے میری بات مانی، میرے رستے پر چلی

آمرے سینے سے لگ جا، میری اندو لاڈلی

میری بیٹی آ گئی ہے تو تو اب میرے ہی پاس
ایسی خبریں آ رہی ہیں جن سے ہوں بے حد اداس
کون بھارت واسیوں کو جا کے یہ پیغام دے
کس قدر غمگین ہوں، ہیں کون یہ جا کر کہے

میں نے مانا ملک بھر ہے آج غم میں سوگوار
بچے، بوڑھے، نوجواں سب ہو گئے ہیں بیقرار
اس کے یہ معنی نہیں ہو دیش بھر میں قتلِ عام
بے گناہوں سے لیا جائے بلا کا انتقام
اس سے تو بے چین ہو گی اور روحِ اندرا
خاک میں مل جائے گا سب اُس نے جو اب تک کیا

ہائے لگ جائے گا اُس کے نام و شہرت پر کلنک
اُس کی قربانی پہ، عزت اور شہادت پر کلنک
اس نے اپنی جان دی ہے ایکتا کے واسطے
بند کر دو قتل و غارت اب خدا کے واسطے

رفیق ذکریا
ترجمہ: فخرالدین عثمانی
۱۴۹/۲۵ مول گنج ۲ کانپور

اقلیتوں کی ہمدرد

اندرا گاندھی

مہاتما گاندھی کو اس لیے قتل کیا گیا تھا کہ ان کے قاتل کے خیال میں گاندھی جی ہندوؤں کے دشمن تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی کیونکہ مہاتما گاندھی میں ہندو مذہب کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ خلق خدا سے ان کی بلاتفریق محبت گیتا کی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کی اور سرو دھرم سمبھاؤ کو ہندستانی سیکولرزم کی بنیاد بنایا۔

اس کے برخلاف اندرا گاندھی کو سکھ فرقہ کے دو افراد نے قتل کر دیا جن کے دماغوں میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ وہ سکھوں کی دشمن ہیں یہ بات حقیقت سے بعید ہے کیونکہ اندرا گاندھی سکھوں کے بہترین دوستوں میں تھیں، وہ قطعاً نہیں چاہتی تھیں کہ مسلح افواج گولڈن ٹمپل میں داخل ہوں۔ وہ دو برس تک مصالحت کی کوشش کرتی رہیں۔ انھوں نے اکالیوں کے تمام مذہبی مطالبات تسلیم کر لیے۔ انھوں نے سکھوں کو خوش رکھنے کی اتنی کوششیں کیں کہ دوسرے لوگ اس کا کچھ اور ہی مطلب نکالنے لگے۔ لیکن وہ جتنی چھوٹ دیتی رہیں سکھ احیاء پسند اتنا ہی جنگجویانہ رویہ اختیار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ علاحدگی پسندی کی باتیں بھی کرنے لگے اور اس مقصد کے حصول کے لیے غیر ملکوں سے مدد حاصل کرنے لگے۔ چنانچہ اندرا گاندھی کو مجبوراً آپریشن بلیو اسٹار، کا سہارا لینا پڑا تاکہ تشدد اور علاحدگی پسندی کا قلع قمع کیا جا سکے اور اس معاملے میں بیرونی مداخلت ردکی جا سکے۔

جب ہمارے قومی اتحاد اور علاقائی سالمیت کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا تو انھوں نے سختی سے اسے دبا دیا حالانکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ مہاتما گاندھی کی طرح ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ مہاتما گاندھی کو ان کے اپنے ہی ہم مذہب نے ہلاک کر دیا تھا لیکن اندرا گاندھی کو اس فرقہ کے افراد نے گولی ماردی جو ان کی پالیسیوں سے مستفید ہو رہا تھا۔ بائبل میں کہا گیا ہے "اے خدا انھیں معاف کر دے، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

شریمتی گاندھی سکھوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں مثلاً مسلمانوں اور عیسائیوں کی سب سے بڑی بہی خواہ اور محافظ تھیں۔ انھوں نے سیکولرزم کو مستحکم بنانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ مہاتما گاندھی کی طرح وہ بھی ہندو مذہب پر ایمان رکھتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دیگر مذاہب کے پیروؤں سے بھی مساویانہ سلوک کرتی تھیں۔ سیکولرزم ان کے لیے کھوکھلا نعرہ نہ تھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے آئین میں ترمیم بھی کرائی۔ اگرچہ مہاتما گاندھی اور نہرو نے جوش و خروش کے ساتھ اس کا پرچار کیا تاہم یہ اندرا گاندھی ہی تھیں جنھوں نے اسے حقیقت کا جامہ پہنایا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سلسلہ میں انھیں مختلف فرقوں کے اعتراضات کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود وہ اپنے ارادوں پر قائم رہیں۔

آئیے سب سے پہلے ہم سکھوں کے معاملے پر غور کریں جن کی آبادی ہندستان میں دو فیصد سے بھی کم ہے۔ کیا ان پر سکھ دشمنی کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے جبکہ انھوں نے اپنے بیٹے سنجے گاندھی کی ایک سکھ لڑکی سے شادی پر بخوشی آشیرواد دیا تھا۔ انھوں نے وزیراعظم

بنتے ہی ۲۲ مارچ ۱۹۶۶ء کو پنجابی صوبہ کا سکھوں کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ شریمتی گاندھی سکھوں کو ہندستان کا لازمی جز تسلیم کرتی تھیں۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں ان کی قربانیوں کو وہ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ انھوں نے متعدد سکھ اداروں مثلاً مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لیے گرونانک انسٹی ٹیوٹ اور گرونانک سے متعلق ایک میوزیم کے قیام میں مدد دی اور سکھ مذہب و ثقافت کے فروغ کے لیے پنجاب میں متعدد یونیورسٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے سبز انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے پنجاب کے کسانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ پنجاب نے سبز انقلاب کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا ہے۔ اگرچہ یہاں بڑے پراجیکٹوں کا فقدان ہے تاہم ریاست نے صنعتی ترقی کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ ریاست جدید ہندستان کی نمائندگی کرتی ہے۔

وہ دسویں گرو کی بڑی مداح تھیں اور انھیں سیکولرزم کی ایک درخشاں مثال قرار دیتی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا گرو گوبند سنگھ تمام تر سختیاں برداشت کرتے ہوئے خلق خدا سے پیار کرتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف سیاسی استبداد بلکہ مذہبی تنگ نظری ذات پات کی تفریق اور توہم پرستی کے خلاف جد و جہد کی۔ گرو جی نے "مندر مسجد ایک سمان" کی تعلیم دی تھی۔ شریمتی گاندھی گرو جی کی سچی پیرو تھیں۔ انھوں نے بعض اہم قلمدان مثلاً دفاع، خارجی و داخلی امور سکھوں کو دیئے تھے۔ انھوں نے سکھوں کو مسلح افواج کے اعلا ترین عہدوں پر فائز کیا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تک فضائیہ کا سربراہ ایک سکھ تھا۔ کسی بھی عہدے سے، خواہ وہ گورنر اور وزیر اعلا کا عہدہ ہو یا اسپیکر اور سفیر کا انھیں محروم نہیں رکھا گیا۔ ہر میدان میں سکھ ہندوؤں سے آگے ہیں۔ وہ ملک میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہا کرتی تھیں کہ سکھوں کو ہندستان میں اہم مقام حاصل ہے اور وہ ہندستان کی قوت تصور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے سکھوں یا پنجاب کو کمزور کرنے والا کوئی بھی اقدام نہیں کیا جائے گا۔

ہندو سکھ تنازعہ جب اپنے عروج پر تھا اس وقت بھی انھوں نے گیانی ذیل سنگھ کو صدر جمہوریہ کے عہدہ کے لیے منتخب کرایا۔ ان کے محافظ دستہ سے سکھوں کو ہٹانے کی جب بات چلی تو انھوں نے متعلقہ فائل پر لکھا "ہم کیسے سیکولر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟" مہاتما گاندھی نے بھی بم کے دھماکے کے بعد یہی جواب دیا تھا جب حکومت پرارتھنا سبھاؤں میں آنے والوں کی جانچ پڑتال کرنا چاہتی تھی۔ اس کی قیمت انھیں اپنی زندگی سے ادا کرنا پڑی۔ شریمتی گاندھی بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔

مسلمان بھی، جن کی آبادی تقریباً ۱۲ فیصد ہے، انھیں اتنے ہی عزیز تھے۔ ۱۹۵۰ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور اس کے بعد کانگریس پارلیمانی بورڈ میں اپنے انتخاب کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی شکایات پر خصوصی توجہ دینا شروع کی۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۵۹ء میں مسلم لیگ سے بھی مذاکرات کرنے میں انھوں نے اس لیے کوئی پس و پیش نہیں کیا کہ مسلمانوں کو ان کے مستقبل کے متعلق یقین دہانی کرائی جا سکے۔ ۱۹۶۲ء میں جبلپور کے فسادات کے دوران وہ محلہ محلہ جاتی رہیں اور فساد زدگان کو راحت پہنچاتی رہیں۔ چند دنوں کے قیام کے بعد جب وہ دہلی واپس ہو رہی تھیں تو کچھ مسلمانوں نے ان سے التجا کی کہ وہ ابھی نہ جائیں۔ "آپ فکر کیوں کرتے ہیں" انھوں نے جواب دیا "جب بھی آپ مجھے آواز دیں گے میں آپ کے سامنے فوراً حاضر ہو جاؤں گی۔" ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے فوراً بعد جس میں کانگریس کو کچھ ریاستوں میں بری طرح شکست ہوئی تھی یہاں تک کہ کانگریس کے صدر شری کامراج بھی ہار گئے تھے، انھوں نے صدر جمہوریہ کے عہدہ کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تجویز کیا۔ اگرچہ کانگریس ہائی کمان اس سے متفق نہیں تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ذاکر صاحب مسلمان ہونے کی وجہ سے انتخاب ہار سکتے ہیں لیکن شریمتی گاندھی اپنے فیصلہ پر اٹل رہیں اور اسے انھوں نے ہندستانی سیکولرازم کا امتحان تصور کیا۔ بالآخر ڈاکٹر ذاکر حسین انتخاب جیت ہی گئے۔ فرقہ پرست عناصر سیاسی عدم استحکام سے فائدہ اٹھا کر فسادات کرانا چاہتے تھے اور بعض مقامات پر وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی ہو گئے۔ بدترین فسادات احمد آباد میں ہوئے جہاں زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ بدقسمتی سے یہ فسادات اس وقت ہوئے جب سرحدی گاندھی ملک

کی آزادی کے بعد پہلی بار ہندوستان کے دورے پر آئے تھے۔ شریمتی گاندھی کو اس بات کی شرمندگی تھی کہ وہ گاندھی جی کے اس سلطان پیرو کو کیا منھ دکھائیں۔

احمد آباد کے بعد بھیونڈی اور جل گاؤں بھی فسادات کی زد میں آگئے۔ اس موقع پر شریمتی گاندھی نے فرقہ پرستوں کی کھل کر مذمت کی۔ لوک سبھا میں ۱۲ مئی ۱۹۷۰ء کی ان کی تقریر کا حوالہ یہاں بیجا نہ ہوگا کیونکہ کسی ہندوستانی لیڈر کی جانب سے اکثریت کی فرقہ پرستی کی یہ سب سے پر زور مذمت تھی۔

"مسٹر اسپیکر، میں کسی مباحثہ میں سبقت لے جانے کی غرض سے یہ باتیں نہیں کہہ رہی ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، میں نے اس سے قبل کسی بھی معزز ممبر کی تقریر کے دوران مداخلت نہیں کی ہے۔ آج اگر میں مداخلت پر مجبور ہوئی ہوں تو انتہائی دل برداشتہ ہو کر اور احساس ذمہ داری کے جذبہ کے تحت۔ میرا خیال ہے کہ آج شری ۔۔۔۔ نے اس ملک اور اس ملک کی اقلیتوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔"

شریمتی گاندھی نے مزید کہا "یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نازک موقع کو شری ۔۔۔۔ نے خصوصاً مسلمانوں اور عموماً تمام اقلیتوں پر حملہ کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر انھوں نے ہٹلر کے انداز کی تقلید کی ہے۔ اتفاق سے مجھے ایک بار اس کے مشاہدہ کا موقع ملا ہے اور میں جانتی ہوں کہ ہٹلر کس طرح بولتا تھا اور کیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔"

شریمتی گاندھی نے کہا "میں پوچھتی ہوں: کیا کسی چھوٹے بچے نے ایک پتھر پھینکا اور فساد شروع ہو گیا؟ کیا کسی شخص نے کسی کو قتل کر دیا اور فساد شروع ہو گیا؟ یا یہ اس ماحول کا نتیجہ تھا جسے اس قسم کی تقریروں سے زہر آلود کیا گیا جس طرح کی تقریریں ہم یہاں سن رہے ہیں؟ میرے خیال میں یہی ماحول فرقہ وارانہ فسادات کو جنم دیتا ہے۔"

انھوں نے کہا "فرقہ پرستی خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا ہندوؤں کی سکھوں کی ہو یا کسی اور کی ہر حال لائق مذمت ہے ۔۔۔۔ اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں نے مسلم تنظیموں کی جانب سے یا کسی مسلمان کی جانب سے فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کی پر زور الفاظ میں مذمت نہیں کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اکثریتی فرقہ کے کسی فرد کی مذموم حرکتوں کو نظر انداز کر دیں۔"

شریمتی گاندھی نے اقلیتوں کے تئیں اکثریتی فرقہ کی خصوصی ذمہ داری کا ذکر کرتے ہوئے کہا "جہاں کہیں بھی لوگ طاقتور ہیں، ان کی کمزور طبقے کے تئیں ایک ذمہ داری ہے۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر مقامات پر ہندو اکثریت میں ہیں چنانچہ مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کے تئیں ان کی ذمہ داری ہے لیکن اقلیتی فرقے جہاں اکثریت میں ہیں یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ ان کے علاقے کے ہندو جو کم تعداد میں ہیں، محفوظ رہیں۔ اس لیے یہ غلط بیانی کہ ہندو اپنی یہ ذمہ داری نبھانے پر تیار نہیں ہیں، عوام کو بھڑکانے کا محض ایک طریقہ ہے۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے اس ملک کا ماحول زہر آلود ہوا ہے۔"

اس تقریر سے تہلکہ مچ گیا اور فرقہ پرست اخبارات نے ان پر نکتہ چینی شروع کر دی لیکن سی۔ راج گوپال آچاریہ نے جو سوتنترا پارٹی کے بانی کی حیثیت سے ان کے زبردست مخالف تھے، اپنے ہفت روزہ جریدے "سوراجیہ" میں شریمتی گاندھی کے رویہ کی تعریف کی۔

۱۹۷۱ء کے وسط مدتی انتخابات میں، شریمتی گاندھی کی زبردست فتح سے ان کی یہ بات صحیح ثابت ہو گئی کہ ہندوستانی عوام سیکولرزم، مذہبی رواداری اور امن وانسانیت کے دلدادہ ہیں۔ جب بھی ایک چھوٹے سے طبقے نے مذہبی جذبات بھڑکانے کی کوشش کی تو عوام کی اکثریت نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

شریمتی گاندھی کے وزیر اعظم بننے تک کوئی مسلمان وزیر اعلا نہیں بنا تھا۔ مرکز یا ریاست میں وزارت کا عہدہ کسی وفادار ترین مسلمان کے لیے باعث فخر تھا۔ شریمتی گاندھی نے ان حدود کو توڑا۔ راجستھان میں جو کہ جن سنگھ کا گڑھ تھا، شری برکت اللہ کو وزیر اعلا بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ذات پات کی تفریق میں بری طرح جکڑی ہوئی ریاست بہار میں شری عبدالغفور کو وزیر اعلا مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کے انتخابات کے بعد انھوں نے مہاراشٹر میں جہاں اورنگ زیب اور شیواجی مہاراج کی جنگوں کی یاد اب بھی عوام کے ذہنوں میں تازہ ہے شری عبدالرحمٰن انتولے کو وزیر اعلا بنایا ۔۔ اسی طرح فرقہ وارانہ منافرت کی شکار ریاست آسام میں ایک مسلم خاتون ۔۔۔ انورہ تیمور کو وزیر

اعلا بنا یا گیا۔

ادریس حسن لطیف کو ہندستانی فضائیہ کا سربراہ بنانے میں وہ قطعاً ہچکچائیں نہیں۔اسی طرح مسلمانوں کو دوسرے شعبوں میں بھی اعلا عہدوں پر فائز کیا گیا۔ دو مسلمانوں ...... جسٹس ہدایت اللہ اور جسٹس ایم۔ ایچ۔ بیگ کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ شاید ہی کوئی زمرہ ایسا ہو جس میں با صلاحیت مسلمانوں کو مساوی مواقع فراہم نہ کیے گئے ہوں

اس کے باوجود شریمتی گاندھی مرکز اور ریاستی حکومتوں کے مختلف محکموں میں مسلمانوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد سے فکرمند تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دینے کے لیے متعدد موقعوں پر ہدایات جاری کیں لیکن انھیں صحیح طریقے سے نافذ نہیں کیا گیا۔ انھوں نے تاجروں اور صنعتکاروں سے بھی کہا کہ وہ اپنے اداروں میں مناسب تعداد میں مسلمانوں کو بھرتی کریں لیکن کچھ ہی لوگوں نے اس پر عملدرآمد کیا۔

ہندو۔مسلم تعلقات کا ایک بدبختانہ پہلو ہند۔پاک تعلقات میں اتار چڑھاؤ سے متعلق ہے۔ چنانچہ شریمتی گاندھی پاکستان کے تئیں اپنے ردعمل میں ہمیشہ محتاط رہیں۔ سرحد پار ہونے والی اشتعال انگیز حرکتوں پر وہ کبھی برہم نہیں ہوئیں پاکستانی حکمرانوں نے ان کے اس محتاط رویہ کو ہندستان کی کمزوری سے تعبیر کیا۔ بھٹو نے ایک بار کہا بھی تھا کہ نہرو کے بعد ہندستان کو پاکستان کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ بھٹو، ۱۹۶۵ء کی جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور معاہدہ تاشقند کے مخالف تھے۔ وہ اس بات پر صدق دل سے یقین رکھتے تھے کہ پاکستان جنگ میں ہندستان کو شکست دے سکتا ہے اور کشمیر پر قابض ہو سکتا ہے۔ جبکہ شریمتی گاندھی کے لیے معاہدۂ تاشقند امن کا ایک عہد تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ "ہندستان اور پاکستان کا مفاد تعاون میں ہے۔ ہم میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہمارا کام عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے۔ نااتفاقی ہم دونوں کو کمزور رکھے گی اور ترقی کی راہ مسدود کر دیگی ہم دوستی کر کے ہی خوشحال ہو سکتے ہیں۔

کاش پاکستانی حکمرانوں نے اس نظریہ کو سراہا ہوتا تو بنگلہ دیش میں قتل عام نہ ہوتا اور ایک کروڑ لوگوں کو ہجرت کر کے ہندوستان نہ آنا پڑتا۔ شریمتی گاندھی ۹ ماہ سے زائد عرصہ تک انتہائی صبر و تحمل سے کام لیتی رہیں۔ اگر کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو طیش میں آکر پہلے ہی پاکستان پر حملہ کر چکا ہوتا۔ بنگلہ دیش کے بحران کے دوران، جب لاکھوں ہندو مشرقی پاکستان سے نکالے جا رہے تھے انھیں ہندستانی مسلمانوں کی فکر لاحق رہی کیونکہ یہاں صورتحال تشویشناک ہو سکتی تھی۔

امریکہ کے دورے میں ۵ر نومبر ۱۹۷۱ء کو نیشنل پریس کلب، واشنگٹن میں ان سے اس سلسلہ میں سوالات پوچھے گئے کہ اگر پاکستان اپنے یہاں سے بچے کھچے ہندوؤں کو بھی نکال دیتا ہے تو ہندستانی مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مسلمان بالکل محفوظ رہیں گے، اگرچہ ہندستان میں فرقہ وارانہ منافرت کا جذبہ رکھنے والے کچھ لوگ موجود ہیں، اور اکثر فسادات بھی ہوتے رہتے ہیں جن پر مجھے شرمندگی ہے۔

لیکن حکومت مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبھی ہندستانی اور وہ پارٹیاں بھی جو ہم سے دیگر معاملات میں اتفاق نہیں رکھتیں، اس معاملے میں ہم رائے ہیں کہ ملک میں امن و امان برقرار رہنا چاہیئے اور اقلیتوں کو وہ سبھی حقوق اور مراعات حاصل ہونا چاہیئیں جن کا آئین میں ذکر کیا گیا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت انھوں نے اپنی کابینہ کی جانب سے پُرزور مخالفت کے باوجود مغربی پاکستان کے محاذ پر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔

شریمتی گاندھی نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس موقع پر فرقہ وارانہ امن و ہم آہنگی برقرار رہے۔ دراصل پاکستان کے ٹوٹ جانے سے دو قومی نظریہ کو زبردست دھچکا لگا تھا جس کے سبب چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے دو فرقوں کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے تھے۔ چنانچہ ۳ر جولائی ۱۹۷۲ء کو تاریخی شملہ معاہدہ کی شکل میں اس کا نتیجہ سامنے آیا۔

ابھی حال ہی میں جنرل ضیاء الحق کے امریکی اسلحہ کا ذخیرہ کرنے پر ہند۔پاک تعلقات میں کچھ کشیدگی آئی لیکن شریمتی گاندھی اس بات کی پوری کوشش کرتی رہیں کہ صف آرائی کی نوبت نہ آنے پائے چند سال قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سوال پر فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کو ورغلانے کی کوشش کی لیکن شریمتی گاندھی نے اس کا اقلیتی کردار بحال کر کے فرقہ پرستوں کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ انھوں نے ۱۴ ویں صدی ہجری تقریبات میں شرکت کی اور نئی دہلی میں ہند اسلامی مرکز قائم کرنے میں اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ شری ہدایت اللہ کی مدد کی۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں شریمتی گاندھی اور غیر منقسم کانگریس کی شکست میں مسلمانوں کا کیا رول رہا یہ کہنا مشکل ہے، اگرچہ یہ حقیقت

ہے کہ جبری نسبندی پروگرام اور زیادتی سے تنگ آکر ملک کے بعض حصوں خصوصاً شمالی ہند میں مسلم رائے دہندگان کی ایک بڑی تعداد کانگریس سے بدظن ہو گئی تھی۔ اس طرح کے ماحول کو آچاریہ، امیر جماعت اسلامی کے اشتراک اور دہلی کے شاہی امام کے رویے سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن جلد ہی مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا کہ شریمتی گاندھی سے بہتر دوست انھیں نہیں مل سکتا۔ اس کے بعد آندھرا اور مہاراشٹر کے اسمبلی انتخابات اور متعدد ضمنی انتخابات میں انھوں نے کانگریس کو زبردست اکثریت سے کامیاب بنایا۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء کے لوک سبھا انتخابات میں 'جنتا پارٹی' کی حکومت کی کارکردگی سے بدظن ہو کر انھوں نے کانگریس (ا) کی بھرپور حمایت کی۔

گذشتہ تین برسوں کے دوران فرقہ وارانہ فسادات نے بلا شبہ مسلمانوں کو برہم کر دیا ہے اور ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا ہے جزب مخالف نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مسز اندرا گاندھی پر ہندو فرقہ پرستی کو شہہ دینے کا الزام عائد کیا۔ اگرچہ یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ اگر کانگریس (ا) نے متعدد مقامات پر بھارتیہ جنتا پارٹی سے نشستیں چھینی ہیں تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ووٹروں کا شریمتی گاندھی کے تئیں اعتماد بڑھا تھا۔

عیسائی بھی جن کی تعداد سکھوں سے بھی کم ہے ہندستانی سماج کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے تعلیمی اداروں کے اعلا معیار کے باعث جن کا انتظام زیادہ تر مشنریوں کے ہاتھوں میں ہے، وہ سرکاری اور بھی زیادہ دونوں جگہ اعلا عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر پی۔ سی الگزینڈر شریمتی اندرا گاندھی کے پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ شری اے۔ کے انٹونی کیرالا کے کامیاب وزیر اعلا رہے ہیں۔

دیگر اقلیتوں مثلاً بدھ لوگوں اور پارسیوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے لیکن شریمتی گاندھی نے ان کے مسائل کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انھیں اپنے تناسب سے بھی زیادہ نمائندگی حاصل ہے۔ سائنس کے میدان میں مسٹر ہومی بھابھا کے تعاون اور ملک کو صنعت کے میدان میں آگے بڑھانے کی شری جے۔ آر۔ ڈی ٹاٹا کی کوششوں کو شریمتی گاندھی بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ ہندستانی ثقافت کو مالا مال کرنے میں لا مادس کے رول کی بھی وہ بہت تعریف کرتی تھیں۔

درج فہرست ہندو ذاتوں کے مذہب تبدیل کر کے بدھ مذہب اختیار کر لینے والوں کے مسائل میں بھی انھوں نے ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ شریمتی گاندھی نے ملک کی اقلیتوں کے مفاد میں اتنا کام کیا ہے کہ دنیا کے چند ہی لیڈروں نے کیا ہوگا۔ اشوک اور اکبر ان کے آدرش تھے کیونکہ وہ دونوں ہی طاقت اور فتح کی علامت ہوتے ہوئے بھی مذہبی رواداری اور دانشمندی کے دلدادہ تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شریمتی گاندھی کی حکومت مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کی بہترین مثال قائم کر گئی۔

" دنیا عہدِ حاضر کے ایک عظیم رہنما سے محروم ہو گئی ہے "

کوئین الیزبیتھ
ملکۂ برطانیہ

" .... میری حکومت مسز گاندھی کی قیادت کی مداح تھی "

ناکاسونے
وزیر اعظم جاپان

معراج مہدی
مفتی گنج لکھنؤ

اقلیتوں کے لیے
اندرا جی کے پندرہ نکات

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس ملک کو مضبوط، مستحکم اور طاقتور بنانے نیز اسے ہمہ جہت ترقی اور خوشحالی کے راستے پر تیز رفتاری سے آگے بڑھانے کے لیے جو اقدامات کیے اور جس طرح مسلسل کام کرتی رہیں، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ زبردست مخالفتوں اور مخاصمتوں کے باوجود وہ اپنے راستے پر ہمیشہ اٹل رہیں۔ ان کے مخالفین اصولی اور نظریاتی اختلاف تک محدود نہیں رہے۔ اصولی و نظریاتی لڑائی سے آگے جا کر ان کی ذات پر بدترین قسم کے حملے کیے گئے، ذاتیات کو نشانہ بنایا گیا۔ انھیں اقلیتوں اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیا گیا۔ جبکہ ان کا پورا خاندان جذباتی ہم آہنگی، قومی یک جہتی اور ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا ہمیشہ علمبردار رہا۔ اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ان کا پورا خاندان نمایاں طور پر ہمیشہ سرگرم عمل رہا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اقلیتوں اور مسلمانوں کی تہذیب، ان کی زبان، ان کے تعلیمی و مذہبی اداروں کے مکمل تحفظ، ان کے لیے مساوی طور پر مواقع فراہم کرنے، ان کی فلاح اور ہمہ جہت ترقی پر ہمیشہ توجہ رکھی۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پندرہ نکاتی پروگرام بھی وضع کیا تھا، جس پر تیز رفتار عمل درآمد کے لیے تمام ریاستوں کو ہدایات بھی جاری کی گئی تھیں۔

اندرا جی کے اس پندرہ نکاتی پروگرام میں فرقہ وارانہ فسادات سے اقلیتوں کو محفوظ رکھنے، پولیس میں اقلیتوں کی بھرتی، ریلوے، قومیائے ہوئے بینکوں اور سرکاری اداروں میں انھیں ملازمتیں فراہم کرنے، مقابلے کے امتحانات کے لیے انھیں خاص طور سے تیار کرنے، انھیں تکنیکی مہارت بہم پہنچانے، ترقیاتی پروگراموں سے انھیں بھی مستفید کرنے، وقف املاک اور قبرستان سے متعلق شکایات اور ان کے شبہات دور کرنے کی غرض سے موثر بندوبست کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ان کا یہ پروگرام حسب ذیل ہے:

(۱) ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ ایسے علاقوں میں جنھیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے حساس اور فساد زدہ مانا گیا ہے، ضلع اور پولیس نظم و نسق کے ایسے افسران کی تقرری کی جائے جو کارکردگی، غیر جانبداری اور سیکولر رویوں کے سلسلے میں شہرت رکھتے ہوں۔ ایسے علاقوں اور دوسری کسی بھی جگہ ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کا یہ اولین فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ فرقہ وارانہ تناؤ کی روک

قائم کریں اور اس سلسلے میں ان کے عملی اقدامات کو ان کی ترقی پر غور کرتے وقت خصوصی اہمیت دی جائے۔

(۲) اس سلسلہ میں بہترین کارکردگی پر ضلع و پولیس ملازمین کو انعامات دیے جائیں۔

(۳) فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے یا تشدد کے مرتکب افراد کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔

(۴) فرقہ وارانہ جرائم کے معاملات پر غور کرنے کے لیے خصوصی عدالتیں یا اس کے لیے خاص طور سے علاحدہ عدالتیں قائم کی جائیں تاکہ مجرموں کو جلد سے جلد سزا دی جاسکے۔

(۵) فرقہ وارانہ فسادات کے شکار افراد کی بلاتاخیر امداد کی جائے اور انھیں پھر سے بسانے کے لیے فی الفور کافی مالی امداد دی جائے۔

(۶) فساد زدہ علاقوں میں اعتماد، فرقہ وارانہ خیرسگالی اور امن بحال کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذرائع کی امداد بھی ضرور حاصل کی جائے۔

(۷) یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ کچھ اخبارات اور رسائل کبھی کبھی قابل اعتراض اور اشتعال انگیز مواد شائع کر دیتے ہیں جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نیز دوسرے متعلقہ افراد اس طرح کا مواد شائع نہ کر کے اس سلسلے میں تعاون دیں گے۔

(۸) ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ پولیس ملازمین کی بھرتی میں اقلیتوں کا خاص طور سے خیال رکھیں۔ اس مقصد کے تحت نمائندہ سلیکشن کمیٹیوں کی تشکیل کی جائے۔

(۹) مرکزی پولیس فورس کی بھرتی میں مرکزی حکومت کو بھی اسی طرح کی کارروائی کرنا چاہیے۔

(۱۰) ریلوے، قومیائے ہوئے بینکوں اور سرکاری اداروں میں روزگار کے مواقع بہت بڑی تعداد میں دستیاب ہیں۔ ان اداروں میں بھی متعلقہ محکموں کو اس کا یقینی بندوبست کرنا چاہیے جس کے تحت اقلیتی فرقے کے افراد کی بھرتی کرنے پر خصوصی توجہ دی جائے۔

(۱۱) بہت سے علاقوں میں مقابلہ کے امتحانات کے ذریعہ بھرتی کی جاتی ہے۔ زیادہ تر اقلیتی فرقے تعلیمی پس ماندگی کے سبب ایسے امتحانات میں مساوی شرائط کی بنیاد پر مقابلہ میں پیچھے رہے ہیں۔ ان کی ان خامیوں کو دور کرنے میں مدد کی غرض سے اقلیتی تعلیمی اداروں کی توسیع کے لیے اقدامات کیے جائیں تاکہ وہ ان کی تربیت کے لیے کوچنگ درجات شروع کریں جس سے وہ ان امتحانات میں کامیابی کے ساتھ مساوی شرائط پر مقابلہ کر سکیں۔

(۱۲) اقلیتی فرقوں کے وہ افراد جو آج پسماندہ ہیں تکنیکی مہارت حاصل کر لینے سے ملک کی ترقی میں بھی معاون ثابت ہوں گے۔ اقلیتوں کی کثرت والے علاقوں میں سرکاری یا غیر سرکاری مشینی آلات کے ذریعہ صنعتی تربیتی ادارے (آئی۔ ٹی۔ آئی) اور کثیر المقاصد ادارے (پالی ٹیکنک) قائم کیے جانے کا بندوبست کیا جائے اور ایسے اداروں میں کافی تعداد میں داخلہ لینے کے لیے ان فرقوں کے افراد کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۱۳) اس بات پر توجہ دی جائے کہ مختلف ترقیاتی پروگراموں کا جن میں بیس نکاتی پروگرام بھی شامل ہے۔ فائدہ اقلیتوں کو غیر جانبداری سے اور خاطر خواہ طور پر حاصل ہو۔ ان پروگراموں کی عمل آوری کے سروے کے لیے تشکیل دی گئی مختلف کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے افراد کو عملی طور پر شامل کیا جائے۔

(۱۴) ان عمومی موضوعات کے علاوہ جن کا میں نے ذکر کیا ہو ایسے متعدد مقامی مسائل ہیں جن کی وجہ سے اقلیتوں میں غیر ضروری طور پر بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وقف کی جائداد اور قبرستان کے معاملہ پر کچھ مقامات پر اختلاف ظاہر کیا گیا ہے اور شکایات پیدا ہوئی ہیں۔ ایسے مسائل کو جلد اور اطمینان بخش

(باقی ص۸۳ پر)

ترجمہ:- عبداللطیف

مسز اندرا گاندھی اور سکھ
یادوں کے آئینے میں

کاما گاتا مارو، جلیان والا باغ، لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ پنجاب کے ایسے نام ہیں جنھیں ہندوستانی تاریخ میں زریں حروف میں لکھا جائے گا۔ ہندوستان کی غلامی کی بیڑیاں کاٹنے اور اس کی آزادی کا تحفظ کرنے میں پنجاب کا رول کسی سے کم نہیں رہا ہے اور زراعت کے شعبہ میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ سبز انقلاب کی بھرپور اور واضح تصویر پنجاب میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کسی بڑے پراجکٹ کے نہ ہوتے ہوئے بھی صنعت کے میدان میں پنجاب نے کافی ترقی کی ہے جسے پورا ملک تسلیم کرتا ہے اپنے والد پنڈت نہرو کے دور میں پنجاب میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کو شریمتی گاندھی نے آگے بڑھایا اور اس کی ہر الجھن سلجھانے کے لئے عمر بھر کوشاں رہیں۔

۱۹۶۶ء میں گرو گوبند سنگھ کی صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب میں شریمتی گاندھی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گرو گوبند سنگھ فاؤنڈیشن کے قیام میں بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۶ کو سکھوں کے ایک جلسہ میں کہا تھا "یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہندوستان نے گرو نانک جیسے عظیم شخص کو جنم دیا۔ اس عظیم انسان نے ہمیں اس وقت مذہبی رواداری اور اتحاد کا درس دیا تھا جب ہمارے سماج میں ذات پات مذہب اور فرقہ کے نام پر لوگوں میں منافرت کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ گرو نانک جی نے اس وقت کہا تھا کہ "نہ تو کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان"۔ ان کے یہ انقلابی الفاظ ہم میں سے کسی کو فراموش نہ کرنا چاہئیں بلکہ شریمتی گاندھی نے گرو نانک اور گوتم بدھ کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا دونوں نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ انسانیت سچا مذہب ہے۔"

۲۵ لاکھ چندہ دیا

جب سکھوں نے گرو نانک کی پانچویں صد سالہ یوم پیدائش تقریب منانے کا فیصلہ کیا تو شریمتی گاندھی نے اس کی مرکزی کمیٹی کی صدارت کا عہدہ قبول کر لیا۔ حکومت سے بھرپور تعاون حاصل کر کے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے بین الاقوامی پیمانہ پر اس کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی۔ اندرا جی کی پیش قدمی پر ہی گرو نانک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے گرو نانک سنستھان قائم کرنے کے لیئے حکومت ہند نے ۲۵ لاکھ روپیہ چندہ دیا تھا۔

گرو کی تعلیم کی بدولت

نئی دہلی میں منعقدہ گرو تیغ بہادر کی ۳۰۰ ویں یوم پیدائش تقریب میں سکھوں سے خطاب کرتے ہوئے شریمتی گاندھی نے کہا تھا کہ سکھ فرقہ بہت ہی بہادر ہے اور ہندوستان کو مضبوط بنانے میں اس نے سخت محنت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرقہ نے دنیا میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ سب گرو نانک کی تعلیمات کی بدولت ہی ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ موجودہ مسائل حل کرنے میں عوام گرو جی کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل

کریں۔

شریمتی گاندھی کا کہنا تھا کہ گرو تیغ بہادر نے سکھ فرقہ کے لیے زبردست قربانی دی لیکن وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف تھے گرو تیغ بہادر نے یہ محسوس کیا کہ میری قربانی آئندہ نسلوں کے لیے منفعت بخش ثابت ہوگی۔ شریمتی گاندھی نے ۵۰۰ کشمیری شہریوں کی آنندپور میں گرو تیغ بہادر سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے بزرگوں کو بھی پنجاب سے بڑا لگاؤ تھا۔ سکھوں کے ایک اور بڑے جلسہ میں شریمتی گاندھی نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ حالانکہ ہندوستان کے لوگوں کو گرو تیغ بہادر کی قربانی کی کہانی زبانی یاد ہے لیکن اسے نوجوانوں کو سنایا جانا چاہیے۔ اندرا جی نے اپنی تقریر کے آخر میں "جب "بولے سو نہال" کہا تو اس کے جواب میں موجود جلسہ عام نے "ست سری اکال" کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا تھا۔

گرو تیغ بہادر کی قربانی

دگیان بھون، نئی دہلی میں سکھوں کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں گرو تیغ بہادر کا یوم شہادت منایا جا رہا تھا۔ اس جلسہ میں شریمتی گاندھی نے سکھوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہماری کوشش محض قدیم روایات کو برقرار رکھنا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ موجودہ حالات میں بھی اسے نئے معنی پہنا کر ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ گرو تیغ بہادر کی قربانی نے ہمیں سچائی، تعاون اور دور اندیشی کی تعلیم دی ہے جسے قومی دھارے میں مسلسل شامل رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا تھا کہ گرو تیغ بہادر اورنگ زیب کے برتاؤ سے فکرمند نہیں تھے لیکن اس کا مناسب جواب کیا دیں اس بات سے وہ کافی بےچین تھے اور اس بادشاہ کو انھوں نے سب سے زیادہ مناسب جواب اپنی قربانی دے کر دیا۔

جلیان والا باغ سانحہ

۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ کو چنڈی گڑھ میں کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شریمتی گاندھی نے پنجاب کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ پنجاب محض پانچ ندیوں کی ریاست نہیں ہے بلکہ یہ مذہبی رہنماؤں، مجاہدین آزادی اور سورماؤں کا مسکن ہے۔ دراصل پنجاب ہمت اور بہادری کا دوسرا نام ہے۔ ۱۹۲۹ میں پنجاب میں ہی راوی ندی کے ساحل پر انڈین نیشنل کانگریس نے ملک کو آزاد کرانے کا عہد کیا تھا اور جلیان والا باغ سانحہ نے تو جد و جہد آزادی کو ایک موڑ دے دیا تھا۔

نہرو خاندان کی وابستگی

اپنے سیکولر نظریہ کے باعث نہرو خاندان اقلیتوں اور کمزور طبقہ کا حامی رہا ہے۔ اسی خاندان کی ایک ہونہار خاتون شریمتی اندرا گاندھی ملک کی اسکیموں اور پالیسیوں کے تعین میں کمزور طبقہ کا معیار زندگی بلند کرنے سے متعلق پروگراموں کو اہمیت دینے پر زور دیتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ آزادی سے قبل بھی پنڈت نہرو نے اکالی دل کے ایک نمائندے بلدیو سنگھ کو عبوری وزارت میں جگہ دی تھی بعد میں بلدیو سنگھ، سرجیت سنگھ مجیٹھیا، سورن سنگھ، حکم سنگھ اور گردیال سنگھ کو مرکزی وزارت میں اہم عہدے دیے گئے۔ دو بار سکھوں کو لوک سبھا کا اسپیکر بنایا گیا۔ سکھ فرقہ کو سب سے زیادہ خوشی ۱۴ جنوری ۱۹۸۰ کو اس وقت ہوئی جب شریمتی گاندھی نے اپنی وزارت میں شری ذیل سنگھ کو وزارت داخلہ کی کرسی پر بٹھایا۔ گیانی جی جو ممتاز مجاہد آزادی رہے تھے، انھوں نے جنگ آزادی کے دنوں میں کافی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ نہرو خاندان سے شری ذیل سنگھ کے کافی قریبی تعلقات تھے جس کے نتیجہ میں انھیں ۲۵ جولائی ۱۹۸۲ کو صدر جمہوریہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سکھ فرقہ سے نہرو خاندان کے لگاؤ کا یہ نکتہ عروج مانا جاسکتا ہے۔

پنجاب کمزور نہیں ہے

۱۹۸۱ میں نیویارک کے رچمنڈ ہلس میں منعقدہ سکھوں کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اندرا جی نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں سکھوں کو نمایاں مقام حاصل ہے اور انھیں ملک کی ایک بڑی طاقت سمجھا جاتا ہے۔ اس فرقہ کو یا پنجاب کو قطعی کمزور نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس جلسہ میں شریمتی گاندھی شلوار قمیص پہن کر پہنچی تھیں اور گرودوارہ میں گرو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا تھا۔ ان کے بیٹے شری راجیو گاندھی نے بھی مقدس کتاب کے سامنے ماتھا ٹیکا

تھا۔ اس دن وہاں اندراجی کا استقبال بڑے سونہال ست شری اکال کے نعرے سے کیا گیا تھا۔ اسی جلسہ میں شمالی امریکہ کی سکھ کونسل کے سربراہ نے سکھ مذہب سے شریمتی گاندھی کے لگاؤ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ سکھوں کا مسئلہ محض اندراجی ہی حل کر سکتی ہیں۔

مسئلہ سلجھانے کی کوشش نیویارک کے اس جلسہ میں شریمتی گاندھی نے کہا تھا کہ پیسہ کی کمی کے باعث ہندستان کی متعدد ریاستیں مالی مسائل کی شکار ہیں۔ جہاں تک پنجاب کا سوال ہے وہ دوسری سبھی ریاستوں سے زیادہ خوشحال ہے اور اس کا سہرا سکھوں کے سر ہے جنھوں نے خون پسینہ ایک کر کے ریاست کو سنوارا ہے۔

غیر ملکوں میں رہنے والے سکھوں کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ ہم ان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب ہندوستان مضبوط رہے گا۔ اس لیے میری اپیل ہے کہ ہندوستان اور غیر ممالک میں رہنے والے سکھوں کے درمیان ایک دوسرے کو مدد پہنچانے والا پل بنایا جائے تاکہ دونوں طاقتور بنیں۔ جلسہ میں شری راجیو گاندھی نے بھی تقریر کی تھی اور ان کا استقبال "واہے گرو جی کا خالصہ واہے گرو جی کی فتح" کے ساتھ ہوا تھا۔ (۱۰ اپریل ۸۴، کان پور سے ماخوذ)

●●● ———

کس قدر بے باک روح اس ناتواں پیکر میں تھی : (صفحہ ۷۰ کا بقیہ)

سے نمایاں ترقی کی۔ زراعت کا میدان ہو یا صنعت کا، سائنس کا شعبہ ہو یا ٹیکنالاجی کا، ماحولیاتی و خلائی زمرہ ہو یا ہم جوئی کا، سماجی و معاشی ترقی کی جد و جہد ہو یا کوئی اور ترقیاتی پروگرام، اندراجی کے نقوش ہر جگہ موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں ماحولیات، خلا اور متبادل توانائی کے محکمے انھیں کی دین ہیں۔ ہندستان کی ایٹمی اور خلائی ترقی، اینٹارکٹکا (قطب جنوبی کے خطہ) میں یکے بعد دیگرے تین ٹیموں کی کامیاب مہم جوئی اور وہاں ایک مستقل سائنسی مرکز کا قیام، ایک سوویت خلائی جہاز میں اولین ہندستانی خلاباز کا ایک ہفتہ کا سفر، مصنوعی سیاروں "آریہ بھٹ"، "بھاسکر" اور انسیٹ سلسلہ کے سیاروں کا خلا میں چھوڑا جانا اور ان کے توسط سے دوردرشن پروگراموں کا ملک کے گوشے گوشے میں پہنچنا اور ملک کے طول و عرض میں بکثرت ٹیلی ویژن مرکزوں کا قیام، یہ سارے کام اندراجی کے ہی مرہون منت ہیں۔

ان کے یہ عظیم کارنامے تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے اور پوری قوم ان کی ممنون رہے گی۔ ان کی مضبوط قوت ارادی اور ناقابل تسخیر عزم و حوصلہ اور دلیرانہ کارناموں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ

ع کس قدر ... بےکراں تھی

●●● ———

ڈاکٹر قمر رئیس
سی ۱۶۶ دیپک وہار
دہلی ۱۱۰۰۳۲

گولیاں کس کو لگیں
کس کا بدن چیر گئیں
کس کے آغوش سے نکلیں
یہ لہو کی دھاریں
کس کے سینے میں اٹھیں
درد کی لاکھوں ٹیسیں

کوئی وادی ہے۔ گلستاں ہے کہ صحرا ہے کوئی ؟
کوئی ساگر ہے۔ ہمالہ ہے کہ گنگا ہے کوئی ؟
کوئی انسان ہے، دیوی ہے۔ کرشمہ ہے کوئی ؟
اس کی پہچان ہے کیا ؟
اس کی پہچان ہے کیا ؟

اس کی آنکھوں میں تھا، کشمیر کی جھیلوں کا سماں
سحر مینا کشی تھا، قامتِ زیبا میں نہاں
روح میں اس کی، حسیں خواب تھے نہرو کے جواں
شکلیں اس کو ہر اک سمت سے یوں گھیرے تھیں
بجلیاں جیسے تڑپتی ہوں سرِ کوہِ گراں
بھوک، بے رحمی تشدد کی ہوائیں تھیں جہاں
قلب بھی اس کا اسی جا تھا، نظر بھی تھی وہاں

کھلے ہر رخ پہ اخوت کی دھنک۔ اس نے کہا
اس نے چاہا تھا کہ ہر گھر میں اُگے کاہکشاں
ایک بھی بوند لہو کی نہ گرے دھرتی پر
اس کا اک خواب تھا۔ عالم میں رہے امن و اماں
گولیاں کس کو لگیں
کس کا بدن چیر گئیں
کس کے آغوش سے نکلیں
یہ لہو کی دھاریں
کس کے سینے میں اٹھیں
درد کی لاکھوں ٹیسیں ؟

وہ جو گنگا بھی، ہمالہ بھی تھی انسان بھی تھی
اس کا یہ روپ بھی تھا اس کی یہ پہچان بھی تھی

ایم کوٹھیاوی راہی
قاضی پور خورد — گورکھپور

(منظوم فیچر)

یہ کیا کر رہے ہو؟

پہلی آواز

وہ جملہ
وہ چھوٹا سا جملہ
فضاؤں میں گونجا کرے گا ہمیشہ
مؤرخ
ہر اک عہد کا
ہر قلم کار
شاعر
کوی
اپنی رچناؤں
نظموں
فسانوں میں
تاریخ میں
سرخیوں کے بجائے
لہو کی سیاہی سے
لکھتا رہے گا
" ابھی تک کوئی واقعہ اس طرح کا
ہوا ہے کہیں؟ "
" نہیں!
ہاں نہیں!!
کہیں بھی نہیں!! "
کوئی ماں
کوئی ممتاز خاتون رہبر
کسی سرپھرے

درندہ صفت
مرد کے ہاتھوں
چھلنی نہیں کی گئی گولیوں سے
جری
حوصلہ مند
مردوں کے
سر جھک گئے ہیں
بڑھے جا رہے تھے
ہواؤں کے مانند
جو نقرئی منزلوں کی طرف
سرمئی قافلے
رک گئے ہیں

وہ قاتل
وہ سفاک قاتل
وہ جبر و تشدد کے عفریت
ماضی کی کہنہ سیاست کے پروردہ
سرمایہ داروں کے راتب پہ پلتے ہوئے سگ
جو گھس آئے ہیں
شب کی تاریکیوں کی بدولت
اجالوں کی دھرتی پہ
شہر تا شہر
قریہ بہ قریہ

عام لوگوں کا بہروپ بھر کر
جو پھیلے ہوئے ہیں یہاں سے وہاں تک
انھیں میں سے تھا کوئی وہ بھی
کوئی بھی ہو
قاتل تھا —— قاتل
وہ کم ظرف قاتل
وہ بے ظرف قاتل
وہ بزدل
وہ اک مردِ بزدل

لرزا اٹھا آکاش
کانپ اٹھی دھرتی
تڑپ اٹھے پربت
چھلک اٹھیں ندیاں
اُبل اٹھے چشمے
بلکنے لگے آبشار و سمندر
مگر گرتے گرتے
مگر جاتے جاتے
بھروسہ تھا کیسا
وہ جذبہ تھا کیسا
جو اس آخری جملے میں ڈھل گیا ہے
(کہ جسم و جاں سے جدا کر رہے ہو)
"یہ کیا کر رہے ہو ——!"

دوسری آواز

کیا خبر یہ سنی لی یارو!
ایک ہستی چلی گئی یارو
مادرِ قوم ہو چکی ہے امر
مت کہو قتل کی گئی یارو
چشمِ صحرا بھی ہو گئی نمناک
جانے کیا چیز پی گئی یارو
مندروں مسجدوں کی دنیا میں
کیسے جرأت یہ کی گئی یارو!

تیسری آواز

لہلہاتے کھیت، ہنستے پیڑ، پربت، آبشار
زندگی لے زندگی! گاتی رہے تیری بہار!
آ نہ پائے ایسی دلکش رُت میں ماضی کی خزاں
مٹ نہ پائے رنگِ پیکر، تیرے عارض کا نکھار
تیرا شاعر تیری ہستی پر ہو قرباں ایک دن
آ گئی ہے آج لب پر یہ دعا بے اختیار!
جس کی لَے میں دھن تری تحلیل ہو کر رہ گئی
آنکھ اپنی آنسوؤں کی جھیل ہو کر رہ گئی!

چوتھی آواز

کھل گیا بابِ الم، ماتم منانا چاہیئے
رو پڑے سب اہلِ غم ماتم منانا چاہیئے
کوئی کہتا ہے کہ اب پینا پلانا ہو فضول
گر پڑا وہ جامِ جم ماتم منانا چاہیئے
جانے کیسی صنم خانوں میں ظلمت چھا گئی
بجھ گئی شمعِ حرم ماتم منانا چاہیئے
لیکن اک آواز آتی ہے کہیں سے بار بار
وقت پڑنے پر نہیں ہوتے عزیز و اشکبار!

پانچویں آواز

نہ آپس میں لڑنا، تشدد سے بچنا
سدا ایک رہنا، تشدد سے بچنا
یہ مسجد بھی میری، یہ مندر بھی میرا
وہ پتھر بھی میرا، گلِ تر بھی میرا
یہ دنیا بھی میری، وہ دنیا بھی میری
وہ مریم بھی میری، یہ سیتا بھی میری

یہ گیتا بھی میری، وہ قرآں بھی میرا
یہ ہندو بھی میرا، مسلماں بھی میرا
یہ تم بھی سمجھنا، تشدد سے بچنا!
سدا ایک رہنا، تشدد سے بچنا!
مرے خواب تم، میری تعبیر تم ہو!
نئے آفتابوں کی تنویر تم ہو

زمانہ نہیں کچھ، زمانہ ہے تم سے
کہ دشمن سدا ہار مانا ہے تم سے
یہاں بھی تمہیں ہو، وہاں بھی تمہیں ہو
زمیں بھی تمہیں، آسماں بھی تمہیں ہو
مگر دھیان رکھنا — تشدد سے بچنا!
سدا ایک رہنا — تشدد سے بچنا!

"مسز گاندھی ہندوستانی عوام کی ایک محبوب رہنما تھیں۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی تعلقات میں سدھار لانے کے سوال پر قابل تحسین کردار ادا کیا۔ دونوں ممالک کے درمیان خوشگوار تعلقات کی بحالی کے لیے انھوں نے جو بیش قیمت اور فیصلہ کن خدمات انجام دی ہیں، دونوں ممالک کے عوام ان سے قیام امن و استحکام کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔"

ضیاء الحق
صدر پاکستان

اقلیتوں کے لیے اندرا جی کے ۱۵ نکات :- (صفحہ ۱۷ کا بقیہ)

طور سے نپٹانے کے لیے مناسب اقدامات کیے جانا چاہئیں۔
اقلیتوں سے متعلق مسائل پر مسلسل توجہ کی ضرورت ہے، تاکہ ان کے شبہات دُور ہو سکیں اور ان کی حقیقی شکایتوں کا ازالہ ہو سکے۔ اقلیتوں سے متعلق معاملات کو نپٹانے کے واسطے وزارت داخلہ میں ایک خصوصی سیل قائم کیا جائے گا۔
ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا پندرہ نکاتی پروگرام حقیقی طور پر اقلیتوں اور مسلمانوں کے مکمل تحفظ اور ان کی فلاح و ترقی کا ضامن ہے۔ اس پر پورے خلوص کے ساتھ موثر ڈھنگ سے عمل درآمد یقینی طور سے اقلیتوں کے مسائل حل کر سکتا ہے، جس کے نتیجے میں اقلیتوں میں وہ اعتماد، بے خوفی اور تحفظ کا احساس پیدا ہوگا جس کے لیے اندرا جی ہمیشہ کوشاں اور سرگرم عمل رہیں۔ اس پروگرام کو پوری طرح سے عملی شکل دینا بھی اندرا جی کے تئیں ہمارا ایک خراج عقیدت ہوگا۔

★

رباب رشیدی

چراغ ایک ایسا....

مقاصد کی تکمیل کے راستے میں
چراغ ایک ایسا جلایا ہے تم نے
کبھی جس کی تابانیاں کم نہ ہوں گی
یہ سچ ہے کہ موجودگی میں تمھاری
حقائق سے آنکھیں بھی ہم نے چرائیں
مسائل سمجھنے سے دامن بچایا
ہمیں اس پہ شرمندگی بھی نہیں ہے
تمھارے سہارے پہ دل مطمئن تھا
سمجھتے تھے جو ہوگا سب ٹھیک ہوگا
ستارے چمکتے رہیں گے جبیں پر
ہمالہ کا سر یونہی اونچا رہے گا
مگر اب وہ خوابوں کی باتیں ہیں ساری
ہمیں سوچنا ہوگا ہر ہر قدم پر
یہ جمہوریت کی درخشندہ قدریں
یہ انسانیت کی دلآویز شرحیں
نگہبانِ سرچشمۂ بیتر و وحدت
انھیں کے لیے زندگی تم نے دیدی
زمانہ ابھی کروٹیں کتنی بدلے
تمھیں بھولنا کوئی آساں نہیں ہے

وسیم بریلوی
۵. کوہاپا. بریلی

وہ ایک پھول کی پتی

وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
ہزار کانٹوں میں رہ کر جو مسکراتی تھی
جو آندھیوں کے مقابل دیے جلاتی تھی
زمیں کو پھول بنانے کا اہتمام رہا
تمام عمر جسے زندگی سے کام رہا
وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
بکھر کے رہ گئی اس اعتبار کے ہاتھوں
جسے بنانے کو صدیوں کا حوصلہ درکار
جسے گنوانے کو لمحوں کی گمرہی کافی
وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
لہو کا آخری قطرہ زمین کو لکھ کر
کچھ ایسے بکھری کہ آنسو پہ اختیار نہیں
کچھ ایسے بکھری کہ آنکھوں پہ اعتبار نہیں
کچھ ایسے بکھری کہ ماحول سوگوار لگے
یہ سارا باغ ہی جیسے گناہگار لگے

قطعات

خورشید افسر بسوانی
بسواں، سیتاپور

اندرا گاندھی کی عظمت کے نثار جس کا لہجہ دیش کا دل بن گیا
اس طرح کی ہے قیادت قوم کی جو قدم اٹھا وہ منزل بن گیا

سازش و جہلِ عقیدت کے سبب اک سپاہی کتنا بزدل بن گیا
کیا زمانہ ہے یہ کیسا دور ہے جو محافظ تھا وہ قاتل بن گیا

مسکراہٹ سب کی آنسو پی گئے رقصِ نغمہ، رقصِ بسمل بن گیا
ایسے ٹپکا دیش ماتا کا لہو قطرہ قطرہ قوم کا دل بن گیا

سنہری حرفوں سے لکھے گا نام اندرا کا مرے وطن پہ کوئی جب قلم اٹھائے گا
زمانہ ایسی ہی قربانیوں سے بدلا ہے لہو زمیں پہ گرا ہے تو رنگ لائے گا

کسی دہکتے شرارے سے کم نہیں ہوتا لہو زمیں پہ گرے یا لہو بدن میں رہے
لہو ہے سب کا لہو پھر بھی رہنما کا لہو خدا کرے مگر امن و اماں وطن میں رہے

گولیوں کی سنسناہٹ اور دھواں بارود کا
گو کہ وہ منظر تھا ایسا ہوتا ہے جو جنگ میں
ہو رہا تھا وقت کا سورج سیہ ٹکڑوں میں قتل
حشر کا عالم تھا منظر ایک منظر جنگ میں

عروسِ ہند کا جب پیرہن مہکنے لگا
قبا کے زخم بھی بھرنے لگا رفو تیرا
سہاگ مادرِ گیتی کا یوں بچایا ہے
اب اس کی مانگ کا سیندور ہے لہو تیرا

جان اپنی دے کے قوم کو دی جس نے زندگی
وہ رشکِ کائنات ہے ذی احترام ہے
ہے لالہ زار جس کے لہو سے فضا تمام
گاندھی کے بعد اندرا گاندھی کا نام ہے

بدنام وقت قوم یہ کہلائے گی اگر
مذہب کی آڑ ذہن کی پستی نہ جائے گی
گاندھی بھی قتل ہو گئے ہیں اندرا بھی قتل
جب تک وطن سے فرقہ پرستی نہ جائے گی

ڈاکٹر محمود الٰہی
صدر شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

اندرا گاندھی اور اردو

محترمہ اندرا گاندھی کو جو قبول عام یا حُسنِ قبول حاصل تھا، اس کی مثال آزاد ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کسی کے حسنِ قبول کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب اس کے نکتہ چیں اپنے ترکش کے سارے تیر خالی کردیں اور اس پر آنچ نہ آئے۔ اختلاف رائے جمہوریت کی خوشحالی اور بالیدگی کی علامت ہے۔ محترمہ اندرا گاندھی نے ہمیشہ اس کا خیر مقدم کیا۔ یہی نہیں، وہ اس وار کو سہتی رہیں جو بغض و کینہ سے عبارت تھا اور جس پر اختلاف رائے کا پردہ ڈال دیا جاتا تھا، انھوں نے جمہوریت کی بقا اور ملک کا اتحاد قائم رکھنے کے لیے جو لائحۂ عمل مرتب کیا تھا، اسے قوت سے فعل میں لاتی رہیں۔ انھیں اس راستے میں تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر وہ متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہ اختلاف رائے ننگ جمہوریت ہے جو تشدد کا روپ دھار لے۔ تشدد پر اعتقاد رکھنے والے بزدل ہوتے ہیں، وہ بزدلوں سے گھری ہوئی تھیں مگر عدم تشدد کی تلقین کرتی رہیں۔ آخرش جس کی قیمت انھوں نے اپنے خون سے ادا کی۔

محترمہ اندرا گاندھی کے حسن قبول کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ جمہوری قدروں کی امین تھیں اور سیکولرزم کی علمبردار، خاک وطن کے ہر ذرے کو وہ دیوتا سمجھتی تھیں اور اس کی پرستش کرتی رہتی تھیں۔ جس ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہوں اور جہاں متعدد زبانیں بولی جاتی ہوں اسے متحد رکھنا آسان نہیں، مگر وہ جانتی تھیں کہ ہندستانیوں میں کون سے نکات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ان نکات کو زندہ و توانا رکھتی تھیں اور اس طرح رنگا رنگی میں یک رنگی تلاش کرلیتی تھیں۔

بعض خام طبیعتوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر کام ان کی خواہش کے مطابق ہو اور دوسروں کے جذبات کی پروا نہ کی جائے۔ ایسی طبیعتوں کا جادۂ اعتدال پر لانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ محترمہ اندرا گاندھی کو یہ ہنر آتا تھا۔ وہ جیو اور جینے دو پر عمل بھی کرتی رہیں اور اس کی تلقین و تبلیغ بھی کرتی رہیں۔ آزادی کے بعد اقلیتوں کے مسائل انھی خام طبیعتوں کے زائیدہ تھے جنھیں اندرا جی عقلیت اور انصاف پسندی کے سہارے حل کرتی رہیں۔ لسانی اقلیتوں کے مسائل اور بھی پیچیدہ ہو گئے تھے جن کا صحیح حل ایک حد تک انھوں نے تلاش کر لیا تھا۔ دراصل لسانی اقلیتوں کے مسائل کو انھوں نے اپنی ترجیحات میں شامل کر لیا تھا۔

حصول آزادی کے بعد اردو پر اور اُردو والوں پر کیا کچھ گزری، اس کا علم سب کو ہے۔ اردو یک جنبش قلم حکومت کے دائرہ اختیار سے خارج کردی گئی، اس کی تعلیم کے دروازے بند کر دیے گئے اور اُردو کے سیکڑوں اساتذہ کی ملازمتیں یک سر ختم کردی گئیں۔ صورت حال نے اردو والوں کو پست کر دیا تھا اور وہ اس ناانصافی پر احتجاج کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُردو کا نام لینا کوئی مجرمانہ فعل ہے۔ انتہا یہ تھی کہ جو لوگ کسی سے صرف اس لیے محبت کرتے تھے کہ وہ اُردو کا شاعر ہے، یکایک ان کی محبت بیگانگی میں بدل گئی۔ عصبیت کا ایک طوفان تھا جس کی زد میں سب سے پہلے اُردو آئی۔ اب اس طوفان کے محرکات و نتائج کا تجزیہ کرنا فعل عبث ہے۔ بس اتنا معلوم کر لینا کافی ہے کہ آزادی کے بعد کا ماحول اُردو کے فروغ و بقا کے لیے سازگار نہیں تھا اس ماحول سے صرف اُردو والے پریشان نہیں تھے بلکہ وہ لوگ بھی پریشان تھے

جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی۔ ملک کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریریں اور تحریریں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ پنڈت جی جانتے تھے کہ اردو کو صرف قانون کے ذریعہ زندہ نہیں رکھا جا سکتا بلکہ اس کے لیے طبیعتوں کا بدلنا لازمی ہے۔ اسی لیے وہ وقتاً فوقتاً اردو کے حق میں آواز بلند کرتے رہتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو یکسر ختم کر دینے کی جو مہم جاری تھی، وہ رک گئی اور دھیرے دھیرے ماحول کی زہرناکی دور ہونے لگی۔ اردو کے سیاق و سباق میں پنڈت جی کے اس کارنامے کو بھلایا نہیں جا سکتا کہ ان کی کرشمہ ساز شخصیت نے اردو کے خلاف مہم جوئی کو ختم کر دیا۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد شریمتی اندرا گاندھی برسرِ اقتدار آئیں۔ انھوں نے اردو کے مسئلہ کو بھی طرح سمجھ لیا تھا، اور ان کے والد نے اردو کی حمایت کا جو موقف اختیار کیا تھا، انھوں نے اس کی تقلید کی اور یہ ان کی جہدِ مسلسل کا نتیجہ ہے کہ آج اردو کی مخالفت کا وہ زور ٹوٹ چکا ہے جو آزادی کے بعد پیدا ہوا تھا۔

پنڈت جی نے فضا آفرینی کی اور اندرا جی نے اس فضا کو اردو کے فروغ کے لیے کارآمد کیا۔

شریمتی گاندھی کے عہدِ اقتدار میں اردو کے نفاذ کے لیے قوانین برائے نام وضع کیے گئے لیکن اردو والوں کو انھوں نے جو کچھ دیا، اس کی اہمیت کم نہیں ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اردو والوں کے جذبات و خیالات کا سب سے نمائندہ مظہر وہ محضر مطالبات تھا جو ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس محضر میں جو مطالبات شامل تھے، وہ (کسی ترتیب کے بغیر) یہ تھے۔

(۱) اردو کے ایسے اہلِ قلم اور اہلِ علم کی جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ممتاز ہوں، ریاستی حکومت کی طرف سے انعامات اور عطیات کے ذریعہ سے ہمت افزائی کی جائے۔

(۲) سرکاری اور سرکاری امداد پانے والے کتب خانوں کے لیے اردو کی کتابیں بھی مہیا کی جائیں۔

(۳) اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنے والے اور اردو کے ذریعہ سے ادب اور سائنس کی اشاعت کرنے والے مشہور اداروں کو کافی مالی امداد ملنی چاہیے۔

(۴) ایسے انتظامات کیے جائیں کہ اردو زبان میں کافی نصابی کتابیں مہیا ہو سکیں

(۵) ہندوستانی اکیڈمی میں اردو کے اہلِ قلم کو کافی نمائندگی دی جائے۔

(۶) گورنمنٹ کی شائع کردہ ضروری اطلاعات، قوانین اور مطبوعات اردو میں بھی شائع کی جائیں۔

(۷) اردو میں لکھی ہوئی عرضیاں ریاست کی عدالتوں اور دفتروں میں قبول کی جائیں اور ان پر توجہ کرنے اور ان کا فیصلہ کرانے کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔

(۸) ابتدائی درجوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی قابلیت رکھنے والے استادوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے انتظامات کیے جائیں۔

(۹) ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے، ابتدائی درجے میں وہ ذریعہ تعلیم ہو اور جہاں کہیں اردو بولنے والے بچوں کی تعداد کافی ہو یعنی بہ کسی مدرسے میں ہو یا کسی کلاس میں، وہاں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ ایسے مقامات پر جہاں اردو بولنے والی آبادی زیادہ ہے، ایسے اسکول قائم کیے جائیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس کا فیصلہ کہ بچے کی مادری زبان کیا ہے، اس کے والدین یا سرپرستوں کے کہنے کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۱۰) ایسے ثانوی مدارس کو جو اردو کے ذریعہ تعلیم دیتے ہوں، ریاست تسلیم کرے اور دوسرے ثانوی مدارس کی امداد دینے کے جو قاعدے ہوں، ان ہی کے مطابق ان مدارس کو بھی سرکاری امداد دی جائے۔

(۱۱) اتر پردیش میں کم از کم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جہاں اردو زبان کو بتدریج ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

انجمن ترقی اردو ہند کا مذکورہ وفد ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں صدرِ جمہوریہ سے ملا تھا اور ان کے سامنے محضر مطالبات پیش کیا گیا تھا۔

مد توں اس صفر کی روشنی میں موثر اقدامات نہیں کیے گئے لیکن جب محترمہ اندرا گاندھی برسر اقتدار آئیں تو انھوں نے مختصر مطالبات کی روشنی میں اردو کے مسائل کا جائزہ لینا شروع کیا اور انھوں نے بعض موثر اقدامات کیے۔ متعدد ریاستوں میں اکادمیاں قائم کی گئیں۔ ان اکادمیوں کے مقاصد میں وہ نکات شامل کیے گئے جن کے ذریعہ صفر کی شق نمبر ایک سے شق نمبرات کے مختصر مطالبات ایک بڑی حد تک پورے ہو سکتے تھے ——— اور وہ ایک حد تک پورے بھی ہوئے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اکادمیوں کے تعاون سے سیکڑوں مسودات شائع ہوئے اور سیکڑوں مصنفین کو ان کی تخلیقات پر انعامات ملے، عوامی کتب خانوں کو لاکھوں روپے کی کتابیں مہیا کی گئیں۔ ایسے معذور اور معمر ادیبوں اور شاعروں کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے جنھیں اکادمیوں سے وظائف مل رہے ہیں۔ اسی طرح ہر سال بہت بڑی قسم طلبا میں اُردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ نصابی کتابوں کی اشاعت صرف اکادمیوں نے نہیں کی بلکہ دوسرے سرکاری و نیم سرکاری ادارے بھی نصابی کتابوں کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ مثال کے طور پر ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی اور این۔ سی۔ آر۔ ٹی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ابتدائی اسکولوں میں اُردو پڑھانے کے لیے کئی ہزار اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔ شق نمبر چھ اور سات میں جن مطالبات کی صراحت کی گئی ہے ان کی طرف بھی توجہ کی گئی اور حکومت اتر پردیش نے اُردو گزٹ کی اشاعت برسوں پہلے شروع کر دی تھی جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مطالبات آج بھی محتاج توجہ ہیں، لیکن گزشتہ دو تین سال میں شریمتی اندرا گاندھی ان کی تکمیل کے لیے بھی کوشاں تھیں۔

غرض اُردو کے سیاق و سباق میں شریمتی اندرا گاندھی کی مساعی لائق ستائش ہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اُردو والوں کے مطالبات جائز ہیں اور ان مطالبات کا پورا کرنا ایک جمہوری حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو کو سارے جمہوری حقوق مل گئے، لیکن آزادیٔ ہند کے بعد اُردو جس کسمپرسی کا شکار تھی، اگر اس کا موازنہ آج کے حالات سے کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ مایوسی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن اُردو کو جائز اور جمہوری حقوق مل جائیں گے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے اُردو کی خدمت کا صحیح راستہ چُنا تھا، اگر اس راستے کو اپنایا گیا تو اُردو اپنی منزل پر ضرور پہنچے گی۔

ہندستان نے قومی مفاد میں لچک نہ رکھنے والے محبِ وطن کو کھو دیا ہے اور تیسری دنیا اپنے حقوق کے لیے لڑنے والی جانباز سے محروم ہو گئی ہے۔"

فرینکوائس متراں
صدر فرانس

عابد علی خان
مدیر سیاست
حیدرآباد

مسز اندرا گاندھی اور اردو ادیب و صحافی

[illegible]

مسز گاندھی ملک کے ہر ممتاز اردو ادیب شاعر اور صحافی سے خوب واقف تھیں اور ان کے مرتبہ و مقام کو جانتی تھیں۔ ہندستان کی ستر کروڑ کی آبادی میں ہر ممتاز شخصیت سے وہ ذاتی طور پر واقف تھیں لیکن اردو کے صحافی اور ادیب کی وہ قدردان بھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اردو کی متعدد کتابوں کی رسم اجرا انجام پائی گئی اردو کانفرنسوں کو انھوں نے خطاب کیا۔ اردو کے کئی وفود سے وہ ملیں یہ سب ایک تاریخ اور اردو کا اثاثہ ہے۔ مسز گاندھی کا انتقال اردو کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

۱۹۶۶ء میں مسز گاندھی مرکزی کابینہ میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئیں اور وہ آندھرا پردیش کے دورہ پر آئیں۔ غالباً وہ واحد مرکزی وزیر تھیں جنھوں نے ریاستی ناظم اطلاعات کے دفتر کا معائنہ کیا اور چند اخبار نویسوں سے ملاقات کی۔ مسز گاندھی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئیں ملک کے چند ممتاز اردو صحافیوں کو انھوں نے گفتگو کے لیے بلایا اور بنگلہ دیش کے مسئلہ پر انھوں نے ملک کی ۱۴ قومی زبانوں میں سے صرف اردو کے اخبار نویسوں سے خود ملاقات کی اور انھیں حکومت کی پالیسی سے واقف کرایا۔ انھوں نے اردو کو ہمیشہ ایک اہم قومی زبان کہا اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی ہر وقت کوشش کی۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں اردو صحافیوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ افتتاحی اجلاس کے موقعہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی شہ نشین پر تشریف فرما تھے۔ مسز گاندھی نے اس وقت اس بزرگ کا پورا احترام کیا، ان کے قریب گئیں اور آداب کیا۔ ان دنوں جناب میر اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش تھے اور ان کی مہربانی سے مجھے بھی راج بھون میں قیام کا اعزاز حاصل ہوا۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ بھی یہیں مقیم تھے۔ گورنر صاحب کی وجہ سے راج بھون میں مجھے وزیر اعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں تقریباً دس سال تک کام کرتا رہا۔ اس میں مسز گاندھی کی عنایات شامل رہیں۔ پہلی مرتبہ ایک اردو اخبار کے اڈیٹر کو پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل کیا گیا تھا۔ ان کے اعتماد کے باعث جب ایک ہی قومی ادارہ سماچار کی تشکیل عمل میں آئی تو مجھے بھی اس کا رکن بنایا گیا۔ مسز گاندھی ہندستانی زبانوں کی خبر رساں ایجنسی

بنانا چاہتی تھیں اور ہندی اردو کی ترقی کا نیا منصوبہ ان کے پیش نظر تھا۔ نئے خبر رساں ادارے سماچار بھارتی کا انھوں نے مجھے ڈائرکٹر مقرر کیا۔ گجرال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مجھے مسز گاندھی سے ملاقات ـــــ کے متعدد مواقع ملے۔ جناب نورالحسن وزیر تعلیم نے جب گجرال کمیٹی کے اراکین کا انتخاب کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' احتشام حسین اور مجھ سے یہ توقع ہے کہ کمیٹی کی سفارشات ترقی پسندانہ ہوں تاکہ رجعت پسند اردو کے ساتھ کسی بہتر سلوک کی مخالفت نہ کریں اور اردو کو اس کا جمہوری حق ملے۔ چنانچہ گجرال کمیٹی نے اردو کو دوسری یا سرکاری زبان بنانے کی بحث میں گئے بغیر اپنی سفارشات پیش کیں میں نے مسز گاندھی کو دو تین مرتبہ بہ طور خاص اردو کے مسئلہ کے حل کے لیے توجہ دلائی مگر ان کے سامنے ہندی کے ایک طبقے کی جانب سے شدت سے مخالفت کا اظہار ہوتا رہا۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے بعض پارٹیوں کی تنقید بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کا یہ اندیشہ اور خیال درست بھی تھا۔

مسز گاندھی اردو کی دوست تھیں۔ اردو سے انصاف کی توقع انہی سے تھی مگر بعض پارٹیوں نے مسز گاندھی کے ہر اقدام کی مخالفت کو اپنا فرض جانا ۱۹۸۴ء میں تو مسز گاندھی کی بھرپور مخالفت ان کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ مسز گاندھی اردو کے تمام ممتاز ادیبوں شاعروں صحافیوں اور فنکاروں کی دوست اور رفیق تھیں۔ سجاد ظہیر' ساغر اور ساحر سے بھی وہ واقف تھیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اور احتشام حسین جیسے نقاد بھی ان سے قریب رہے۔ کرشن چندر' خواجہ احمد عباس' علی سردار جعفری' کیفی اور مخدوم ہر ایک سے وہ ذاتی طور پر واقف تھیں

میں دسمبر ۱۹۸۱ء میں عارضہ قلب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور مجھے دو سال تک سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سال غالب ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے میں دہلی گیا تھا۔ جب شہ نشین پر پہنچا اس وقت انعام دیتے ہوئے آہستہ سے مجھ سے میرا مزاج دریافت کیا۔ اسی رات جناب حمیداللہ بیگ صدر اقلیتی کمیشن نے اشوکا ہوٹل میں عید ملن کے سلسلہ میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر مسز گاندھی سے دوسری مرتبہ ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے عرض کیا کہ دو سال سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں چند منٹ کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فوراً ہی دوسرے دن مجھے ملاقات کا موقع دیا۔ ایک دن قبل ہمارے ایک طیارہ کا اغوا ہوا تھا اور وہ اس سلسلہ میں بے حد مصروف تھیں اس کے باوجود انھوں نے مجھ سے آندھرا پردیش میں اقلیتوں کے مسائل پر گفتگو کی۔ مسز گاندھی نے اس موقع پر کہا تھا کہ "مجھے یہ شکایت ہے کہ اچھی اور قابل مسلم شخصیتیں سامنے نہیں آتیں اور یہی خلا وہ خرابی ہے جس کی وجہ سے اقلیتی مسائل کی موثر نمائندگی نہیں ہوتی"۔ مسز گاندھی کا خیال بالکل درست تھا۔ آج اقلیتوں کے مسائل کے حل میں تاخیر اور رکاوٹ کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اقلیتی فرقے کے قابل افراد' ادیب اور دانشور بھی خاموش اور بے نیاز ہیں ذہین افراد کی یہ خاموشی اور بے اعتنائی بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل حل نہ ہونے کی ایک بہت بڑی اور بنیادی وجہ ہے۔

مسز گاندھی کے انتقال سے ملک میں بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ سائنسدانوں فنکاروں' ادیبوں اور شاعروں نے اپنا ایک اہم رفیق کھو دیا ہے۔ اور اردو کو یہ افسوس رہے گا کہ وہ کڑی بھی ختم ہو گئی جو موتی لال نہرو نے ملک اور قوم کو دی تھی۔

مسز گاندھی ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم روایات کی علمبردار تھیں وہ آخری وزیر اعظم تھیں جنھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ہندوستان میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کو دیکھا اس میں سرگرم حصہ لیا اور ہماری مشترکہ روایات کے عظیم سرمایہ کے تحفظ کی کوشش کی۔ ●●

"[illegible]
[illegible]
[illegible]
سے محروم ہو گئی۔"

مسز مارگریٹ تھیچر
وزیر اعظم برطانیہ

اقبال صدیقی
محمد علی لین۔ لکھنؤ۔ ۱۸

اُردو اور مسز گاندھی

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نئی اور پرانی نسل کے درمیان رابطہ کے پل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن کے نظریات اور طریقہ کار پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ گاندھیائی اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے کے ساتھ ترقی پذیر دنیا میں ہندستان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنے کی تمنا رکھتی تھیں اور اپنے اصولوں کو کسی بھی دباؤ سے متاثر ہوکر ترک کرنے کو ہندستانی عوام کے مفاد کے خلاف تصور کرتی تھیں۔

ان کا یہ رویہ یکساں طور پر ملک کے اندرونی اور بیرونی مسائل حل کرنے میں نمایاں طور سے کارفرما نظر آتا ہے۔ لسانی مسئلے پر بھی انکا نقطۂ نگاہ اسی اصول کا مظہر ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں راقم الحروف اردو کے مسئلہ کو مسز اندرا گاندھی کے اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرس کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۷۔۱۸ اور ۱۹ نومبر کو منعقد ہوا جسکا افتتاح وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کیا تھا۔

سارے ہندستان کی زبان

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا "میں تو اپنی تقریر ہندی میں کروں گی اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجھے اردو سے چاہ نہیں ہے ...... اردو ایک نہایت زندہ زبان ہے اس میں ایک خاص طاقت بھی ہے اور خوبصورتی بھی اور میں اس کو سارے ہندستان کی زبان مانتی ہوں۔ کسی ایک قوم کی نہیں، کسی ایک ریاست نہیں اور میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ہمیں اردو کی خدمت کرنی ہے۔"

پھر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے فرمایا۔

"میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اردو اگر کمزور پڑے تو ہمارے سارے ملک کو اس سے نقصان پہونچے گا... ...کوئی بھی زبان ہو وہ توڑنے کا کام بھی کر سکتی ہے اور جوڑنے کا کام بھی کر سکتی ہے اردو سے ہمیں امید ہے کہ باندھنے کا کام کرے گی خاص طور سے اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو پورے ہندستان میں پھیلی ہوئی ہے .... اردو نے ہمارے ملک کی بہت خدمت کی ہے لیکن جدید ہندستان کی اردو کیا خدمت کر سکتی ہے۔ اس کو کس طرح سے نیا راستہ دکھا سکتی ہے اور ایک نئی مضبوطی دے سکتی ہے۔"

اردو اخبار نویس

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ جب ملک انتہائی مشکل دور سے گزر رہا تھا تو بڑی بڑی ہستیاں یہاں پیدا ہوئیں ان میں بہت سے اخبار نویس تھے جنھوں نے ہماری آزادی کی جدوجہد میں ایک نئی جان ڈالدی قوم کو ایکتا دی، مضبوطی دی اور جب بھی لوگوں کے دل ذرا بھی کمزور

جاتے تھے تو اپنے جوش اور حوصلہ افزائی سے وہ ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دیتے تھے۔"

اب کیا صحافی اور اخبار نویس نہیں سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی وقت آج ہمارے ملک کے سامنے ہے......

مسز گاندھی ہی کی کاوشوں سے سب سے پہلے اتر پردیش میں اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا۔

مسز اندرا گاندھی نے ۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو دہلی میں آل انڈیا رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم کی جانب سے منعقدہ اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آج کی قومی یکجہتی کی کانفرنس اردو زبان میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اردو ہماری پرانی تہذیب کی نشانی ہے اور قومی ایکتا کا نمونہ ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ادب کی بلندی میں بے شمار ہندو، مسلم، سکھ عیسائی لکھنے والے اور شاعروں کا تعلق رہا ہے"

مسز گاندھی زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتی ہیں کہ۔

"یہ درباری زبان پہلے دکن میں بنی لیکن دلی کے عوام میں یہ کافی عرصہ سے ہردلعزیز تھی اور اس شہر کی ترقی میں اس کا ایک خاص حصہ رہا ہے۔ برج بھاشا کھڑی بولی اور آس پاس کی بولیوں کا اردو پر گہرا اثر رہا جس کے نتیجہ میں عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے ساتھ یہ عام لوگوں کی زبان بحیثیت ہماری ملی جلی ثقافت کی ایک خوبصورت تصویر بن گئی۔"

ترانہ اقبال کا ذکر فرماتے ہوئے اپنے خطبہ میں مسز اندرا گاندھی فرماتی ہیں۔

علامہ اقبال نے جب "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" لکھا اسی طرح کی دوسری بہت سی نظمیں لکھیں تو انھوں نے نہ صرف بھارت کی ایکتا بلکہ پوری دنیا کی انسانی برادری کی ایکتا پر زور دیا۔ ہمارے مسلم نیتا بہت اونچے درجہ کے انسان تھے جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں خدمات انجام دیں۔

آزادی کی لڑائی میں بھی اردو کے لکھنے اور بولنے والوں ادیبوں اور فنکاروں نے سب سے آگے بڑھکر حصّہ لیا۔

"انقلاب زندہ باد" اسی اردو کی دین ہے اور اسی کی گونج نے دنیا کے سب سے بڑے سامراج کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ آزادی کی لڑائی کے دوران جوشیلے ترانے زیادہ تر اردو زبان میں تھے آج ایسا وقت ہے جب کہ ہر ایک دیش پر سیاسی اقتصادی اور فوجی نوعیت کے کئی بیرونی دباؤ ہیں یہی وجہ ہے کہ قومی طاقت کی حفاظت کرنا سب کا پہلا فرض ہے۔"

مسز گاندھی کے مندرجہ بالا اقتباسات سے اردو زبان کے سلسلے میں انکا واضح نظریہ سامنے آجاتا ہے۔

"وہ جمہوریت کی بہت بڑی علم بردار تھیں۔ ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے عوام کی فلاح و بہبود مسز گاندھی کو بہت عزیز تھی۔"

رونالڈ ریگن
صدر امریکہ

رمیش چندر دویدی
۱۴/۲۵ جواہر لال نہرو روڈ
الٰہ آباد

اندرا گاندھی اور فراق

دو عظیم ہستیوں کی شخصیت اور ان کے باہمی تعلقات نیز خیالات کی ہم آہنگی اور غیر ہم آہنگی پر قلم اٹھانا آسان نہیں ہے۔ قلمکار کو خود کو بھی انسانی ذہن کے باریک سے باریک گوشوں کے اندر ہونے والی جنگ، توازن اور عدم توازن کی اس بلند سطح تک لے جانا ہوگا، جہاں ان دو عظیم ہستیوں کے خیالات کی دنیا آباد تھی۔ فراق کے ساتھ تو میں نے تقریباً تیس سال کا طویل عرصہ گزارا ہے۔ فراق کو ہر زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر پھر بھی فراق کو سو فیصد سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ میرے خیال سے بنی نوع انسان کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ ایک عظیم شخصیت کو۔

فراق بول بول کر اکثر مجھ سے جواہر لال جی کو خط لکھوایا کرتے تھے۔ ان خطوط میں فراق اپنی ذاتی مشکلات نیز ملک اور بیرونِ ملک کی سیاست کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پہلی بار مجھے اندرا گاندھی کو دیکھنے کا موقع فراق صاحب کے ساتھ ہی ملا۔ یہ واقعہ ہے مارچ ۱۹۶۲ء کا۔ ڈی سی ایم کے مشاعرے کے بعد فراق دلّی سے الٰہ آباد آنے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ نہرو جی کے یہاں سے فون آیا۔ فراق صاحب نے مجھے بتایا کہ شام کو پنڈت جی کے یہاں ایک نشست ہونے والی ہے اور اس نشست میں شرکت بہت ضروری ہے۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں جا کر ریزرویشن کینسل کرا دوں۔ ان کے دل میں پنڈت جی سے ملنے کی شدید خواہش تھی۔ کہنے لگے: "رمیش جواہر لال جی سے ملے بہت عرصہ بیت گیا۔ ان کی طبیعت بھی ان دنوں خراب ہے۔ ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ تمھاری بھی خوش قسمتی ہے کہ تم بھی میرے ساتھ ان سے مل لوگے۔" میں بھی بے حد خوش تھا۔ پنڈت جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا تھا۔ شام کو فراق ان کے دوست جناب وی۔ کے ورما، سمت پرکاش شوق اور میں تین مورتی پہنچ گئے۔ اوپر کے بڑے کمرے میں نشست کا انتظام تھا۔ بڑی شائستہ محفل تھی۔ سب سے پہلے لال بہادر شاستری جی سے فراق کی ملاقات ہوئی۔ شاستری جی کہنے لگے: "فراق صاحب جب آپ کانگریس میں شریک ہوئے تھے اس وقت میں ایک طالب علم تھا۔ کل کے مشاعرے میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا تھا۔ آج آپ سامعین کو کن بلندیوں تک لے جائیں گے؟" ابھی باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں نے فراق کو پنڈت جی کے آنے کی خبر دی تو انھوں نے نظریں اٹھا کر پنڈت جی کو دیکھا اور فوراً اپنے ہاتھ سے جلتی ہوئی سگریٹ فرش پر بچھی ہوئی کارپٹ کے اوپر پھینک کر پیروں سے مسل ڈالی۔ لوگ چپ چاپ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ پہلی قطار کے درمیان پنڈت جی بیٹھے تھے۔ ان کے بائیں جانب بغل میں شاستری جی اور شاستری جی کے بغل میں فراق اور فراق کے پیچھے میں۔ جواہر لال جی نے شاستری جی سے کہا: "تم اٹھ جاؤ اور یہاں میرے بغل میں رگھوپتی کو بیٹھنے دو۔" فراق صاحب جواہر لال جی کے بغل میں بیٹھ گئے۔ سامنے فرش پر قالین کے اوپر گدا اور گدّے پر دودھ کی مانند سفید اور ملائم چادر بچھی ہوئی تھی۔ جس پر شاعروں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ شاعر اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے۔ صرف فراق جواہر لال جی کے بغل میں کرسی پر تشریف فرما تھے۔ کافی دیر سے فراق بغیر سگریٹ کے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں سگریٹ کے بغیر بڑی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ انھوں نے پنڈت جی سے بڑی دبی زبان سے

سے کہا۔ "پنڈت جی مجھے نیچے کی سیٹ پر جانے کا حکم دیجیے"۔ "کیوں؟" پنڈت جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: "میں سگریٹ کے بغیر رہ نہیں سکتا اور یہاں سگریٹ پینے سے کسی کو تکلیف ہو سکتی ہے"۔ فراق نے کہا۔ جواہر لال جی پوچھ بیٹھے۔ "جو کچھ پینا ہو یہیں پیو۔ اور تکلیف کس کو ہو جائے گی؟" "یہ نہیں بتاؤں گا"۔ فراق نے جواب دیا۔ فراق نے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ اس نشست میں شرکت کرنے والے شاعروں میں فراق کے علاوہ علی سردار جعفری، اسکندر علی وجد، اور بیکل اتساہی شامل تھے۔ بیکل اتساہی نے اپنی غزل شروع کی۔ لوگ چپ چاپ سُن رہے تھے۔ نہ داد نہ فریاد۔ جواہر لال جی کی شخصیت کے سامنے کس کی زبان کھلتی۔ فراق بول پڑے: "ارے بھئی کچھ تو داد دیجیے یا ہوٹ ہی کر دیجیے۔ کچھ تو زندگی کا ثبوت دیجیے"۔ پھر کیا تھا 'واہ'، 'واہ' کی آواز گونجنے لگی۔ اس نشست میں فراق نے اپنی نظم "رقصِ شب تاب" اس انداز میں پڑھی تھی کہ پنڈت جی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ نشست ختم ہو گئی۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جواہر لال جی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فراق پنڈت جی کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے کی جانب بڑھنے لگے کہ ایک محترمہ نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر ان کا راستہ روک لیا اور کہنے لگیں: "بتائیے میں کون ہوں؟" اپنے حافظے پر لاکھ زور ڈالنے کے باوجود فراق پہچان نہ پائے۔ پھر محترمہ نے بتایا کہ میں بیگم بھوپال ہوں۔ پھر کیا تھا۔ فراق کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور فراق بیتے دنوں کی یادیں تازہ کرنے لگے۔ ایک ہی سانس میں بھوپال سے لے کر دلی تک کی ملاقاتوں، شاعری کی محفلوں اور دعوتوں کا ذکر کر بیٹھے۔ انھیں کے قریب اندرا جی کھڑی تھیں۔ فراق انھیں بھی پہچان نہ پائے اور پوچھنے لگے کہ آپ کون ہیں۔ میں نے کہا: "اندرا جی"۔ فراق افسوس ظاہر کرتے ہوئے بولے "دیکھو بھئی کیا ہو گیا ہے مجھے۔ اپنے گھر کے بچوں کو نہیں پہچان پا رہا ہوں۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس وقت مجھے آنند بھون میں گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا ہے۔ اس وقت اندرا جی بہت چھوٹی تھیں۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں میں آئی سی ایس چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو گیا تھا۔ آنند بھون میرا گھر بن گیا تھا۔ اندرا جی بہت چھوٹی تھیں اور آکر اکثر ہم لوگوں کے پاس اور کبھی کبھی ہماری گود میں بیٹھ جاتی تھیں۔ جواہر لال جی مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ اندرا کو سوہن حلوہ بہت پسند ہے اور وہ سوہن حلوہ بہت کھاتی ہے۔ کہیں اسے تکلیف نہ ہو جائے"۔ یہ کہتے کہتے فراق جذباتی ہو چلے تھے۔ فراق کی باتیں اندرا جی کو بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کے بعد فراق جواہر لال جی کے کمرے میں ان سے ملنے چلے گئے۔ فراق کے ساتھ اندرا جی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ فراق نہرو خاندان سے کتنے قریب ہیں۔

فراق اندرا جی کو اکثر خط لکھا کرتے تھے۔ وہ انھیں ہر خط میں برابر آگاہ کرتے تھے کہ اندرا جی آپ سنبھل کر رہیں۔ ہندستان کو برباد کرنے والی ساری طاقتیں آپ کے پیچھے پڑی ہیں۔ ذرا سی غفلت سے بڑے سے بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے ملکوں سے ہندستان کی ابھرتی ہوئی طاقت دیکھی نہیں جا رہی ہے اور سرمایہ دارانہ تہذیب ہمیں مٹانے کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔ فراق سب کچھ برداشت کر سکتے تھے مگر ہندستان کے خلاف کوئی بھی بات انھیں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ہندستان کے لیے دونوں ہی عظیم ہستیوں کو بے پناہ محبت تھی۔ ایک بار ایک مولانا صاحب فراق سے ملنے آئے۔ مولانا صاحب ہندستان کی جنگِ آزادی میں شریک ہو چکے تھے۔ بڑے فخر کے ساتھ کہنے لگے کہ "ہم نے ہندستان کو بنایا ہے"۔ فراق کچھ سنجیدہ ہو گئے اور بڑے ہی سنجیدہ لہجہ میں بولے "مولانا یہی فرق آپ میں اور مجھ میں ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے ہندستان کو بنایا اور میں کہتا ہوں کہ ہندستان نے مجھے بنایا"۔

اندرا گاندھی اور فراق نے تن، من، روح اور جان سب کچھ ہندستان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ پی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ سی۔ ایس چھوڑنے کے بعد فراق کانگریس میں شامل ہو گئے تھے اور آنند بھون میں رہنے والوں کے لیے فراق کے دل میں بڑی ہی عزت تھی۔ آپ اسے چاہے جو سمجھیں فراق اندرا جی کے خلاف کچھ سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ جب کبھی لوگ اندرا جی کی

حکومت کی خرابیوں کی باتیں کرتے تھے تو فراق کا جواب ہوتا تھا کہ بھئی اتنے بڑے ملک کو چلانے میں کچھ خرابیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ تو دیکھئے کہ ایسے خطرناک حالات میں ملک کو چلانا کوئی کھیل ہے۔ چاروں طرف سے ہندستان کے سینہ کے اوپر بندوقیں تنی ہوئی ہیں۔ امریکہ جیسے خوشحال اور طاقت ور ممالک ہندستان کو اکھاڑ پھینکنے میں لگے ہیں۔ ہمارے ملک میں خود وطن دشمن عناصر موجود ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کچھ خامیاں نظر آتی ہیں تو انھیں ہمیں نظر انداز کر دینا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مجموعی طور پر ہمارے سامنے ہندستان کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔ جب ہم TOTALITY کو سامنے رکھ کر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہندستان ترقی کرتا جا رہا ہے اور ہر قدم پر اندر سے مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں خرابیوں کی دوزخ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ جواہر لال نہرو ایک فلسفی سیاستداں تھے۔ وہ پلیٹو کے فلاسفر کنگ تھے۔ انھوں نے ہندستان کی ترقی کے کچھ خواب دیکھے تھے اور اپنے دور حکومت میں انھیں خوابوں کے چند بیج بوئے تھے۔ ان بیج سے نکلے ہوئے پودوں کی دیکھ بھال کرنا، انھیں سنوارنا، سینچنا اور اس قابل بنا دینا کہ وہ پھل دینے لگیں اور یہ پھل ہر ہندستانی کے گھر پہنچ سکیں۔ اس کی ذمہ داری اندرا گاندھی نے اپنے اوپر لے رکھی ہے اور اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

فراق کو گیان پیٹھ کا انعام ملا۔ اس جلسہ کی صدارت اندرا گاندھی کر رہی تھیں۔ اس محفل میں ہندستان کی بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں سبھی مقرر اپنی اپنی تقریریں لکھ کر تیار بیٹھے ہوئے تھے پڑھنے کے لیے شام کا وقت تھا، وگیان بھون میں کافی روشنی تھی۔ فراق جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر ایک طرف رکھ دی اور کہنے لگے، بھئی مجھے دکھائی نہیں پڑتا ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے اندھیرا روشنی کا کام کرتا ہے۔ کچھ ایسی بھی چڑیاں ہیں جو اندھیرے میں دیکھ لیتی ہیں۔ بہرحال مجھے اندھیرے میں بالکل نہیں دکھائی دیتا ہے اس لیے میں اپنے من سے بولوں گا۔ فراق کے اس مذاق کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور سارے ہال میں ہنسی کی روشنی پھیل گئی۔ فراق کی مؤثر تقریر کے بعد اندرا جی بولنے کے لیے کھڑی ہوئیں۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ میں یہ تو نہیں جانتی کہ مجھے اندھیرے میں دکھائی دیتا ہے یا نہیں لیکن میں نے کوئی تقریر لکھ کر تیار نہیں کی ہے۔ میں یوں ہی جو کچھ میرے من میں ہے وہی بولوں گی۔ اس کے بعد انھوں نے فراق کی شاعری اور آرٹ کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی۔ اندرا جی نے فراق کی شاعری کے اس حصہ کو اجاگر کیا جس سے ہندستان کی آتما جھانک رہی تھی۔ بڑی خوبصورت تقریر تھی۔ فراق صاحب کی شاعری میں چھپی ہوئی ہندستان کی روح ابھر کر سامنے سامعین کے دل کی دھڑکن بن گئی، اتنی پرزور تقریر تھی اندرا جی کی۔

فراق صاحب کو وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے پروڈیوسر ایمیریٹس بنا دیا گیا تھا۔ انھیں دو ہزار روپے کا ماہانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ یہ وظیفہ پانچ سال تک جاری رہا اور پانچ سال کی مدت ختم ہونے پر بند کر دیا گیا۔ فراق نے اس سلسلہ میں اندرا جی کو ایک دو خط بھی لکھے تھے۔ اندرا جی نے اس مسئلہ کو وزارت اطلاعات و نشریات کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس درمیان وہ فراق کو اپنے پاس سے دو ہزار روپے بھیجتی رہیں۔ بعد میں وزیر اطلاعات و نشریات جناب وسنت ساٹھے نے اس وظیفہ کو دوبارہ جاری کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر تب تک فراق ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اندرا جی فراق کا بہت ہی خیال کرتی تھیں۔ جن دنوں اندرا جی ہندستان کی وزیر اعظم نہیں تھیں اور جنتا پارٹی کی حکومت تھی اس زمانہ میں ان کے حسب الحکم آنند بھون سے کوئی نہ کوئی آ کر فراق کا حال چال لے جایا کرتا تھا اور اسے اندرا جی تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ انھوں نے حکومت اتر پردیش کو بھی فراق کی دیکھ بھال کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ فراق دلی تقریباً ہر سال ہی جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی دلی کے سفر کے دوران اندرا جی سے ملنے بھی جایا کرتے تھے۔ ایک بار جب وہ اندرا جی کے یہاں پہنچے تو انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ بغل کے کمرے میں زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فراق کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر اتنا شور و غل بہت ہی کھٹک رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اندر سے کانگریس کے دو بڑے لیڈر، تیزی سے باہر

نکلے اور فراق کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ فراق نے کہا: "ارے بھئی، پرائم منسٹر کے ریزیڈنس کو مچھلی بازار بنا دیا گیا ہے۔" اس کے بعد اندرا جی اپنے کمرے سے باہر آئیں اور فراق کا استقبال کرتے ہوئے اپنے کمرے تک لے گئیں۔ میں بھی ساتھ تھا۔ اندرا جی تھوڑی دیر تک فراق کا حال چال پوچھتی رہیں اور پھر ملک اور بیرون ملک کی سیاست پر تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔ اس گفتگو کے دوران فراق کے راجیہ سبھا کے ممبر بننے کی بات بھی آئی۔ فراق نے اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت چاہی۔

فراق ہمیشہ اپنے کو نہرو خاندان کا ایک فرد ہی سمجھتے رہے۔ یہ واقعہ ہے اس وقت کا جب ہندوستان میں جنتا پارٹی کی حکومت تھی۔ اندرا جی الیکشن ہار چکی تھیں۔ الہ آباد میں فراق کے بنگلہ پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ فراق کو اندرا جی کے الیکشن ہار جانے سے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ فراق کے یہاں بیٹھے لوگوں میں ایک صاحب جنتا پارٹی کے حامی تھے یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتا لیکن ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اندرا جی کی سیاست کے بہت زیادہ مخالف تھے اور ان پر تنقید کر رہے تھے۔ فراق کئی بار کہہ چکے تھے: "ارے بھئی کوئی اور بات کرو، اب بہت ہو چکا۔" مگر وہ حضرت اپنی رَو میں بولتے ہی چلے گئے۔ جانے یا انجانے میں ان کے منھ سے "بیوہ" کا لفظ نکل آیا۔ پھر کیا تھا۔ قیامت آگئی۔ فراق آگ بگولہ ہو گئے۔ غصہ سے ان کا چہرہ تمتما گیا مگر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے دھیرے سے اپنی بغل میں رکھی ہوئی چھڑی اٹھائی اور ان حضرت پر پل پڑے۔ زبان سے پھٹکار اور چھڑی کی مار دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے فراق قابو میں آئے۔ بار بار فراق یہی کہہ رہے تھے کہ "تم نے میری بیٹی کو بیوہ کیسے کہا۔ تمھاری یہ مجال۔ کیا بڑے لوگوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ تم کیڑے مکوڑوں کی اولاد ہونے کا ثبوت دیتے رہے ہو۔ اندرا جی کل تک ہمارے ملک کی وزیر اعظم تھیں۔ ہندوستان کے عوام کے دلوں میں ان کے لیے کتنا پیار ہے۔ ان کی شان میں ایسی باتیں کہنا پورے بھارت دیش کی بے عزتی ہے اور پھر تم یہ جانتے ہو کہ میں اندرا جی کی کتنی عزت کرتا ہوں، میں نہرو خاندان کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ یہ سب جانتے ہوئے تم نے ایسی باتیں کہی ہیں۔ تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں تمھیں معاف نہیں کر سکتا۔" کافی ڈانٹ پھٹکار اور دو تین چھڑی کھانے کے بعد وہ حضرت چلتے بنے۔

فراق کا جسم بہت پہلے سے ہی مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جگر کی تکلیف، بواسیر کا پرانا مرض، ہرنیا کی بیماری اور زندگی کے آخری دَور میں ذیابطیس اور آنکھوں میں موتیا بند کی تکلیفوں میں مسلسل مبتلا ہی رہتے تھے۔ فراق موت سے بھی اتنا نہیں گھبراتے تھے جتنا نابینا ہونے کے خوف سے۔ الہ آباد میں آنکھوں کے ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا بند ہے۔ فراق نے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اندرا جی کی مدد سے آنکھوں کا علاج آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز دلی میں کرایا جائے۔ انھوں نے اپنی تکلیف اور علاج کے بارے میں ایک خط اندرا جی کو لکھ دیا۔ بات پکی ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں فراق دلی پہنچ گئے۔ انھیں وہاں ۲۵ دسمبر کو غالب ایوارڈ ملا۔ فراق اپنے ایک دوست جناب آر۔ کے۔ گرگ، سینیر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ میں اور فراق کے دو ملازم بھی تھے۔ تقریباً ایک مہینہ گرگ صاحب کے یہاں رہنے کے بعد فراق آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں بھرتی ہو گئے۔ فراق کے علاج کی پوری ذمہ داری وزیر اعظم اندرا جی پر تھی۔ اندرا جی فراق کو دیکھنے کے لیے اکثر وہاں آیا کرتی تھیں۔ اندرا جی کی ذاتی دل چسپی اور فراق کی شہرت کی وجہ سے حکومت ہند کے وزرا اور بڑے بڑے حاکم فراق کو دیکھنے آتے تھے۔ ڈاکٹروں نے فراق کو سگریٹ چھوڑ دینے کی رائے دی تھی۔ فراق نے ڈاکٹروں کی بات مان کر سگریٹ پینا بند کر دیا تھا۔ ایک دفعہ جب اندرا جی فراق سے ملنے آئیں تو انھیں پتہ چلا کہ فراق نے سگریٹ پینا بند کر دیا ہے۔ اندرا جی نے کہا: "فراق صاحب بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے سگریٹ پینا بند کر دیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ کے لیے سگریٹ پینا چھوڑ دیجیے۔" فراق نے بڑے معصوم لہجہ میں جواب دیا: "اندرا جی، زندگی چھوڑ دینا آسان ہے مگر سگریٹ چھوڑ دینا بہت ہی مشکل ہے۔" بہرحال سگریٹ چھوڑنے کی

پوری پوری کوشش کر رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔"
اندرا جی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "زندگی یا موت کس کے بس میں تھوڑی ہی ہے۔ سگریٹ چھوڑنے کے بعد آپ کی صحت بہتر ہو جائے گی۔" دس پندرہ منٹ تک فراق کا حال احوال پوچھ کر اور ڈاکٹروں کو فراق کی دیکھ بھال کی ہدایت کر کے اندرا جی چلی گئیں۔ فراق سے ملنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان ملاقاتیوں میں بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کا مقصد فراق سے ملنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اندرا جی تک یہ بات پہنچ جائے کہ وہ حضرت فراق کو دیکھنے اسپتال تشریف لائے تھے۔ ان ملنے جلنے والوں میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو اپنی بات فراق کے توسط سے اندرا جی تک پہنچانا چاہتے تھے۔ دوسری بار جب اندرا جی اسپتال میں فراق سے ملنے آئیں تو فراق نے باتوں باتوں میں کہہ ہی ڈالا کہ اندرا جی میرے پاس اکثر ایسے بہت سے لوگ آتے ہیں جن کا مقصد ہوتا ہے کہ میں ان کی تعریف آپ سے کروں۔ ایسے لوگوں سے بہت بچ کر رہنے کی ضرورت ہے۔ اندرا جی چپ چاپ فراق کی باتوں کو سنتی رہیں۔

جب بھی اندرا جی فراق سے ملنے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں تشریف لاتیں اس وقت فراق کے پاس میرے علاوہ فراق کے ملازم اور جناب ڈی۔ این۔ آریہ صاحب بھی موجود ہوتے تھے۔ آریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراق نے اندرا جی سے کہا: "اندرا جی، رمیش اور آریہ ہی ہماری ضعیفی کے سہارے ہیں اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔" اندرا جی نے کہا "بھئی یہ لوگ بڑے ہی خوش نصیب ہیں کہ ان کو آپ جیسی عظیم شخصیت کی خدمت کا موقع ملا ہے۔"

فراق اندرا جی کو برابر لکھتے رہتے تھے کہ کانگریس پارٹی کے باہر اور کانگریس پارٹی کے اندر بہت سے ایسے عناصر موجود ہیں جن کے لیے RUTHLESS PURGING کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دارانہ تہذیبیں اس ملک کو اور آپ کو مٹانے پر تلی ہیں۔ آپ اس ملک کی سلامتی اور ترقی کی علامت ہیں۔

جس بات سے فراق برابر ڈرتے رہے اور اندرا جی کو آگاہ کرتے رہے وہی بات آخر کار سامنے آئی اور ملک دشمن عناصر نے اس روشنی کو بجھا دیا جس نے ایک لمبے عرصے تک اندھیروں کو چیر کر ملک کے درخشاں مستقبل کے لیے رہنمائی کی۔ وہ روشنی امر روشنی ہے جو ہماری ہمیشہ رہنمائی کرتی رہے گی۔ ایک آدمی کا دنیا سے اٹھ جانا کہنے کو تو ایک چھوٹی سی بات ہے مگر بقول فراق ؎

ہمارے قتل سے تاریخ لاکھوں کروٹیں لے گی
بہت ہی طول کھینچے گا یہ قصہ مختصر ہو کر

ایک شخص کے مر جانے سے کیا ہو جائے ہے لیکن
ہم ایسے کم ہوئے ہیں پیدا، پچھتاؤ گے دیکھو ہو

دنیا میں سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے ان لوگوں کی موت دیکھنا جنہیں کوئی پیار کرتا ہو۔ مجھے صاف صاف یاد ہے کہ جب جواہر لال جی کی موت کی خبر فراق کے کانوں میں پڑی تو فراق کتنے بے چین ہو گئے تھے۔ اس رات فراق نے شراب چھوئی تک نہیں۔ رات بھر کبھی کمرے میں، کبھی برآمدے میں ٹہلتے رہے۔

اسے بھی مصلحت خداوندی ہی سمجھ لیجئے کہ فراق اندرا جی کے المناک سانحۂ قتل سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ فراق پر اندرا جی کی موت کا کیا اثر پڑتا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اندرا جی کی موت کا غم اور ان کی موت کی وجہ سے ملک کے اتنے بڑے رہنما کی محرومی کا احساس دونوں مل کر شاید فراق کو دیوانہ بنا دیتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی یا خدا جانے کیا ہوتا — کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اندرا جی اور فراق صاحب کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ ان کے ایک دو خطوط کے نمونے پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

"وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی موت سے ناوابستہ تحریک نے ایک لائق صدر کھو دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ترقی پذیر ممالک کا ایک ایسا ترجمان بھی جاتا رہا جو ان ممالک کی وکالت میں پیش پیش رہتا تھا۔"

جنرل حسین محمد ارشاد
صدر بنگلہ دیش

FIRAQ GORAKHPURI
8/4, Bank Road,
Allahabad-2.

Dated 31 3.1980

My dear Indira Ji,

I am venturing to write to you this letter in great distress. Govt of India appointed me under your regime as Producer Emeritus on Rs. 3000/— p.m Since my giving up I.C.S & P.C.S. in 1920 sixty years have passed and the only service & source of income for me and my family was under Secretaryship of the Congress and the University service. The bringing up of my brothers & of my children, the marriage of my sisters & daughters, the medical expenses of my brothers at Bhowali compelled me to sell out every bit of our ancestral property. There was no pension for the University service. I myself have become a cripple. Some prizes came to me Pt. Jawahar Lal Nehru & yourself were gracious enough to handover to me these prizes. For the last few years my only support has been the pension I have been getting as Producer Emeritus, under Information & Broadcasting Ministry. This pension has come to an end today the 31st of March, 1980

My pension from the Information & Broadcasting Ministry is due to be stopped or to be renewed from 1st April, 1980.

I am writing this to draw your personal kind attention to my case and to request you for the renewal or recontinuation of my pension from 1st April, 1980 without which I shall be without any income in these days of hardship. If you kindly use your high office to have my pension continued, I shall be saved from economic ruin during the very few years of life still left to me. I am eightyfour already and a victim of paralysis.

Kindest regards.

Yours gratefully

FIRAQ GORKHPURI

Mrs. Indira Gandhi,
Prime Minister of India.
Prime Minister's Residence.
NEW DELHI
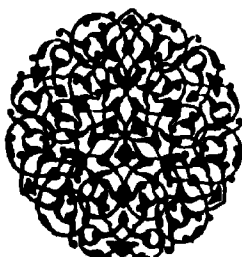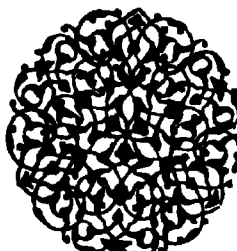
प्रधान मंत्री भारत
PRIME MINISTER,
INDIA

No.1384-PMO/80

New Delhi
August 12, 1980

Dear Shri Gorakhpuri,

I am grateful for your message of condolence.

I am sorry to learn of your continued ill-health.

The question of continuance of Government financial assistance to you is being pursued with the Ministry of Information & Broadcasting. I hope that the matter will be sorted out in a couple of months. Meanwhile, I am sending you a cheque for Rs.2,000; a similar amount will be sent next month also.

Yours sincerely,

(Indira Gandhi)

Shri Firaq Gorakhpuri,
8/4, Bank Road,
Allahabad-2.

باوا کرشن گوپال مخمور

۸۰ کلنٹن روڈ، فیئر فیلڈ، نیو جرسی ۰۰۰۶،
امریکہ

شہادتِ عظمیٰ

یہ راہِ امن میں شمعیں جلا رہی تھی کون — سلامتی ہی کا نغمہ سنا رہی تھی کون
یہ کس پہ خنجرِ بیداد آہ! تیز ہوا — یہ کون عنصرِ شر آج فتنہ خیز ہوا
یہ کس نے بات نہ کی انتہا پسندوں سے — یہ کس نے صلح نہ کی شیطنت کے بندوں سے
نہ گولیوں ہی کی پروا، نہ تیغ و خنجر کی — یہ کس نے راہِ صداقت میں جاں نچھاور کی
لہو میں ڈوب گیا پھول سا بدن کس کا — یہ تختۂ گل و لالہ ہوا کفن کس کا
یہ کس کے خون کی چھینٹیں بنیں بہارِ شفق — عجیب ہے رنگِ حنا بندیٔ نگارِ شفق
یہ کس نے موت کو بے باک ہو کے دعوت دی — یہ کس سے شان بڑھی رتبۂ شہادت کی
یہ شعلہ زارِ شہادت بنی چتا کس کی — یہ سنگِ میلِ ارادت بنی چتا کس کی
یہ کس کے غم میں ہیں پُرنم ہزار ہا آنکھیں — یہ ڈھونڈتی ہیں کسے حسرت آشنا آنکھیں
تمام روئے زمیں پر یہ کس کا ماتم ہے — بیان ہو نہ سکے جو وہ شدّتِ غم ہے
یہ کون ہو گئی قربان ایکتا کے لیے — یہ کس نے جان لٹا دی فقط وفا کے لیے
یہ کون امن کی دیوی شہیدِ امن ہوئی — فنا بدوش بھی ہو کر نویدِ امن ہوئی!
دلائے گی ہمیں رہ رہ کے کس کی جانبازی — ادائے فرض شناسی و کار پردازی
فغاں کہ گاندھی و نہرو کی یادگار مٹی — سیاسیات کے گلزار کی بہار مٹی

تھی خوبیوں سے جو تابندہ اندرا گاندھی
رہے گی تا بہ اَبد زندہ اندرا گاندھی

یہ بابِ تلخ تریں کون بھول پائے گا — سیاہ باب یہ تاریخ میں بھی آئے گا
دلوں کے زخموں کا اب اندِمال کرنا ہے — سلامتیٔ وطن کا خیال کرنا ہے
نہ ہندو سکھ سے جدا ہے نہ سکھ ہی ہندو سے — بسائیں امنِ دل پیار ہی کی خوشبو سے
یہ اتحاد ضروری ہے بہرِ امن و اماں — وگرنہ دشمنِ جاں ہو گی گردشِ دوراں
نہ سلب ہو کہیں اپنے وطن کی آزادی — نہ خانہ جنگی کے باعث ہو اپنی بربادی
ہمارا ایک وطن ہے، ہماری قوم ہے ایک — ہر اختلاف کے باوصف ساری قوم ہے ایک!
ہمیں خیال رہے وقت کی نزاکت کا — قدیم رشتۂ اخلاص کا، رفاقت کا
جو کشت و خوں ہوا وہ لائقِ ملامت ہے — دلوں میں خیر کا جذبہ ابھی سلامت ہے

ہم ایک ہیں، ہمیں آپس میں مل کے رہنا ہے
خوشی کے ساتھی ہیں، دکھ ایک ساتھ سہنا ہے

والی آسی

ایک نظم اندرا گاندھی کے نام

میں کہ ہر دور میں قتل ہوتا رہا
خاک اور خون میں جسم تڑپا کیا
میرا احساس اور کردار بھی
میری آواز بھی قتل کردی گئی
قاتلوں کو مگر یہ خبر ہی کہاں
کوئی احساس اور کوئی کردار ایسا نہیں
جو فنا ہو سکے،
کوئی آواز ایسی نہیں
جو فضاؤں میں زندہ نہ ہو
میرا احساس سقراط کا نام ہے
میرا کردار سرمد کا الزام ہے
میں حسینی قبیلے کی آواز ہوں
اور یہ آواز اک سچ کا پیغام ہے
قاتلوں کو مگر یہ خبر ہی کہاں
اب بھی زندہ ہوں میں ـــ اب بھی زندہ ہوں میں

عارف عباسی گورکھپوری
سول کورٹ
گورکھپور (یوپی)

ترے لہو کے چراغ

چمن میں آج ترے خوں کا ایک اک قطرہ
کہیں پہ لالہ کہیں نسترن کہیں ہے گلاب
روش روش ہیں فروزاں ترے لہو کے چراغ
یہی ازل سے مقدر ہے جاں فروشوں کا
کہیں پہ طوق و سلاسل کہیں پہ دار و رسن
کہیں پہ گوشۂ زنداں کہیں پہ تیغ و کفن
ترے لہو سے مگر سُرخ ہے ردائے چمن
ترے لہو سے بہاروں کو مل گیا ہے ثبات
ترے علم کو لیے اب دیارِ مقتل سے
چلیں گے پھر سے نئے کاروانِ جادۂ شوق
اسی ادا سے اسی بانکپن اسی دھج سے
قدم قدم پہ جلائے ترے لہو کے چراغ
نفس نفس میں کھلائے تری وفا کے گلاب
کہ ان کے دل میں ابھی رقصِ آرزو ہے وہی
شعورِ غم ہے وہی گردشِ لہو ہے وہی

اے۔بی۔اے غنی خاں چودھری
(سابق وزیر ریلوے)

ترجمہ: انور علی صدیقی

اتّحاد اور یک جہتی کی علمبردار

گاندھی جی کا انتقال امن کے علمبردار کی حیثیت سے ہوا۔ اندرا جی کی موت ہندستان کے اتحاد، سالمیت اور یک جہتی کے علمبردار کی حیثیت سے ہوئی۔ ہندستان کے اتحاد اور سالمیت کے سلسلہ میں شاید ہی کسی فرد واحد نے اتنا شاندار کردار ادا کیا ہو جتنا آنجہانی اندرا گاندھی نے ادا کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے عوام ان کے مقدس آدرشوں پر عمل کریں گے۔

میں بلا تفریق مذہب و ملت اور سیاسی وابستگیوں سے قطع نظر سبھی سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ موجودہ چیلنجوں کا متحد ہو کر مقابلہ کریں۔

ہندستان کئی ایسے ملکوں سے گھرا ہوا ہے جو ہمارے نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض ہندستانی بھی ایسے ہیں جو سابق وزیر اعظم کے آدرشوں کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب اپنا دل ٹٹولیں۔ یہی وقت ہے جب ہمیں اپنے بحران کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ میں آپ سب سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کے ہاتھ مضبوط کریں جو اندرا گاندھی کے آدرشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کسی اقلیتی فرقہ کو اندرا گاندھی سے بہتر دوست میسر نہ ہوا ہوگا۔ اقلیتوں کو یہ بات محسوس کرنا چاہیے اور موجودہ وزیر اعظم کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے محکمۂ توانائی اور اس کے بعد ریلوے وزارت میں کابینی وزیر مقرر ہونے کے باعث مجھے اکثر ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ خصوصاً گزشتہ دو برسوں میں انھوں نے ریلوے نظام کی توسیع و ترقی سے متعلق مجھ سے تبادلۂ خیال کیا۔ انھیں کے ایما پر ریلوے اصلاحات کمیشن مستقبل کے لیے خاکہ تیار کر رہا ہے۔

ریلوے سے متعلق پہلا بڑا جلسہ جس میں وہ شریک ہوئیں کٹیہار میں منعقد ہوا تھا —— اس موقع پر بڑی کٹیہار بڑی لائن کا افتتاح ہوا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے میرے محکمہ کی کارکردگی کی تعریف کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ "ہمارے وزیر ریل اپنا کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ ایک بار انھیں کوئی کام سونپا جاتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور جب تک وہ کام پورا نہ ہو جائے وہ چین نہیں لیتے۔ کام کے معاملے میں وہ سخت ہیں اس لیے اپنے افسران میں مقبول نہیں ہیں۔" اگرچہ انھوں نے یہ بات بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہی تھی لیکن اس سے انتظامی امور اور میرے محکمہ کے متعلق ان کی گہری معلومات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اتنے بڑے ملک کا وزیر اعظم اتنی تفصیلی معلومات کا حامل ہو، یہ امر میرے لیے حیران کن ہے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں۔ "ہندوستان جیسے ملک میں کیا ہم ریلوے کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ہماری ریلیں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ عوامی خدمت انجام دیتی ہیں۔ چنانچہ ریلوے جیسی بڑی سروس کے مفادات کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم اس کی فکر نہ کریں تو اس سے عوام کو پریشانی ہوگی۔ دراصل یہی جذبہ تھا جس نے ریلوے وزارت میں ہماری رہنمائی کی۔ چنانچہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پچھلے کچھ برسوں میں اس محکمہ کی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ متعدد ٹرینوں کا اضافہ کیا گیا۔ نئے ریلوے اسٹیشن تعمیر کیے گئے۔ ہم نے جو بھی ترقیاتی پراجکٹ شروع کیا اس کا سرچشمۂ تحریک ان کی دور اندیشی اور حوصلہ افزائی تھی۔

کلکتہ میں میٹرو ریلوے اور سرکولر ریلوے کا آغاز ان کی حوصلہ افزائی اور تحریک کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس پراجکٹ کو قوم کے نام وقف کرنے کے لیے ۸ نومبر کو کلکتہ آئیں گی۔ اگرچہ قاتلوں کی گولیوں نے انھیں ہم سے چھین لیا ہے لیکن ان کی روح ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہے گی۔

•••

جسٹس مرتضیٰ حسین
لوک آیکت اترپردیش لکھنؤ

عالمی امن کی علمبردار

نہ جانے کس حوصلہ مند جان چمن کے تیور دیکھ کر ثاقب لکھنوی نے فرمایا تھا ؎

پتے پتے سے نالے نکلیں تو مجرم جاننا
ذبح میں بولوں تو پھر رنگ گلستاں دیکھنا

مگر آج ان کا یہ شعر شریمتی اندرا گاندھی کے سانحۂ قتل کی مکمل تفسیر ہے۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو قریب ۱/۲ ۹ بجے صبح جب اندرا جی اپنی قیام گاہ سے لے جہے دفتر جارہی تھیں تو ان ہی کے حفاظتی دستے کے دو سپاہیوں نے ان پر ریوالور اور اسٹین گن سے گولیوں کی بوچھار کردی۔ وہ انتہائی نازک حالت میں اسپتال پہنچائی گئیں جہاں چند گھنٹے موت وحیات کی کش مکش میں گزرے۔ قریب ۱/۲ ۲ بجے دن کو ان کی موت کا اعلان ہو گیا۔ ان کا جنازہ جس دھوم سے اٹھنا چاہیے تھا اٹھا اور لاکھوں مقامی اور بیرونی سوگواروں کے سامنے روایتی انداز میں آگ کے شعلوں کے سپرد کردیا گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کی راکھ پاسبان اور اونچے پربت ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں پر بکھیر کر ان کی بلندی کا مستقل ثبوت بن گئی۔

زندگی اور موت ایک ہی سکۂ حیات کے دو رُخ ہیں۔ جو اس دنیا میں آتا ہے کبھی نہ کبھی موت سے بغلگیر ہوتا ہے البتہ مرنے والے کی شخصیت اور اس کی موت کا عنوان کبھی افسانۂ موت کی رنگینی بڑھادیتے ہیں کبھی گھٹادیتے ہیں۔

شخصیت کے اعتبار سے اندرا جی جواہرات کی اس کان کا انمول ہیرا تھیں جسے "نہرو خاندان" کہتے ہیں۔ یہ خاندان اپنی شائستگی اور نفاست کے لیے مشہور تھا اس کے افراد کا ایمان حُبّ الوطنی۔ مسلک انسان دوستی اور چلن خدا ترسی رہا ہے۔ اسی گھرانے میں اندرا جی آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ پلیں اور بڑھیں۔ مہاتما گاندھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ جواہر لال نہرو۔

اور شریمتی کملا نہرو کے سے بزرگوں کے ہاتھوں ان کی فطری صلاحیتوں کا نکھار ہوا۔ نسل، ماحول اور تربیت کے اس حسین امتزاج کی بدولت جو خوبصورت شخصیت ابھرنا چاہیئے تھی وہی اندرا جی تھیں۔ اُن کی بے رحمانہ، سفاکانہ اور غیر متوقع موت نے ہندوستان ہی کے رہنے والوں کو نہیں ساری دنیا کے انسانوں کو ہکا بکا کر دیا۔ ہر ایک کا یہی تاثر ہے کہ ان کی ایسی عظیم خاتون، بیدار مغز سیاستداں۔ عالمی امن کی علمبردار اور دانشمند رہنما کی موت سے جو خلا واقع ہوا ہے وہ مشکل سے بھرا جا سکے گا۔

اندرا جی کی موت کا یہ بھی ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحان اور تخریبی طاقتوں کی تیز رفتاری کے خلاف انکی مسلسل آگاہی کے باوجود ان عناصر کا مناسب تدارک نہ ہو سکا اور بالآخر وہی ان کی موت کا سبب بنے۔

اس سانحے سے ہندوستان کے عوام میں غم و غصے کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ تھوڑی بہت ہنگامہ آرائی بھی سمجھ میں آ سکتی تھی مگر جس شدت اور بربریت کا ردعمل دیکھنے میں آیا وہ بھی بہت تشویشناک ہے۔ کسی فرقے کے چند افراد کا از خود یا دوسروں کے ہاتھ کھلونا بن کر ایک شرمناک حرکت کا مرتکب ہونا کسی طرح ان کے سارے فرقے کو مجرم نہیں بنا سکتا۔ انتقام بے جا کے جوش میں جس طرح بہت سے بے گناہوں کو مارا اور جلایا گیا اور ان کی املاک برباد کی گئی وہ ایسے ملک کے رہنے والوں کے لیے باعث ننگ ہے جہاں سے ہمیشہ روحانیت کا پیغام دیا گیا اور جہاں کی ساری آبادی کسی نہ کسی مذہب کو مانتی ہے اور ہر مذہب انسانوں کو میل محبت۔ صلح آشتی اور عفو و درگذر کا سبق دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ خدا کرے ہم اندرا جی کی قیمتی جان کھو کر اور اپنے ہاتھوں ملک کی سیکولرسا کھ گنوا کر آئندہ کے لیے سبق لیں اور اپنے مذہب کے اچھے پیرو اور ملک کے اچھے شہری بنکر اس طرح رہیں کہ سیکولرزم صرف ہمارے دستور کی زینت نہیں بلکہ ہماری زندگی کا چلن بن جائے یہاں یہی طرز زندگی ملک کے اتحاد و سالمیت کی ضمانت اور اندرا جی کے لیے صحیح نذرانۂ عقیدت ہوگا۔

٭

حکیم مسعود احمد عباسی مُبَصّر امروہوی
یونانی ڈسپنسری شاہ پیر گیٹ میرٹھ

اندرا گاندھی کے نام

مٹ نہیں سکتا مٹانے سے ترے روشن وقار
ایکتا پر دیش کی تو نے کیا خود کو نثار
امن و صلح و آشتی کی تھی تو اندرا پاسدار
تیرے اٹھ جانے پہ ہے اب ساری دنیا سوگوار
ولولے اور حوصلے تیرے نمایاں ہوگئے
خون کے قطرے ترے رنگ گلستاں ہوگئے

قطعات

تجھ میں پوشیدہ تھے اسرار رموز مملکت
تیرے عزم کو کہن سے سج گئے دار و رسن
اپنے ہاتھوں سے سنواری تو نے زلف حریت
تیری ہستی پر نہ کیوں نازاں ہوں ہم اہل وطن

خون دل دے کے چراغوں کو جلایا تو نے
ملک کو غیر کی یورش سے بچایا تو نے
مرتے دم تک نہ کہا دھوپ کو سایا تو نے
اپنے زخموں کو تبسم میں چھپایا تو نے

تسنیم فاروقی

بنتِ گلاب

سب نے سورج مکھی کی طرح جس کی تعمیل کی
اسکے چہرے کا سورج بہت دور تک سرِ حدِ شام سے
چھوڑ کر اپنی کرنیں در و بام پر جگمگانے کی تلقین کرتا ہوا
چھپ گیا۔
جب اندھیرا گھرے جب ضرورت پڑے خاکبوسی کو ہر
صبح آنا یہاں۔
تاکہ ماحول کی نرم شاخوں میں امید کے پھول کھلتے رہیں
روشنی، امن، ایجاد کی چھاؤں میں
کارگاہوں میں کھیتوں میں صحراؤں میں
وادیوں کوہساروں میں دریاؤں میں
اس کے پیکر کی کچھ ریشمی خاک ہے
ریشمی خاک جو ان گنت ماؤں کے رخ کا غازہ بنے
ارضِ سیمیں پہ آئینہ خانے سجیں
تاکہ ہر آئینہ اجلی آغوش سے
کچھ نئے خال و خد کا مشاہد بنے
کچھ نئے خواب بننے کا سامان دے
اور نئی زندگی کو ترقی ملے
اور نئی روشنی کا نیا دور ہو

ممتاز نانک پاری
۳۳۔ میاں پور
جون پور (یوپی)

نامِ روشن سے شعاعِ زندگی آتی رہے

کیسی سلگتی آگ سے چھایا ہے یہ کیسا دھواں
غمناک تو پہلے نہ تھی ایسی فضائے آسماں
طوفانِ گرد و باد تو پہلے بھی آئے ہیں بہت
سورج کی ڈس لیں روشنی ایسی نہ تھیں وہ آندھیاں
خاموشیوں میں ہر طرف گم صم سی کیسی گونج ہے
آنکھیں ہیں نم کس کے لیے سانسوں میں کیوں ہیں سسکیاں
تھی ضامنِ امن و اماں جو روشنی جاتی رہی
کوئی بھی اب ایسا نہیں فخرِ وطن فخرِ جہاں
جس نے دکھائی راہ تھی وہ مشعلِ رہ بجھ گئی
کشتی میں تھی رفتار جس سے وہ نہیں اب بادباں
کچھ اس طرح ہم پھنس گئے سیلاب کے گرداب میں
وسعت میں اب بہنے لگی ندی بھی بھر بے کراں
روڑے بہت سے آ گئے ہیں ارتقا کی راہ میں
یعنی الجھ کر رہ گئے ہم صدمۂ جانکاہ میں
عورت تھی لیکن اس کی ہمت ہمتِ مردانہ تھی
اس ہمتِ مردانہ میں اک جرأتِ رندانہ تھی
اور جرأتِ رندانہ میں اک حسنِ محبوبی بھی تھا
لگتا ہے خود وہ شمع ہے گو شمع کا پروانہ تھی
وہ چاہنے والی تھی سب کی چاہتے تھے سب اسے
سب کے لیے وہ مر مٹی وہ قوم پر دیوانہ تھی
اس کی جبیں پر زلف کی گو لٹ پریشاں ہی رہی
لیکن جنوں میں ہوش کی اس نے نگہبانی بھی کی
اس ہوش کی اے دوستو آؤ نگہبانی کریں
مضبوط تر ہو ایکتا وہ سعیٔ امکانی کریں
جو پردۂ شب تن گیا اس میں ستارے ٹانک دیں
ظلمت کدے میں آؤ پھر سے نور افشانی کریں
آؤ عمل ایسا کریں تیرہ شبی جاتی رہے
اور نامِ روشن سے شعاعِ زندگی آتی رہے

آنجہانی اندرا گاندھی کے بیس نکات

ہاشم سیدنپوری
۱۲۴۔ حسنے والی گلی لکھنؤ

آگ اب سرد ل کی مچھلی کی طرح پانی میں ہے
زندگی آرام و آسائش کی نگرانی میں ہے
رقص کرتا ہے سکونِ زندگانی ہر طرف
ختم ہوتی جارہی ہے بدگمانی ہر طرف
اتنی خوشحالی نظر آئے گی جتنا سوچئے
اندرا گاندھی نے ایسے بیس نکتے دیدیئے
ایک اک نکتہ ہے تصویرِ حیاتِ معتبر
آرہا ہے جس سے مستقبل ہمیں شاداں نظر
دور تک محرومیوں کا اب کہیں سایہ نہیں
کھل گیا جو پھول پھر وہ کھل کے مرجھایا نہیں
ملک سے اب نوحہ خوانی کا زمانہ چل بسا
جو زباں پر عام تھا قصہ پرانا چل بسا
اب مزے پر آگئی ہے زندگی کی داستاں
زندگی خود ہوگئی ہے زندگی کی پاسباں
اب کوئی محتاجِ آب و گل نظر آتا نہیں
آج پہلے کی طرح سے غم کوئی کھاتا نہیں
ہر نظر میں نور ہر چہرہ خوشی کی داستاں
زندگی خود کہہ رہی ہے زندگی کی داستاں
مل گئیں آسانیاں اور پا گئی صنعت فروغ
دور تک ملتا نہیں ہے اب کہیں لفظ دروغ

پل ہوئے تعمیر کتنے اور سڑکیں بن گئیں
آبیاری یوں ہوئی پیڑوں کی شاخیں تن گئیں
کھل گئے اسکول لاکھوں ہوگئی تعلیم عام
طالبِ علم اب سمجھتا جاتا ہے اپنا مقام
کثرتِ اولاد سے اب لوگ گھبرانے لگے
کنبہ بندی کی طرف کھنچ کھنچ کے خود آنے لگے
قرض داروں کو ملی اب قرض خواہوں سے نجات
ہوگئی ہے اب سبکدوشِ الم ان کی حیات
مطمئن دل ہو رہا ہے اور انساں شاد شاد
کہہ رہی ہے ہر نظر ایمان داری زندہ باد
روز اپنے دیش کی رفتار بڑھتی جائے ہے
روز اب کھیتوں کی پیداوار بڑھتی جائے ہے
پھول کے مانند اب محروم دل ہنسنے لگا
چین سے ہر اک بشر اپنی جگہ رہنے لگا
دور ہوتی جائے ہے رشوت ستانی کی وبا
عام ہوتی جائے ہے ایمانداری کی ادا
اب زمیں جس کی ہے اس کی ملکیت ہو جائیگی
بعد اس کے اس کی اولادوں کے بھی کام آئیگی
بے زمیں جو لوگ تھے ان کو زمینیں مل گئیں
دست کاروں کو سہولت اور مشینیں مل گئیں

کوئی مالک اب کسی پر ظلم کر سکتا نہیں
کوئی بھی مزدور اب فاقوں سے مر سکتا نہیں
آدمی کو اب کوئی مجبور رکھ سکتا نہیں
کوئی بھی بچے پہ اب مزدور رکھ سکتا نہیں
پست طبقوں کی بھی تقدیریں بنائی جائیں گی
کم جو زرعی اجرتیں ہیں وہ بڑھائی جائیں گی
بہہ رہا ہے ہر طرف اب آبیاری کا جمال
بنتا جاتا ہے زمینِ ہند پر نہروں کا جال
شہر کی مانند دیہاتوں کو بھی چمکائے گی
روز اب بجلی کی پیداوار بڑھتی جائے گی
ب بنائے گی مری سرکار اک تازہ پلان
جلد ہی اب ہاتھ کے کرگھے میں پڑ جائے گی جان
دست کاروں کی مرادیں خودبخود مسکائیں گی
صنعتیں اب اتنی صنعت کی حد میں آئیں گی
ضابطے میں آئے گا در آمدی ہر لائسنس
ہر طریقے اور ہر پہلو سے اب ہوگا ڈفنس
جائدادیں ہیں جو ناجائز وہ لے لی جائیں گی
دور بنام ملک و ملت وقف کر دی جائیں گی
ٹیکس کی چوری نہ اب کر پائے گا کوئی یہاں
اب سکونِ زیست ہوگا شیش محلوں کا نشاں
اب زمیں جو ہے خصوصی تو مہیا ہی جائے گی
شہر کے ساتھ اس کی حد بندی کرا لی جائے گی
اب نہ مانگے گا کوئی مالک سے اپنے حق کی بھیک
مل میں اب مزدور بھی ہوگا برابر کا شریک
جس جگہ پر مال گاڑی سے نہ ساماں جائے گا
اس جگہ تک ساز و ساماں اب ٹرک پہنچائے گا
حتی الامکاں دور ساری الجھنیں کی جائیں گی
سب کو انجم ٹیکس میں آسانیاں دی جائیں گی
اب سکوں پائیں گے طلبا سرپرست ان کے قرار

ہوسٹل کی زندگی میں آنے والا ہے سدھار
ہونگی سستے داموں پر درسی کتابیں دستیاب
دور ہوگا اب قلم دوات کاغذ کا عذاب
زندگانی ہو نہ پائے گی کسی صورت سے بار
سارے بیکاروں کو اب ہوگا مہیا روزگار
ملک میں ہر سمت خوشحالی نظر آئے گی اب
ہر طرف کشتِ تمنا دل کی لہرائے گی اب
راستے سے حادثے اب خود ہی کترا جائیں گے
اپنی اپنی منزلیں اب قافلے پا جائیں گے
زندگی اب روشناسِ زندگی ہونے کو ہے
آدمی اپنی جگہ پر آدمی ہونے کو ہے
موجِ غم طوفان میں امداد فرمائے گی اب
کشتیٔ امید ساحل پر نظر آئے گی اب
ہند کے دستور کو دستور کس نے کر دیا
ملک سے بغض و تعصب دور کس نے کر دیا
روز ملک و قوم کی تقدیر ابھرتی جائے ہے
کون ہستی ہے جو اپنا کام کرتی جائے ہے
نعمتوں سے دامنِ امید سب کا بھر دیا
کس نے میرے حال و مستقبل کو روشن کر دیا
کام کرتی جا رہی ہے کس کی چشمِ دوربیں
یہ حقیقت ہے کہ اب اس کا کوئی ثانی نہیں
نعمتِ لعل و جواہر سے وطن کو بھر دیا
کس نے دورِ بیکسی کو دورِ زریں کر دیا
صبح سے اس کو غرض کوئی نہ مطلب شام سے
خود بخود ظاہر ہے اس کا نام اس کے کام سے
ملک کی خدمت میں مصروف آخری دن تک رہیں
اس لیے ہیں اندرا خاتونِ اوّل بالیقیں
ملک و ملت کے ہر اک انساں کو لا کر ہوش میں
سو رہی ہیں اندرا تاریخ کی آغوش میں

قائل اب صاحبہ ہوا اس بات کا سارا جہاں
اب حقیقت میں ہوا ہندوستاں ہندوستاں

واقف رائے بریلوی
۱۰، سپر مارکیٹ
رائے بریلی

شامِ وطن

دھواں دھواں

مکھڑے پہ تیرے صبح کی شوخ کرن دھواں دھواں
صبحِ وطن لہو لہو شامِ وطن، دھواں دھواں
موجِ صبا بدل گئی، بادِ خزاں میں ڈھل گئی
شاخِ گلاب جل گئی، حسنِ چمن دھواں دھواں
جیسے فضا کی آنکھ میں، اشک سے ہیں بھرے ہوئے
گھاٹ اداس اداس ہیں، گنگ و جمن دھواں دھواں
شام اداس، بیقرار، پھولوں کی آنکھ اشکبار
شعلہ بہ شعلہ آشیاں، سرو و سمن دھواں دھواں
جوشش میں ہوش کھو گئے، حادثے کتنے ہو گئے
بات ہے تیری بے اثر، میرا سخن دھواں دھواں
لٹتی ہے کس کی زندگی، مٹتی ہے کس کی روشنی
لٹتا ہے کس کا کارواں، خوابِ وطن دھواں دھواں
آگ سے کیا ملا تجھے، آگ سے کیا ملا مجھے
میرا بھی من دھواں دھواں، تیرا بھی من دھواں دھواں

پونچھیے اشک، چھوڑیئے، رشتوں کو پھر سے جوڑیئے
ایک بدن ہے یہ چمن، سارا چمن دھواں دھواں

مظہر رائے بریلوی
۱۰، سپر مارکیٹ
رائے بریلی

فصیلِ کشورِ ہندوستاں، ترا مسکن

سلام کرتی ہوئی صبحِ انتظار گئی
تمام گریہ و غم، شام بیقرار گئی
ترے نقوشِ قدم کہہ رہے ہیں تیرے ساتھ
ترے شعورِ ریاست کی رہگزار گئی
ترے تدبرِ بے انتہا کے چرچے ہیں
ترے ہر ایک خیالِ رسا کے چرچے ہیں
سیاستوں کے سمندر میں ایک ناؤ لیے
رواں دواں جو تھی! اس ناخدا کے چرچے ہیں
فصیلِ کشورِ ہندوستاں، ترا مسکن
بھلا سکے گی نہ تجھ کو یہ سرزمینِ وطن
بکھر گئے ہیں جو گنگو تری پہ پھول ترے
چمن چمن وہ کھلائیں گے نرگس و سوسن
تمام حادثۂ روزگار دیکھے ہیں
تمام قہرِ بداماں غبار دیکھے ہیں
لہو لہو ہے چمن، پھر بھی اے چمن والو
بھلا نہ دینا جو خوابِ بہار دیکھے ہیں
نئے شعور کو اب تابدار دیکھیں گے
ہر ایک لمحے کو پھر خوشگوار دیکھیں گے
نیا سویرا ہوا ہے، نئی فضائیں ہیں
امید ہے کہ نئی اک بہار دیکھیں گے

ڈاکٹر راجکمار
سپیٹ روڈ۔ عالم باغ
لکھنؤ۔

تربیت گاہ بھی جوہر ذات کے لیے

ایک پُرشکوہ عمارت جو اپنے مکینوں کے تموّل کا قصیدہ پڑھ رہی ہے۔ ایک مہمان خاتون کی موجودگی میں کچھ زیادہ ہی سر پُر غرور اٹھائے دکھائی دے رہی ہے۔ خاتون اپنی سہیلی کی اکلوتی پوتی کے لیے ایک بدیشی فراک لائی ہیں۔ میزبان اپنی مہمان سے کہتی ہیں۔ "تم تو جانتی ہو ہم لوگوں نے بدیشی کپڑے کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا برا ماننے کی بات نہیں ہے یہ فراک واپس لے جاؤ" مہمان خاتون کہتی ہیں۔ "میں تمہارے لیے کب لائی ہوں اگر بچی پہننا پسند کرے تو تمھیں کیا انکار ہے"۔ کافی رد و کد کے بعد یہ طے ہوتا ہے اگر بچی قبول کرلے تو اعتراض نہیں ہوگا بچی بلائی جاتی ہے۔ دادی بڑی شفقت سے اس سے کہتی ہیں کہ "تم جانتی ہو کہ ہم لوگوں نے بدیشی کپڑا چھوڑ دیا ہے لیکن یہ میری سہیلی تمھارے لیے باہر کی فراک لے کر آئی ہیں تم چاہو تو لے لو"۔ بچی انکار میں سر ہلا دیتی ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہتی ہے کہ وہ یہ فراک نہیں پہنے گی۔ مہمان خاتون ازراہِ مذاق کہتی ہیں پھر تم یہ بدیشی گڑیا کیوں سینے سے لگائے لگائے پھر رہی ہو اسے بھی پھینک دو بچی سہم جاتی ہے وہ گڑیا اسے بے حد عزیز ہے۔ مگر مذاق کی کمان سے چھوٹا ہوا تیر سنجیدگی سے اپنا کام کر جاتا ہے — اب وہ چپ چپ رہنے لگی ہے۔ کئی دن بستر پر پڑے پڑے گزر جاتے ہیں۔ گھر والے گھبرا جاتے ہیں یہی ایک چراغ تو سب کے دلوں کا اجالا اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ڈاکٹروں کو دکھایا جاتا ہے مگر بظاہر کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔ آخرکار ایک دن یہ واقعہ رونما ہوتا ہے کہ وہ ماچس کی ڈبیا لے کر اپنی گڑیا کے ساتھ چھت پر چلی جاتی ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے ننھا سا شعلہ بلند ہوتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گڑیا راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اب وہ مطمئن ہے۔ اس کے اندر کا اضطراب ختم ہو چکا ہے اس نے ایک اہم فیصلہ کر کے ذہنی کشمکش سے نجات حاصل کرلی ہے — حالانکہ بعد کی زندگی میں وہ بچی ماچس کی رگڑ سے ہمیشہ خوف زدہ رہی۔ ایسے عمل کا نفسیاتی ردِ عمل اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ منظر میرے ذہن کے نہاں خانہ میں اس طرح محفوظ ہے کہ ایک ایک تصویر اپنے واضح خد و خال کے ساتھ چمک رہی ہے کچھ دنوں سے میں اس منظر میں کھویا ہوا ہوں۔ الفاظ میرے جذبات و احساسات کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں۔ میرے علم نے ایک ایسے صحرا میں لا کر چھوڑ دیا ہے۔ جہاں راتیں بھی دنوں کی طرح تپ رہی ہیں۔ چاند کی ٹھنڈک خدا جانے کہاں چلی گئی ہے۔ میں شاید اپنے موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔ مذکورہ بالا واقعہ پنڈت موتی لعل نہرو کے گھر کا ہے وہ بچی جو اس وقت پریہ درشنی اور اندو کے نام سے پکاری جاتی تھی وہی اندرا گاندھی بنی۔ وہ اندرا گاندھی جس نے شاہراہِ حیات پر عزم و حوصلہ شجاعت و دلیری فہم و دانش کے ایسے چراغ روشن کیے جن کے اجالے آنے والی نسلوں کی رہبری کرتے رہیں گے۔ اور یہ بتاتے رہیں گے کہ اجتماعی مفاد انفرادی فائدہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ملک و قوم کے لیے اپنی جانِ عزیز بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔

اندرا جی زندگی بھر تیز رفتار رہیں۔ وہ نئی اور پرانی قدروں کے

استزاج کا پیکر تھیں۔ پرانی قدروں میں وضعداری خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ جاتے جاتے یہ وضعداری بھی انھوں نے برقرار رکھی۔ زندگی جیسی تیز رفتاری' وہی چلتے چلتے اچانک ٹھہر جانا اور پھر یکدم چل دینا۔

ہمارا ملک خوش قسمت ہے' ہم بحیثیت قوم سربلند و عظیم ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں شاندار تہذیبی روایتیں ملیں ایک شاندار علمی ورثہ ملا لائق صد احترام رہبر ملے۔ مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو' اور محترمہ اندرا گاندھی نے جس انداز میں قیادت کے فرائض انجام دیے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بین الاقوامی سطح پر جو صورت حال ہے وہ انتہائی خطرناک ہے۔ جہاں جنگ کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں۔ وہاں سرد جنگ کی فضا طاری ہے، تصور سے کہیں زیادہ مہلک اسلحہ کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔ اسلحہ جب بنائے جاتے ہیں تو فروخت کرنے کے لیے منڈیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ ایسے حالات پیدا کیے جاتے کہ قوت خرید نہ ہونے کے باوجود انھیں مجبوراً خریدا جائے ان حالات میں اپنے آپ کو گروہ بندی سے محفوظ رکھنا' اپنا قومی وقار قائم رکھنا اپنی آزادی کا تحفظ' اپنے ملک کی سالمیت' زندگی کے تمام شعبوں میں خود کفیل بننے کے لیے مناسب اقدامات اور اندرونی طور پر خود کو مضبوط رکھنا۔۔۔ یہ کام آسان نہیں تھے لیکن اندرا جی ان دشوار و خارزار مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزریں کیا مجال کہ قدم لڑکھڑاتے یا رفتار میں کمی آتی انھوں نے بار بار یہ کہا تھا کہ "میں عظیم نہیں ہوں' بھارت عظیم ہے۔ میں بلند نہیں ہوں ہمالیہ بلند ہے تقدس تو گنگ و جمن کے لیے ہے۔ علم کا سرچشمہ سرسوتی ہے مجھے ان سے نسبت خاص ضرور ہے۔ اسی لیے ایک طاقت ایک حوصلہ ایک عرفان ضرور مجھے عطا کیا گیا ہے۔ جس سے کام لے کر میں ملک و قوم کی خدمت کر رہی ہوں اور مرتے دم تک اسی طرح کرتی رہوں گی"۔ اس وقت مجاہد اعظم یاسر عرفات کا یہ جملہ مجھے یاد آرہا ہے کہ "میں اپنی بہن کے بغیر ہندستان کا تصور نہیں کر سکتا"۔ یاسر عرفات شاعر نہیں ہیں وہ عملی اور سائنٹفک ذہن رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کا یہ جملہ ان کے جذبات کے ساتھ بعض ایسے حقائق کا بھی آئینہ دار ہے جس سے مخالفین بھی آنکھیں نہیں چرا سکتے۔ حقیقت یہ ہے اندرا جی نے قوم کو احساسِ کمتری کے غاروں سے نکال کر خلا کا مسافر بنا دیا۔ خلا جس کی وسعت لامحدود ہے۔ جہاں ستاروں کی کروڑوں دنیائیں آباد ہیں۔ اندرا جی جس کام کے لیے آئی تھیں اسے تکمیل کے مرحلوں تک پہنچا کر چلی گئیں اور اب وقت ہمیں آواز دے رہا ہے۔

اندرا گاندھی کے نام

دردکا رشتہ

رونق زیدی
۲۱۱ - سروجنی نائیڈو ہال
علی گڑھ

یہ کیسا درد کا رشتہ
یہ کیسا غم کا رشتہ ہے
ہزاروں آنکھ پُرنم ہیں
کروڑوں دل شکستہ ہیں
زمیں سہمی ہوئی ہے
آسماں ساکت کھڑا
سمیٹے دل کی دھڑکن کو
ندی' نہریں' سمندر اور بھی صحرا
ہوائیں چیرتیں احساس کا سینہ
چٹختی دل کی آوازیں
دہکتا خون کا لاوا
اندھیرے کی چٹانیں کاٹنے والا
وہ شعلہ بجھ گیا کیسے۔۔؟
سنہری صبح تھی
سُورج ڈھل گیا کیسے۔۔؟
اُفق تابہ اُفق
یہ کس نے ڈال دی ہے دھند کی چادر

مترجمہ: سہیل احمد

ایک بیٹی ہزار بیٹوں سے بھی آگے

۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو جب اندرا گاندھی کا جنم ہوا تھا، ان کی دادی نے کچھ بجھی بجھی آواز میں کہا تھا! یہ تو لڑکی ہو گئی۔ ...... اندرا کے دادا پنڈت موتی لال نہرو نے جواب دیا! "دیکھنا، جواہر کی یہ بیٹی ایک ہزار بیٹوں سے بھی آگے نکلے گی!"

اندرا گاندھی ایسے تاریخی عہد میں پیدا ہوئیں جس میں تشدد سے پاک عدم تعاون صرف ایک کورا اصول نہیں تھا، بلکہ وہ ایسا ہتھیار بننے والا تھا جس نے ہندستان کو آزاد کرایا۔ لیکن اس وقت اس بات کے امکانات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ والدین ان کا نام "پریہ درشنی" رکھنا چاہتے تھے، لیکن دادا۔ دادی نے "اندرا" نام طے کیا۔ اندرا لکشمی کو کہتے ہیں لیکن ان کی پردادی کا نام بھی یہی تھا۔ چنانچہ ان کا نام اندرا پریہ درشنی رکھا گیا اور خاندان کے قریبی لوگوں کے لیے وہ "اندو" تھیں۔ کئی سال بعد اندرا گاندھی نے اپنے دادا موتی لال نہرو کے بارے میں لکھا تھا۔ ایک مضبوط آدمی کے طور پر میں اپنے دادا کی عزت کرتی تھی اور زندگی کے تئیں ان میں جس طرح کا جوش تھا ـــــ اس سے مجھے بہت پیار تھا۔ یہ خوبی بعد میں میرے والد میں بھی آئی۔ سب سے زیادہ جس چیز کا اثر مجھ پر پڑا، وہ تھا میرے دادا کا لڑکپن ـــــ جسمانی طور سے نہیں، بلکہ اس شکل میں کہ جیسے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لینا چاہتے تھے۔ وہ جس طرح ہنستے تھے وہ مجھے بہت اچھا لگتا۔ بچپن میں اندرا نے دادی کے علاوہ سارے خاندان کو جیل جاتے ہوئے دیکھا انھوں نے کانگریس سیوا دل میں بھرتی ہونے کی کوشش کی لیکن اس وقت وہ کمسن تھیں۔ اس لیے انھوں نے پڑوس کے بچوں کو جمع کیا اور کمسن بچوں کی فوج تیار کی تاکہ بڑے کارکنوں کی تھوڑی بہت مدد کر سکیں اس دستہ کا نام تھا 'بانر سینا'۔ بچوں کا یہ بریگیڈ سیوا دل کے کارکنوں کے درمیان ضروری پیغام رسانی کے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔ کوئی اس پر غور نہیں کرتا تھا کہ پولیس لائن میں کوئی چھوکرا گھوم رہا ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے بچے بھی کوئی کام کر سکتے ہیں۔ وہ بچے بات رٹ لیتے تھے اور متعلقہ شخص کو جا کر بتا دیتے کہ دیکھئے یہ کرنا ہے یا یہ نہیں کرنا ہے پولیس وہاں موجود ہے اور فلاں آدمی گرفتار ہونے والا ہے۔ یا اسی طرح کی خبریں ایک طرح سے ہم نے بھی

خفیہ یونٹ کے طور پر کام کیا کیونکہ تھانے کے باہر بیٹھے پولیس کے لوگ اکثر تازہ صورتحال پر بات چیت کرتے رہتے تھے۔ کون گرفتار کیا جانے والا ہے، کس کے یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے' وغیرہ۔
باہر کھیلنے والے چار پانچ بچے یہ سب سنتے اور تحریک کے لوگوں تک خبریں پہنچا دیتے۔

جیل میں موتی لال نہرو نے بانر سینا کے بارے میں سن کر اندرا کو لکھا تھا: بانر سینا میں تمہارا کیا مقام ہے؟ میرا مشورہ ہے کہ اس کا ہر ممبر ایک ایک پونچھ لگائے اور سینا میں جس کا جتنا بڑا عہدہ ہے اس کی اتنی ہی لمبی دم ہونا چاہیے ہنومان کی تصویر والا بیج لگانا بہتر ہے، لیکن دھیان رہے کہ ہنومان کے بائیں ہاتھ والی گدا نہ دکھائی جائے۔ گدا کا مطلب ہے تشدد اور ہماری سینا تو عدم تشدد پر عمل پیرا ہے......

۱۹۳۱ء کی جنوری کا پہلا دن اندرا کو امید اور خوشی دینے کے بجائے اور بھی زیادہ اکیلے پن میں ڈال گیا۔ جواہر لال نہرو نے جیل سے اندرا کو لکھا کہ جب انھوں نے کملا نہرو کی گرفتاری کی خبر سنی تب سے وہ ان کے اور اندرا کے بارے میں سوچ رہے ہیں: مجھے یقین ہے ممی خوش اور مطمئن ہوں گی، لیکن تم شاید اکیلی ہو گئی ہو گی۔ ہر پندرہ دن میں ایک بار تمہیں ممی سے ملنے آنا چاہئے اور ایک پندرہ دن میں مجھ سے۔ اور تم ہم دونوں کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچاؤ گی۔ لیکن میں قلم کاغذ لے کر بیٹھوں گا اور تمہارے بارے میں سوچوں گا اور پھر تم چپکے سے میرے پاس آؤ گی اور ہم بہت سی چیزوں کے بارے میں بات کریں گے۔ ہم ماضی کے سپنے دیکھیں گے اور نئے راستے تلاش کریں گے تاکہ ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے بھی بڑا ہو سکے۔

نہرو نے جیل سے جو بھی خطوط اندرا کو لکھے ان میں یہی جذبہ کار فرما تھا۔ ان خطوں میں انھوں نے اندرا گاندھی کو سائنس کی اہمیت اور تاریخ و ثقافت کو سمجھنے کا سلیقہ سکھایا۔ اندرا جیسی تن تنہا ننھی لڑکی کے لیے یہ خطوط خزانہ کی طرح تھے۔ ان خطوں میں نہرو نے ملک کے لوگوں کے متعلق بھی کئی باتیں لکھیں۔ ایک اور رویہ جو ہندستان میں دیکھنے میں آتا ہے وہ ہے پیچھے کی طرف دیکھنا، آگے کی طرف نہیں۔ ہم ان بلندیوں کو دیکھتے رہتے ہیں جنھیں ہم سر کر چکے ہیں، انھیں نہیں جنھیں ہمیں سر کرنا ہے۔

فروری ۱۹۳۱ء میں موتی لال نہرو کی وفات نے اندرا کی زندگی کے تنہائی کے احساس کو اور بھی بڑھا دیا۔ ماں کملا کی صحت پھر سے گرنے لگی تھی اندرا کی تعلیم کے بارے میں جواہر لعل بہت فکر مند تھے۔ گاندھی جی کے مشورہ پر انھوں نے اندرا کو پونا میں پیوپلس اون اسکول میں داخلہ کرا دیا۔

اندرا نے کئی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی جن میں الٰہ آباد کا سینٹ سیسیلیس کانونٹ بھی شامل تھا۔ لیکن گاندھی جی اس بات کے خلاف تھے کہ اندرا گاندھی کو کسی انگریزی اسکول میں پڑھایا جائے۔ چنانچہ انھیں مسوری کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا اس کے بعد ان کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ جرمنی گئیں۔ یہ انھیں دنوں کی بات ہے جب ان کی ماں کملا ابھی جرمنی کے بیڈن ویلر سینی ٹوریم میں تھیں تو اندرا گاندھی کی زندگی میں فیروز گاندھی نام کا نوجوان پارسی آیا۔ ان کا تعلق بھی الٰہ آباد ہی سے تھا اور تحریک عدم تعاون میں بھی وہ شرکت کر چکے تھے۔

جرمن شاعر ارنسٹ ٹولر کی بیوی کرسٹینا نے ایک بار اندرا گاندھی کے متعلق لکھا تھا: وہ ایک ننھے پھول جیسی ہیں جسے ہوا اڑا لے جا سکتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اندرا ہوا سے نہیں ڈرتی۔

جن دنوں اندرا آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھیں، وہ برس ان کی زندگی کے انتہائی خوشگوار سال تھے۔ خصوصاً وہاں کے اساتذہ اور اپنے ساتھی انھیں بہت پسند تھے۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں انھیں پلورسی ہو گئی اور انھیں وہاں کے ایک اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اسپتال والوں نے رائے دی کہ وہ علاج کے لیے

سوئزرلینڈ چلی جائیں. لیکن تبھی یورپ میں طویل جنگ چھڑنے کے آثار نمایاں ہوئے اور جواہر لعل نہرو نے خواہش ظاہر کی کہ بجائے اس کے ان کی بیٹی اس لمبی جنگ کے دوران سوئزرلینڈ میں رہے، وہ ہندستان واپس آجائے۔ ملک واپس ہوتے ہوئے اندرا کا جہاز ایک ہفتہ کے لیے کیپ میں بھی رکا۔ جب وہاں آباد ہندستانیوں کو پتہ چلا کہ جہاز میں اندرا ہیں تو انھیں جہاز سے اپنے علاقے میں لے گئے۔ وہاں اندرا گاندھی کو پہلی بار اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ کر احساس ہوا کہ جنوبی افریقہ میں آباد ہندستانی اور افریقی لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ اندرا نے وہاں کے ہندستانیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ جی جان سے اس دھرتی کے افریقی بھائیوں کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرلیں۔

آنند بھون میں اندرا کی واپسی ان کے لیے ایک تکلیف دہ حادثہ تھا دادی فوت ہو چکی تھیں۔ والد جواہر لال نہرو جیل میں تھے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک بار جب وہ اپنے والد سے دہرہ دون کی جیل میں ملنے گئیں تو انھوں نے اپنے والد کو بتایا کہ وہ فیروز گاندھی سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ والد نے انھیں ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اندرا اپنے ارادے سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ وہ فیروز سے پیار کرتی تھیں اور ان ہی سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اس سے والد کو مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا: "شادی انتہائی ذاتی معاملہ ہے اور اس کا آخری فیصلہ متعلقہ فرد پر ہی چھوڑا جانا چاہیئے۔" مارچ ۱۹۴۲ء میں اندرا کی شادی الہ آباد کے آنند بھون میں فیروز سے ہوگئی۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا اور اندرا گاندھی لکھنؤ اور دہلی کے درمیان برابر آتی جاتی رہیں۔ لکھنؤ میں ان کے شوہر فیروز گاندھی تھے اور دہلی میں ان کے والد جواہر لال نہرو۔ ملک کی آزادی کے ساتھ بڑے بھیانک فسادات بھی شروع ہوگئے تھے۔ ایک بار اندرا کو معلوم ہوا کہ پرانی دلی کے ایک مسلم خاندان کی زندگی خطرہ میں ہے تو وہ بغیر کسی پولیس پارٹی کے اپنی جیپ میں وہاں پہنچ گئیں۔ وہ جھونپڑپٹی کا علاقہ تھا۔ چاروں طرف سے ہتھیاروں سے لیس گروہ اس علاقے کو گھیرے ہوئے تھے۔ اندرا ان کے درمیان سے چلتی چلی گئیں۔ بھیڑ میں سے گالیوں کی بوچھار تو ہوئی لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اندرا کو روک سکے یا ان پر ہاتھ اٹھا سکے وہ سیدھی اس مسلم خاندان کی جھونپڑی میں گئیں۔ انھیں اپنے ساتھ لیا اور اپنی جیپ میں لے آئیں ان کی زندگی کا یہ صرف ایک تنہا واقعہ نہیں بلکہ ایسے متعدد واقعات سے ان کی زندگی پر تھی۔

جواہر لال نہرو کے انتقال سے ملک کی سیاست کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ نہرو کے بعد لال بہادر شاستری ہندستان کے وزیر اعظم بنے لیکن جب وہ بھی چل بسے تو جیسے پورے ملک پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ وزیر اعظم کی کرسی کے کئی دعوے دار تھے اور اندرا اس مقابلے میں بالکل شامل نہیں تھیں بلکہ انھیں ذرا بھی اس بات کا خیال نہیں تھا کہ یہی لمحہ ان کی قسمت کا لمحہ بھی ہے اور آخر جب انھیں یہ خبر دی گئی کہ لال بہادر شاستری کی جگہ انھیں سنبھالنا پڑے گی تو سب سے زیادہ حیرانی خود اندرا کو ہوئی تھی۔

(ہندی روزنامہ "جن ستا" سے ماخوذ)

●●● ———

کرشن چندر

ایک بہادر عورت

● یہ مضمون اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار آنجہانی کرشن چندر نے بہت پہلے لکھا تھا۔ اب نہ کرشن چندر اس دنیا میں ہیں، نہ اندرا جی چنانچہ یہ مضمون تاریخی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے، اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ —ایڈیٹر

گذشتہ پچاس برس کے ہندوستانی اتہاس میں جن عظیم تاریخ ساز ہستیوں کے بغیر ہماری سیاسی. معاشی اور سماجی زندگی کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا وہ ہیں مہاتما گاندھی. پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی.

مہاتما گاندھی نے ہمارے غلام ملک میں آزادی کی راہیں ہموار کیں. عوام کے دلوں میں پرامن مگر بے خوف جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا. پنڈت جواہر لال نہرو نے بتایا کہ صرف سیاسی آزادی ہی کافی نہیں ہوتی. معاشی آزادی اور ترقی کے بغیر ایک خوشحال معاشرہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی اس لیے انھوں نے معاشی آزادی کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے اپنی ذہانت اور طاقت کا پورا زور صرف کر دیا. مسز اندرا گاندھی ان اصولوں پر نئے ہندستان کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کیلیے ہر ممکن جدوجہد کر رہی ہیں.

ظاہر ہے کہ یہ کام چند مہینوں یا چند برسوں میں مکمل نہیں ہو سکتا. صنعتی یوروپ کی ترقی یافتہ صورت جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ چار سو برس میں مکمل ہوئی ہے. امریکہ کی خوشحالی کو اس منزل تک پہونچنے میں ڈیڑھ سو سال لگ گئے. سوا سو برس جاپانی ترقی کے پیچھے ہیں. سوویت روس کی موجودہ خوشحالی کی عمر بھی پچاس برس سے کم نہیں ہے. قومیں کسی جادو کی چھڑی سے ترقی نہیں کرتیں. جہد در جہد عوام اور حکومتیں مل کر خون پسینہ ایک کرتی ہیں تو کہیں خوابوں کی تعبیر ملتی ہے.

مسز اندرا گاندھی نے بھی اپنے ملک کی آزادی، ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھے ہیں. اور اب عوام کی محبت اور چاہت نے انہیں اس مرتبے تک پہونچا دیا ہے جہاں وہ ان خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں. نہرو پریوار کے اوصاف مسز اندرا گاندھی کو بھی ورثے میں ملے ہیں یعنی مستقل مزاجی اور ارادوں کی استقامت. ان دونوں اوصاف کو کام میں لاکر یہ باعمل اور بہادر عورت اپنے عہد حکومت کے پہلے ہی روز سے رجعت پسند طاقتوں سے نبرد آزما ہے اس کی سوچ سیدھی ہے فیصلوں میں تلوار کی کاٹ ہے. جن خوابوں میں پھولوں کی خوشبو ہے جدوجہد کرنے والے ہندستانی عوام کے ساتھ مل کر اس نے بھی وہی خواب دیکھے ہیں. غربت کی جگہ خوشحا لی

جہالت کی جگہ تعلیم کی روشنی بیکاری کے بجائے روزگار کی فراوانی۔ ایک خوبصورت انسان دوست ہندستانی سماج کی تعمیر۔ اس تعمیر میں وقت لگتا ہے بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں پچھلے پچیس برس میں کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں۔ بہت کچھ ہوا۔ اور ابھی بہت کچھ ہونا اور کرنا باقی ہے۔ روشنی کا ہالہ بڑھا ہے اور اندھیرا کم ہوا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ چار سو روشنی ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہے۔

میں سمجھتا ہوں ہماری ترقی کی رفتار اور تیز ہوتی اگر مسز اندرا گاندھی کو غیر ملکی حملوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ان جنگوں میں مسز اندرا گاندھی نے جس دلیری، مستحکم مزاجی اور فیصلہ کن ذہانت کا ثبوت دیا ہے وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ اکیلے بنگلہ دیش کی آزادی کا واقعہ ایسا ہے جو ان کی زندگی میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے عہد حکومت میں ہندستان کی عسکری قوت مضبوط ہوئی ہے اور اس کی سرحدوں کے تحفظ میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

پھر بھی جنگ سے کوئی بنیادی مسئلہ طے نہیں ہوتا۔ نہ خواب مہکتے نہ حسرتیں پوری ہوتی ہیں۔ نہ جہالت جاتی ہے نہ غربت دور ہوتی ہے۔ ان باتوں کو مسز اندرا گاندھی سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کیوں کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خوابوں کی وارث ہیں اسی لیے انھوں نے بین الاقوامی امن اور شانتی کی خاطر اپنے ملک کے چاروں اطراف میں دوستی اور آشتی کیلئے ہاتھ پھیلائے ہیں۔ پاکستان ایران۔ افغانستان۔ سری لنکا۔ نیپال۔ ملیشیا۔ انڈونیشیا ان سب جگہوں پر ہماری طرح کے لوگ بستے ہیں۔ سب کی حسرتیں ایک سی ہیں آرزوئیں ایک سی ہیں۔ مسائل بھی ایک سے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہندستان اور پاکستان کے پسماندہ عوام کے مسائل ایک سے ہیں۔ اس برصغیر سے باہر آس پاس کے ملکوں کے بنیادی مسائل بھی ایک سے ہیں اور یہ مسائل آپسی جنگوں سے حل نہیں کیے جا سکتے اسی لیے مسز اندرا گاندھی کی خارجہ پالیسی شانتی اور آشتی، امن اور ہمدردی، باہمی مدد اور اشتراک کی پالیسی ہے اور اسی پالیسی کو اپنا کر اس خطے کے مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

سائنس اور کلچر کے شعبوں میں بھی ان کی فراست طبع نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ایٹمی قوت کے باب میں ہماری تکنیکی ترقی سے بڑے بڑے ملکوں کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ زراعت میں "سبز انقلاب" بھی انہی کے زمانے میں آیا۔ اور ہزار مشکلات کے باوجود دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کچھ سے کوئی کچھ نہیں سکتا۔ اور ابھی تک کوئی ایسی ایجاد ظہور میں نہیں آئی ہے جو وقت پر پانی برسا سکے اس لیے کہیں پر بارش ہوتی ہے کہیں پر سوکھا پڑ جاتا ہے مگر اب غلے اور اناج کی کمی کے باوجود کسی کو بھوکا مرنے نہیں دیا جاتا۔

ہندی ہماری راشٹریہ بھاشا ہے اس کی نشو ونما اور ترقی کے لیے مسز اندرا گاندھی نے ضروری اقدام کیے ہیں۔ مگر صرف ہندی ہی کے لیے نہیں انھوں نے ہندستان کی ہر بڑی زبان کی نشو ونما اور ترقی کے لیے ایک ایک کروڑ روپے کی خطیر رقم منظور کی ہے ان زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ اردو کے لیے مسز اندرا گاندھی اپنی زبان سے کہتی ہیں کم اور کرتی ہیں زیادہ۔ زبانِ اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے جو کچھ ان کے عہد حکومت میں ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا مزید ترقی کے لیے مسز اندرا گاندھی کا کہنا ہے کہ رائے عامہ کو بھی ہموار کرنا ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے لیے ان کے دل میں بھی وہی درد ہے جو پنڈت جی کے دل میں تھا وہ اردو کی ترقی کے لیے حالات کی نزاکتوں کو جانتے ہوئے بھی ضروری اقدام کرتی رہتی ہیں۔

آج ہمارا ہندستان اندرونی اور بیرونی خطروں سے دوچار ہے۔ اندرونی خلفشار وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو اندرا گاندھی کی پالیسی کے دشمن ہیں اور ہندستان پر انہی طبقوں کو برسر اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں جنھوں نے ہزاروں برسوں سے ہمارے عوام کا استحصال کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس اندرونی خلفشار میں کچھ بیرونی عناصر بھی کام کر رہے ہوں۔ مگر ان تمام خطروں کے باوجود مجھے اگر ایک اطمینان ہے تو یہی کہ ہمارے ملک کی تقدیر ایک بہادر عورت

(باقی ص۱۱۱ پر)

سکندر علی خاں
قلعہ، شاہجہاں پور

پیکرِ حریت متاعِ سلف

پنڈت جواہر لعل نہرو سے محترمہ اندرا گاندھی تک ہزار دلائل اختلاف نظر کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ملک کسی دور میں کمزور رہا ہو یا اس کی ساکھ عالمی سطح پر کم ہوئی ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی حیثیت تو قوم کی تعمیر و تشکیل میں معمارِ اعظم کی رہی ہے۔ شاستری جی کا مختصر دورِ حکومت بھی شاندار روایات کا حامل رہا ہے۔ پھر مسز اندرا گاندھی نے جو کارنامے انجام دیے وہ اپنی ایک الگ تاریخ رکھتے ہیں۔
جس زمانے میں عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں آئی وہ اندیشوں اور وسوسوں کا زمانہ تھا۔ حساس دل دھڑک رہے تھے کہ اتنا بڑا ملک کیسے مستحکم رہ سکے گا۔ مگر اندرا جی نے اپنی خداداد صلاحیت اور بے پناہ ریاضت سے خود اعتمادی کا ایسا ماحول پیدا کر دیا جس نے دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ عام تاثر تو یہ تھا کہ ایک خاتون کس طرح ان گتھیوں کو سلجھا سکے گی جو ملک کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں ——— لیکن جلد ہی عوام و خواص کی زبان پر ایسے جملے آنے لگے کہ اندرا جی ہندستان جیسے گوناگوں مسائل سے دوچار ملک کا واحد مداوا ہیں۔ ان کے اندر ایسی قوت موجود ہے جو طوفانوں کا رخ موڑ سکتی ہے۔ وہ قوم کے دکھ درد کا پورا پورا ادراک رکھتی ہیں اور انھوں نے واقعی اپنے سترہ سالہ دورِ حکومت میں وہ کر دکھایا جو بادی النظر میں ناممکن سا لگ رہا تھا۔ زندگی کے تمام شعبوں پر ان کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی جو کچھ وہ ملک و قوم کو دے گئی ہیں اس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

تیسری دنیا کے لیے اندرا جی ہمیشہ مضطرب و پریشان رہتی تھیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ہر مرحلہ پر ایک قائد کے فرائض انجام دیے۔ ان کی دانشوری مسلّم تھی۔ بڑی طاقتیں بساطِ سیاست پر جو چالیں چل رہی تھیں۔ وہ ان کے دور رس نتائج سے بخوبی واقف تھیں تیسری دنیا کے بیشتر ممالک اس سلسلے میں انھیں کی طرف رجوع ہوتے تھے اور وہ اپنی ذہانت سے سب کا توڑ بتاتی رہتی تھیں ناوابستہ ممالک کی تحریک میں جو رول اندرا جی کا رہا وہ تاریخ کا عنوان جلی بن گیا ہے۔ یہ چیز خداوندگانِ سیاست کو بری طرح کھٹکنے لگی تھی۔ اگر یہ بات کہی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک ایسا نشتر بن گئی تھیں جو بلا شرکت غیرے ساری دنیا پر اقتدار کا منصوبہ رکھنے والوں کی رگِ جاں کو چھوتا رہتا تھا اور جس کی چبھن نے ان کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔
اب جب وہ اچانک ہم سے بچھڑ کر اس جادۂ بے نام کی جانب گامزن ہیں جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔ تو ان کی زندگی ایک فلم کی طرح نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہے کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاید ہمیں سے کچھ بھول چوک ہو گئی جس کی پاداش میں وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منھ موڑ کر چلی گئیں۔ مگر پھر سوچ کی یہ لہر بھی ذہن میں اٹھتی ہے کہ نہیں ایسا نہیں یہ زندگی فانی ہے یہاں کوئی نقش لازوال نہیں ہے۔ ہر ایک بقدرِ توفیق زندگی کے خاکے میں اپنے عمل سے رنگ بھرتا ہے۔ پھر وقت پورا ہونے پر منزلِ عدم کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔
اب یہ الگ بات ہے کہ زندگی زندگی کا فرق ہوتا ہے موت

موت کا فرق ہوتا ہے۔ عمل عمل کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی اس طرح زندہ رہتا ہے کہ ایک محدود دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے اور کوئی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اس کے چلنے اور ٹھہرنے پر زندگی کی گردش کا دارومدار محسوس ہوتا ہے اسی طرح کوئی یوں اس جہانِ رنگ و بو سے سدھارتا ہے تو چند آنکھیں نم ہوتی ہیں چند چہرے سوگوار نظر آتے ہیں اور کوئی اس طرح رخصت ہوتا ہے کہ ساری دنیا غم کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے ان دونوں صورتوں کی بنیاد عمل پر ہوتی ہے۔ عمل کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جائے گا مقبولیت و محبوبیت عالمگیر ہوتی جائے گی۔ کسی نے خوب کہا۔ ؂

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

اندرا جی کے تئیں سچا خراجِ عقیدت یہ ہوگا کہ وہ چراغ جسے انھوں نے خونِ دل و جگر سے روشن کیا، ہم اسے ہمیشہ روشن رکھیں کتنی ہی آندھیاں آئیں کیسے ہی طوفان اٹھیں اس چراغ کی لو مدھم نہ ہونے پائے بلکہ الغرض تو یہ ہے کہ اس کی لو کو اور بڑھائیں کیونکہ یہ چراغ ہے ملک کی سالمیت کا قومی یکجہتی کا، پچھڑے طبقوں کو اوپر اٹھانے کا اور عالمی سطح پر ہندستان کو عظیم سے عظیم تر بنانے کا انھوں نے اپنی آخری تقریر میں کہا تھا کہ میں موت سے نہیں ڈرتی میرے خون کا ہر قطرہ ملک و قوم کی مضبوطی کا باعث ہوگا۔ جو کام مجھے کرنا تھا وہ میں کر چکی اس تقریر کے دوسرے ہی دن وہ موت کی آغوش میں چلی گئیں ان کے خون سے زمین لالہ زار ہوگئی اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کر کے اندرا جی سرخرو ہوگئیں۔ اپنے اسلاف کے سامنے ملک و قوم کے سامنے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا منصب کس طرح ادا ہوتا ہے۔ سادہ کاغذ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ چاہے اپنے حسن عمل سے ہم اسے تاریخ کے اسی باب سے جوڑ دیں جو اندرا جی کے کارناموں سے جگمگا رہا ہے۔ چاہے اسے بے حسی کی نذر کر دیں لیکن یہ سطور لکھتے وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں ناامیدی کا کوئی احساس نہیں ہے۔

●●

آج اترپردیش کی جو ترقی ہو رہی ہے۔ اس کے لیے یہ ریاست اپنی آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی شکر گزار ہے کیونکہ یہاں اقتصادی ترقی کے جو چراغ جل رہے ہیں وہ شریمتی اندرا گاندھی کے ہی دئیے ہیں۔

نرائن دت تیواری —
(وزیراعلا اترپردیش)

ایک بہادر عورت : (صفحہ ۱۰۹ کا بقیہ

کے ہاتھوں میں ہے۔ ایک ایسی عورت کے ہاتھوں میں جس نے آزادی کی جدوجہد میں ہمارے ساتھ مل کر ایک بہتر اور خوبصورت ہند کے خواب دیکھے ہیں۔ اور ان خوابوں سے کبھی آنکھ نہیں پھیری ان ہاتھوں میں ہمارے خواب محفوظ ہیں۔

★

احمد رشید شیروانی
۱۲۔ اے، کناٹ پلیس۔
نئی دہلی۔

اندرا گاندھی عزم و ہمت کی ایک چٹان

شریمتی اندرا گاندھی کو وزیر اعظم کی حیثیت سے ہم نے ان کی پوری آب و تاب کے ساتھ دیکھا ہے۔ کیا کہئے ان کی شان کے۔ ایک بار میں ایک وفد کے ساتھ ان سے ملنے گیا ہم لوگ وقت سے قریب آدھے گھنٹے پہلے پہونچ گئے۔ میرے سامنے ایک اور وفد میں سات حضرات وزیر اعظم سے ملنے اندر گئے اور مشکل سے سات منٹ ان کے ساتھ رہے اور باہر آگئے۔ میں ان میں سے چند ایک کو جانتا تھا میں نے پوچھا کہئے ملاقات کیسی رہی۔ ایک صاحب نے بتانا شروع کیا کہ وزیر اعظم سے ان کی کیا کیا گفتگو ہوئی۔ بتاتے چلے گئے کہ "میں نے یہ کہا تو انھوں نے یہ کہا اور پھر میں نے یہ کہا تو وہ یہ بولیں ......" دوسرے صاحب سے پوچھا تو شروع ہو گئے کہ "جناب میں نے یہ کہا تو وہ یہ بولیں اور پھر میں نے یہ کہا تو انہوں نے یہ جواب دیا ......" پھر تیسرے محترم نے اپنی گفتگو شروع کر دی کہ "اجی میں نے تو یہ کہہ دیا جس پر انہوں نے یہ کہا اور پھر میں نے بھی یہ کہا تو وہ یہ بولیں ......" سات آدمی سات منٹ کے اندر باہر آگئے تھے اور ظاہر ہے وزیر اعظم نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ قریب ایک منٹ بات کی ہوگی۔ اور ایک منٹ میں کسی نے کیا کیا کہہ دیا ہوگا اور وزیر اعظم صاحبہ نے کیا کیا جواب دیدیا ہوگا۔ مگر ان میں سے ہر ایک یوں سرشار تھا کہ جیسے وہ اکیلا وزیر اعظم صاحبہ کم سے کم آدھے گھنٹے گفتگو کر کے آرہا ہو۔

یہ شریمتی اندرا گاندھی کا اعجاز تھا کہ وہ کسی سے دو ایک منٹ بھی بات کر لیتی تھیں تو اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ صرف اسی سے مخاطب تھیں، صرف اسی کی سن رہی تھیں۔

مگر ہمیشہ ایسا ہی نہ تھا۔ مجھے پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم کی وفات کے فوراً بعد کا وہ زمانہ یاد ہے جب اندرا جی شری لال بہادر شاستری کی وزارت میں وزیر نشر و اشاعت تھیں۔ ان دنوں الہ آباد آئیں۔ آنند بھون میں ٹھہریں۔ اتنے بڑے آنند بھون میں تقریباً اکیلی۔ ہم لوگ گئے تو ایک بڑے سے کمرے میں پنڈت جی مرحوم کی تصویر کے پاس بیٹھی تھیں۔ اداس۔ کھوئی کھوئی سی۔ لگتا تھا کہ جیسے یہ یہاں ہیں ہی نہیں کہیں اور ہیں۔ بہت کم بات کر رہی تھیں انکی یہ حالت دیکھ کر دل دکھتا تھا۔

ہم لوگ واپس آئے۔ اسی وقت مجھ سے ملنے کچھ ٹریڈ یونین لیڈر صاحبان آئے میں نے ان سے پوچھا آپ لوگ اندرا جی سے ملے؟ بولے "نہیں تو" میں نے کہا "تو بھائی ان سے ضرور ملئے آخر وزیر تو لوگ بھلے کاہے کے لیے؟" میں نے کہا "ارے بھائی اتنی ترقی پسند ہیں۔ سماج وادی ہیں انقلابی ہیں۔ مزدوروں کی سچی دوست اور یہ لوگ گئے ملنے۔ واپس آئے تو بڑے ناخوش۔ کہنے لگے "ارے صاحب آپنے ہمارا بڑا ٹائم ویسٹ کرایا،" میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو بتایا کہ، "ارے صاحب ہم گئے ہم آدھے گھنٹے تک بیٹھے ان کو اپنے کام اور اپنی

سمیاؤں کے بارے میں بتاتے رہے۔ لگتا تھا جیسے سن ہی نہیں رہی ہیں پھر ہم نے کہا کہ اچھا ہم اجازت چاہتے ہیں تو انھوں نے ہاتھ اٹھا کر نمستے کر دی۔ ہم چلے آئے۔"

اور چند سال بعد وہی اندرا جی تھیں کہ جن سے ایک منٹ مل کر آدمی مہینوں تروتازہ اور خوش و خرم رہتا تھا۔ تب ہی تو کچھ لوگ کہتے تھے کہ دیوی کا پردرشن ہو گیا ہے۔

جب ۱۹۶۶ء میں کانگریس کے بزرگ لیڈروں نے اندرا جی کو وزیراعظم بنایا تو شاید یہی سوچ کر بنایا تھا کہ پنڈت جی مرحوم کے نام اور ان کی یاد کا پورا سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے ووٹ مل جائیں گے اور پھر یہ "گونگی گڑیا" برائے نام وزیراعظم بنی رہے گی اور یہ سب پرانے لیڈر راج کریں گے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ کون نہیں جانتا۔

۱۹۶۷ء کے چناؤ میں کانگریس کئی صوبوں میں ہار گئی۔ یہاں سے لیکر وہاں تک ایک کے بعد ایک صوبے میں مخالف پارٹیوں کا راج۔ اور پھر مرکز میں کانگریس پہلی بار دو ٹکڑے ہوئی تو یہ عالم تھا کہ اندرا جی "مائنارٹی پرائم منسٹر" تھیں۔ یعنی کمیونسٹوں اکالیوں، مسلم لیگیوں اور کچھ علیٰحدہ پارٹیوں کی مدد سے ان کی تھوڑی سی مجارٹی بنتی تھی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کب تک یہ حکومت چلے گی۔ حزب مخالف میں ڈاکٹر لوہیا، گروجتے تھے اور کانگریسیوں کو جو دل چاہتا تھا کہتے تھے۔ کسی کانگریسی کی مجال نہ تھی کہ چوں بھی کرے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے۔ احمد آباد میں سخت فسادات ہوئے تھے۔ میں تب آگرے میں ایک ہندی ڈیلی اخبار کا کام دیکھ رہا تھا۔ میں دہلی آیا۔ سوچا پارلیمنٹ کی کارروائی دیکھتے چلیں۔ وزیٹرز گیلری سے میں نے دیکھا کہ اندرا جی بیٹھی ہیں۔ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔

اٹل بہاری جی نے بھاشن شروع کیا۔ "ادھیکش مہودے، بھارت جل رہا ہے"۔ اچھا؟ بھارت کیوں جل رہا ہے بھائی؟ بیتہ چلا کہ احمد آباد میں بلا وجہ خواہ مخواہ ہندوؤں کے شانتی پورو ک دھارمک جلوس پر حملہ کیا کس نے؟ دیش ورودھی تتووں نے، پاکستان کے ایجنٹوں نے۔ اور ان کی یہ مجال اسلئے ہوئی کہ کیندر یہ سرکار کمزور ہو چکی ہے۔ ناکارہ ہے اور یہ سرکار کیول دیش ورودھی تتووں کے بل پر ہی قائم ہے۔ کیا کہنے ہیں اٹل جی کی قوتِ گفتار کے! بولتے ہیں تو بس بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کسی کانگریسی نے چوں نہ کی۔ میں اندرا جی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کانپ رہی ہیں میں سوچنے لگا۔ یہ حکومت گری تو کس کا راج آئے گا؟ اس ملک کا کیا ہوگا؟ اس ملک میں ہمارا کیا ہوگا؟

پھر اندرا جی بولیں۔ تب بھی لگتا تھا کہ کانپ رہی ہیں: "ادھیکش مہودے۔ جب میں مانیہ سدسیہ مہودے کی تقریر سن رہی تھی تو مجھے آج سے کئی سال پہلے کا زمانہ یاد آیا جب جرمنی میں ایک صاحب تھے جو اسی طرح موقع بے موقع الٹے سیدھے الزام وہاں کی ایک اقلیت پر لگایا کرتے تھے۔ کچھ بھی ہوا کچھ بھی نہ ہوا ایک اقلیت بیچاری ہمیشہ قصوروار ٹھہرائی جاتی تھی۔ اکثریت کو اس اقلیت کے خلاف ہمیشہ ورغلایا جاتا تھا۔ اکسایا جاتا تھا۔ اتیجت کیا جاتا تھا۔ وہ تھے ہٹلر صاحب۔"

کئی لوگ چلا اٹھے۔ ہم کو نازی کہتی ہیں۔ ہمارے لیڈر کو ہٹلر سے ملاتی ہیں۔ شور مچ گیا۔ اندرا جی بول رہی تھیں۔ انکے ہر دو تین جملوں کے بعد کوئی نہ کوئی مداخلت ہوتی تھی۔ کوئی جملہ چھوڑتا تھا کوئی احتجاج کرتا تھا۔ کوئی غصہ دکھاتا تھا۔ کوئی مذاق اڑاتا تھا۔

مگر ایک کمزور عورت جسکی پارلیمنٹ میں اکثریت بھی نہ تھی اور جس کی اپنی پارٹی کے سب لوگ بھی مستحکم طور پر اسکے ساتھ نہ تھے۔ وہ درجنوں گھاگھوں کے خلاف تقریباً تن تنہا کھڑی تھی۔ اور مخالف جتنا شور مچا رہے تھے وہ اتنی ہی مضبوطی کے ساتھ، اتنے ہی عزم کے ساتھ اتنی ہی ثابت قدمی کے ساتھ یہ کہتی جا رہی تھی کہ "یہ دیش کسی ایک سمودائے کا نہیں۔ یہ سب بھارت واسیوں کا ہے۔ یہاں ہم سب مذہبوں کی عزت کرتے ہیں اور ہر ایک مذہب کے ماننے والوں سے محبت کرتے ہیں انہیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اس دیش میں ہم کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ کسی ایک سمودائے کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائے ......" پھر رخنہ اندازی ہوئی۔ پھر شور مچا۔ اٹل جی نے چیلنج کیا کہ "آپ رام لیلا گراؤنڈ میں آ جائیے وہاں میں بھی بولوں آپ بھی بولیے۔ لوگ آپ کی تو صرف شکل دیکھنے آئیں گے مجھے سننے آئیں گے۔ وہیں فیصلہ ہو جائے گا ......"

اندرا جی بڑے دھیرج سے مسکرا کر کہہ رہی تھیں: "بھارت

بہت بڑا دیش ہے۔ اسکی ساری جنتا رام لیلا گراؤنڈ میں نہیں سما سکتی۔ ایسے سو میدانوں میں بھی نہیں سما سکتی۔ مگر بھارت کی جنتا میری بات بھی سن رہی ہے اور مانیہ پردھان منتری کی بات بھی سن رہی ہے اور غور کر رہی ہے اور بھارت کی جنتا فیصلہ بھی کریگی۔ ضرور کرے گی۔ بہت جلدی کرے گی۔ اور جب بھارت کی جنتا فیصلہ کریگی تو شاید وہ فیصلہ مانیہ پردھان منتری کو بہت زیادہ پسند نہ آپائے۔"

میرے دل سے دعا نکلی "یا اللہ تو اس نحیف و ناتواں عورت کی حفاظت کر۔ اسے صحت دے یہی تو ہمارے اور تباہی کے درمیان کھڑی ہے۔"

اور پھر چناؤ ہوا۔ ایک طرف ایک سے ایک جغادری۔ یہ جی اور وہ جی۔ دوسری طرف اندرا جی اور ان کے ساتھ اقلیتیں، سماج کے کمزور طبقے۔ میں یوں ہی نہیں کہہ رہا۔ میں نے پچاس انتخابی حلقوں میں پولنگ بوتھ وائز تجزیہ کر کے یہ آنکڑے سامنے رکھ دیئے تھے کہ ۱۹۷۱ء میں "جو اونچی ذات کے ہندو" کہے جاتے ہیں ان میں سے کم سے کم ستر فیصد نے اندرا جی کے خلاف ووٹ دیئے۔ مگر اندرا جی کو سوئیپنگ وکٹری (جھاڑو پھیر فتح) ملی تو صرف اسلئے کہ اقلیتوں اور سماج کے کمزور طبقوں نے ڈٹ کر جم کر ۱۹۷۱ء میں ان کا ساتھ دیا۔ گھاگھوں کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ "گونگی گڑیا" نے سب کی چھٹی کر دی۔ اور پھر مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب ۱۹۷۷ء میں کانگریس (آئی) شمالی ہند میں ساری سیٹیں ہار گئی۔ بالکل صفایا ہو گیا۔ اندرا جی نے تمام نتیجوں کا اعلان پورا ہونے سے پہلے ہی استعفیٰ دیدیا۔ جنتا راج آگیا۔ تماشہ شروع ہو گیا۔

بہت سے کانگریسی بڑے ناراض تھے۔ کہتے تھے "انھوں نے پارٹی کا بیڑہ غرق کرا دیا۔ یہ ہم سب کو لے ڈوبیں۔" میں نے ایسے ایک بہت محترم لیڈر سے کہا "بھائی صاحب یہ تو ٹھیک ہے کہ پارٹی کا کباڑہ ہو گیا اور یہ لیڈر ہی کی ذمہ داری ہے۔ مگر ذرا یہ سوچئے کہ پارٹی کا کباڑہ تو بڑی حد تک ۱۹۶۷ء ہی میں ہو چکا تھا جب شمالی ہند کے بیشتر صوبوں میں پارٹی ہار گئی تھی۔ اور اس کباڑے کے لیے آپ سب ذمہ دار تھے صرف اندرا جی نہیں۔ اس کے بعد کس نے پورے بھارت کے غریب عوام کے دل جیتے؟ کس نے اقلیتوں اور سماج کے کمزور طبقوں کو پورے کانگریس کے ساتھ باندھا؟ کس نے چوٹکے کے پرخچے اڑائے؟ کس نے ۱۹۸۰ء میں پارٹی کو اتنی شاندار فتح دلوائی؟ ٹھیک ہے اسکے بعد اور خصوصاً پچھلے دو سال میں کئی غلطیاں ہوئیں۔ غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں۔ ہمت نہ ہاریئے۔"

وہ بولے "ارے کون ہمت ہار رہا ہے؟ ہمیں حکومت جانے کا غم نہیں۔ ہم نے برٹش حکومت سے ٹکر لی تھی۔ ہم نے دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے سامراج کا سورج غروب کرا دیا۔ ہمیں اس کا افسوس نہیں کہ ہم ہار گئے۔ مگر جس لیڈر نے جمہوری دنیا کی سب سے بڑی، سب سے عظیم، سیاسی پارٹی کو ہروایا اسے اپنی غلطیوں کا کچھ احساس تو ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا "ضرور ہو گا۔ کیسے معلوم کہ نہیں ہے؟" وہ بولے "خاک احساس ہے؟ میں کل ہی ملکر آیا ہوں۔ ان کو ذرا سا بھی احساس نہیں کہ انھوں نے یہ کیا کر دیا۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ میں گیا۔ شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ دنیا بدل چکی تھی میں نے آداب کیا۔ ہاری ہوئی اندرا جی نے مسکرا کر کہا "کہئے کیسے مزاج ہیں؟" میں نے کہا "ہمارے مزاج تو خدا کے فضل سے اچھے ہی ہیں۔ اتنے سال حکومت کی ہے۔ اب پانچ سال ان کا بھی تماشہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے؟ لیکن مجھے فکر آپ کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔ آپ بہت کمزور لگ رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" فرمایا "طبیعت وبیعت سب ٹھیک ہے مگر پریشان بہت کر رکھا ہے۔ اور مجھے پریشان کریں کوئی بات نہیں۔ ان سب کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ جو کچھ کیا میں نے کیا جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہیں ......"

میں نے بات کاٹی "خیر مجھے پورا یقین ہے کہ جواہر لال نہرو کی بیٹی کے لیے یہ سب پریشانیاں کچھ نہیں۔ خدا نے انھیں اتنی ہمت دی ہے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ وہ ان سب پریشانیوں کو بھگا دیں گی۔ ان کو عقل اور سمجھ بھی خدا نے بہت دی ہے۔ وہ ان سب سے نپٹ لیں گی۔ مگر مجھے صرف آپ کی صحت کمزور دیکھ کر تشویش ہو رہی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہماری پرڈا کی جان کی حفاظت کرے اور انکو صحت مند رکھے۔ بس اگر یہ دو چیزیں عطا ہو جائیں تو باقی سب تو وہ اپنے آپ دیکھ ہی لیں گی۔ عزم و ہمت اور عقل و دانش تو اللہ نے انھیں اتنی دی ہے کہ ......"

بولیں "خیر ہمت تو ہے مگر بھائی عقل و قل سب دھری رہ جاتی ہے۔ اب دیکھئے نا کتنی غلطیاں ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے بات کاٹی "ارے جو شخص کام کرے گا اس سے غلطیاں تو ہونگی ہی۔ غلطیاں نہ کرنے کا تو صرف ایک طریقہ ہے کہ آدمی کچھ کرے ہی نہیں، کوئی فیصلہ ہی نہ لے، کوئی قدم ہی نہ اٹھائے۔ غلطیاں نہیں ہونگی۔ جو شخص کام کرے گا، سو فیصلے کرے گا، سو قدم اٹھائے گا۔ ان میں سے چند ایک غلط تو ہوں گے ہی۔ آپ نے کمزور پارٹی میں پھر سے جان ڈال دی۔ ۱۹۶۶ء میں جو صوبے کھو دیئے گئے تھے وہ پھر آپ نے ۱۹۷۱ء میں جیتے۔ مرکز میں بھی اتنی شاندار کامیابی حاصل کی۔ پھر آپ نے میدانِ جنگ میں اس ملک کو اتنی زبردست فتح دلائی۔ چودہ دن کے اندر آٹھ کروڑ انسانوں کا ایک ملک بنوا دیا۔ بھارت کو نیوکلیر شکتی حاصل کرائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اندرا جی بولیں "ہاں وہ سب ٹھیک ہے مگر کئی غلطیاں ایسی ہوئی ہیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں۔"

میں نے کہا "یہ لیجئے۔ مجھ سے تو ایک صاحب نے کہا تھا کہ اندرا جی کو اپنی کسی غلطی کا بالکل کوئی احساس ہی نہیں۔ میں تو یہی سن کر آیا تھا۔ اور یہاں آپ ہیں کہ بس اپنی غلطیوں ہی کی بات کئے جا رہی ہیں۔"

مسکرا کر بولیں "کچھ لوگ آکر بس غلطیوں کا رونا رونے لگتے ہیں۔ جب ہم اتنی بری طرح گھرے ہیں اور یہ لوگ ہماری چند غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں تو ایسے وقت میں ہم بھی بیٹھ کر بس اپنی غلطیوں پر رونے لگیں تو کیا فائدہ ہوگا؟ اسی لیے کوئی صرف غلطیوں کا ہی ذکر کرے تو اس سے دوسری طرح بات کرنی پڑتی ہے۔"

اور پھر اندرا جی نے ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کیا۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے جتنی طاقتور تھیں، حزب مخالف کی لیڈر کی حیثیت سے اس سے کچھ کم طاقتور نہیں ثابت ہوئیں۔ آدمی ڈبان پانی میں سے ہتھنی پر بیٹھ کر وہ بیلچی پہونچیں۔ یہ سب نیتا لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ اندرا جی نے اپنے مخالفوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ جنتا پارٹی کی حکومت کتنے دن چلی پھر کہاں گئی؟ سب جانتے ہیں۔

میں تو یہاں تک کہونگا کہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب اندرا جی نے سیاسی ہوشیاری کا سب سے بڑا ثبوت دیا۔ ہمت اور جوانمردی کی مثال قائم کر دی۔ آج یہ مقدمہ، کل وہ آفت، پرسوں یہ مصیبت۔ کبھی گرفتاری کبھی کچھ مگر اندرا جی اپنے مخالفوں کو تگنی کا ناچ نچاتی رہیں اور بالآخر ۱۹۸۰ء میں پھر انھوں نے پانسہ پلٹ دیا۔

اندرا جی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ابھی اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میں نہ صحافی ہوں نہ سیاست داں۔ ہاں سیاست کا ایک طالب علم ضرور رہا ہوں اور اپنے آپکو بھارت کا ایک ہوشمند ناگرک کہہ سکتا ہوں۔ میرے بزرگوں نے وطن کی آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا اور میرے تایا پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم کے دوست تھے۔ اسی ناطے ہمیں نہرو خاندان کی محبت اور شفقت حاصل رہی۔ جب پنڈت نہرو مرحوم وزیر اعظم رہے تب اور جب شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ وزیر اعظم رہیں تب ہمیں ایسا لگتا تھا کہ ہماری حکومت ہے ہمارا ہی راج ہے۔

اور پھر تمام ذاتی تعلقات سے قطع نظر یہ بھی حقیقت ہے کہ پنڈت نہرو مرحوم اور شریمتی گاندھی مرحومہ ایسے رہنما تھے جن کے ساتھ اس ملک کے کروڑوں عوام اور خصوصاً اقلیتوں اور سماج کے کمزور طبقوں کے بہت سے لوگ ہم آہنگی اور وابستگی محسوس کرتے تھے۔ "یہ دیش کسی ایک سمپردائے کا نہیں۔ یہ سب بھارت واسیوں کا ہے۔ یہاں ہم سب مذہبوں کی عزت کرتے ہیں اور ہر ایک مذہب کے ماننے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔" یہ ہے ہمارا قومی نصب العین اور یہی پنڈت نہرو مرحوم اور شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کا بنیادی سیاسی مسلک تھا۔ یہی اصول بھارت کے اتحاد، اس کی طاقت، عظمت، ترقی اور خوشحالی کا بنیادی اصول ہے۔

★

کیوبا کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے اپنا ایک وفادار دوست کھو دیا ہے۔

—— فیڈل کاسترو

صلاح الدین نیر

بھروسہ کس پہ کریں۔ اعتماد کس پہ کریں

●

بہت سے ٹوٹے ہوئے آئینوں کے زخم لیے
دل و نگاہ سے وابستہ اک خلش کی طرح
خرد نواز، جنوں آشنا، نظر پرور
کہاں کہاں نہ گئے ہوں گے تشنہ لب پیکر
شعورِ فکر و نظر، تازہ روشنی کے لیے
وفاشناس، شگفتہ سی، زندگی کے لیے

●

ہر ایک دور میں ہم جیسے شاعروں کے یہاں
ہزاروں نغمے لکھے ہیں ہر ایک صبح کے نام
کبھی بہار کے نغمے، کبھی وفا کے گیت
کبھی تو ہجر کا موسم، فراقِ دوست کے نام

●

ہر ایک دور میں ہم جیسے شاعروں نے یہاں
بہت سے ٹوٹے ہوئے آئینوں کے زخم لیے
سمیٹ رکھا تھا لمحوں کی تشنہ کامی کو
ہر ایک صبحِ منور کے واسطے جس میں
ہر ایک چہرہ دکھائی دے روشنی کی طرح
حسین، صاف، تر و تازہ زندگی کی طرح

●

مگر یہ کیا کہ حوادث کا دل بڑھانے کو
سحر پرستوں کے گھر ایسی صبح بھی آئی
کہ جس کے چہرے پہ تھے ان گنت لہو کے نشاں
کہ جیسے ہونے ہی والا ہے حادثہ کوئی

●

ہر ایک دور میں ہم جیسے شاعروں نے یہاں
ہزاروں نغمے لکھے ہیں ہر ایک صبح کے نام
مگر کچھ ایسی لگی اب کے دل پہ گہری چوٹ
کہ جس کے کرب سے موضوعِ گفتگو بدلا

●

بہت سی صبحوں سے رشتہ تو ہے مگر پھر بھی
اس ایک صبح کے دامن پہ لکھ رہے ہیں ہم
لہو سے اپنے اس ہندوستان کی تاریخ
کہ جس کی پہلی کرن، خون میں نہائے ہوئے
فضائے ہند میں ماتم کناں سحر کی طرح
کھڑی ہوئی ہے ندامت سے سر جھکائے ہوئے
کچھ اس طرح سے نگاہوں کو اپنی نیچی کیے
کرن کرن کا لہو پی کے صبح یوں آئی
کہ جس کے بعد اجالوں کا تذکرہ نہ رہا

●

ایک ایسی صبح بھی آئی کہ جس کی چوکھٹ پر
سحر کا نام لیے تشنگی کی سازش سے
محافظوں نے عداوت شناس لمحوں میں
چلائیں گولیاں ہندوستاں کے سینے پر
چلائیں گولیاں اتنی کہ جسم چھلنی ہوا
زمین چیخ اٹھی، آسمان کانپ اٹھا
بھروسہ کس پہ کریں کس پہ اعتماد کریں
قریب تر جو تھا اس نے ہی پہلا وار کیا
بلندیوں میں جو تھا آسمان سے اونچا
زمیں بوس ہوا دفعتاً وہ شیش محل

اندرا گاندھی

یاد دہلوی

اے وطن کی آبرو اے نیک نام
کس کو ہے تیری ذہانت میں کلام
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں
تجھ کو کھو کر خون روتے ہیں عوام
مشعلِ جمہوریت تابندہ باش
تجھ سے روشن ہیں وطن کے صبح و شام
اس ترقی کو ترقی جانیئے
باپ سے بڑھ کر ہوا بیٹی کا نام
ایک جانبدار کے ہاتھوں لٹا
غیر جانبدار ملکوں کا امام
تیرے فیضِ فکر سے اس دیس میں
اوج پر ہے آج جمہوری نظام
جان تک دیدی وطن کے واسطے
اندرا گاندھی تجھے میرا سلام

●

شگفتہ، تازہ لہو، آئینوں سے چھن چھن کر
زمینِ ہند کے دامن پہ پھیلتا ہی رہا
خزاں کے دور میں بھی جو رہا تر و تازہ
وہ پھول بزم میں جو سب سے خوبصورت تھا
وہ پہلی چوٹ سے ہی شاخِ گل سے ٹوٹ گیا

●

یہ المیہ اسی ہندوستاں کے ماتھے پر
ہمیشہ حرفِ ملامت کی طرح ابھرے گا
یہ المیہ، نئے ہندوستاں کی آنکھوں سے
ہر ایک لمحہ کی تاریخ بن کے ٹپکے گا

●

یہ المیہ بھی تسلسل ہے اس فسانے کا
کہ جس کے سارے ہی کردار ہیں پسِ پردہ
کھڑے ہوئے ہیں پسِ دیوارِ شب کئی چہرے
بکھیرتے ہیں ہمیشہ چمن میں زہر کے پھول
بنامِ صبح، سیہ چادروں میں لپٹی ہوئیں
بہت سی شکلیں ابھرتی ہیں رہزنوں کی طرح
بہت سی شکلیں ابھرتی ہیں قاتلوں کی طرح

●

کچھ ایسے ذہن اجالوں نام سے لے کر
کبھی وفاؤں کی صورت کبھی جفا کی طرح
ہمیشہ گھیرے اندھیروں کے آس پاس رہے
ہمیشہ موسمِ گل میں بھی بدحواس رہے

●

صدائیں کتنی ہی نزدیک دور سے اٹھیں
مگر کسی کی بھی آواز دل کو چھو نہ سکی
سنائی دیتی ہے ہم کو تو بس وہی آواز
گلابِ تازہ کی نازک سی پنکھڑی کی طرح
جو تازہ خوشبو کو پیراہنِ بدن میں لیے
اچھوتے لہجے میں تادیر مسکراتی رہی
اجالا بن کے ہر اک سمت پھیل جاتی رہی

●

نظر بلند، صداقت پسند وہ رہبر
شگفتہ ذہن، شرافت نگاہ، دیدہ ور
کرم نواز تر و تازہ زندگی کی طرح
ہر ایک رُت میں رہا ہے یہاں پہ فیض رساں
ہر ایک رت میں اٹھاتا رہا ہے بارِ گراں
زمانہ دیتا ہے قربانیوں کی جس کی مثال
تو اس عظیم گھرانے کی ایسی خوشبو تھی
کہ تیرا نام ہمیشہ جبینِ بھارت پر
حسین چاند کے جھومر کی طرح چمکے گا

●

انا پسند، قلندر مزاج ہم شاعر
کہ جن کو ناز رہا اپنی کج کلاہی پر
کہ جن کا سر کسی قائد کے سامنے نہ جھکا
تری جناب میں اب اپنا سر جھکاتے ہیں
یہ اس لیے کہ ترے جسم سے مہکتی ہے
وفا، خلوص، رواداری پیار کی خوشبو

●

یہ اس لیے کہ ہے تیرے خمیر میں شامل
مہکتے جھومتے ہندوستان کی خوشبو

●

تری جناب میں ہم اپنا سر جھکاتے ہیں
یہ اس لیے کہ ہمیں آبِ زر سے لکھنی ہے
نئی سحر، نئے ہندوستان کی تاریخ

بشیر فاروقی

اندرا — ایک نام

عجب فسردگی چھائی ہوئی ہے چہروں پر
عجیب رنگ ہے شہروں کا اس کے قتل کے بعد
کیا ہے یاد بہت آج سب نے باپو کو
اداس اداس ہیں منظر بجھے بجھے موسم
وطن کی صبح بھی جنگل کی شام ہو جیسے
نظام ملک ہے جیسے کہ ہوں حروفِ صحیح
ہر ایک لفظ کی جاں اس کا نام ہو جیسے

وہ پانچ حرف جو اس لکشمی کے نام میں ہیں
وہ پانچ حرف اہم ہیں حروفِ علت میں
وہ پانچ حرف علامت ہیں آدمیت کے
وہ پانچ حرف علامت ہیں سالمیت کے
اخوتوں کے مساوات کے محبت کے
ہمارا ملک ہے اب ایسا لفظ جس سے اگر
تم اس کے نام کا اک حرف بھی ہٹاؤ گے
تو ایسے لفظ کے معنی بتا نہ پاؤ گے
فروغِ ملک کا خاکہ بنا نہ پاؤ گے
اب اس کا نام ہے تاریخ کا اک ایسا نام
کسی بھی دور میں جس کو بھلا نہ پاؤ گے

حکمت شاد
تحصیل
شاہجہاں پور

بیادِ اندرا گاندھی

اے روحِ عصرِ حاضرِ ہندوستان تو
تیرے وجود سے تھی جہاں میں عجیب ضو

تیرے مزاج میں تھی بہاروں کی تازگی
تیری حیات میں تھی ستاروں کی روشنی

اپنے لہو سے سینچا ہے اس طور سے چمن
بخشا ہر ایک ذرے کو تو نے ہی بانکپن

بجھتے ہوئے چراغ ہوئے ہمکنارِ نور
جن کی لووں کی روشنی پہونچی ہے دور دور

ہوش و خرد پہ چھا گئی یک لخت تیرگی
آئی جو زد پہ موت کی بے وقت زندگی

اس طرح تیرا پیکرِ دلکش بدل گیا
اک آسمان سنگ کے قالب میں ڈھل گیا

اور اب زمین ہند کی بے نور ہو گئی
تیری کمی نگاہ کا ناسور ہو گئی

وقار ناصری

سورج تھا جو ستارا تھا

وہ آفتاب جو روشن تھا آسمانوں میں
اسی کا نور سیاہ آندھیوں نے چھین لیا

جو چاند چہرہ تھا سورج تھا جو ستارا تھا
جو چاشنی کا سمندر تھا جو شرارا تھا
پڑا ہے دھوپ میں اس کا لہولہان بدن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاکِ وطن

وہ تیرا حسنِ سراپا وہ تیرا نام و نشاں
وہ تیرے ماتھے کی بندیا وہ تاجِ زرافشاں
وہ تیرا شہرِ ثریا وہ تیری کاہکشاں
وہ تیری موج وہ ساحل وہ تیرا آبِ رواں
وہ قطرہ قطرہ سمندر وہ نازِ گنگ و جمن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاکِ وطن

وہ خون خون ہوا تیری روشنی کے لیے
وہ زندگی سے گیا تیری زندگی کے لیے
وہ قطرہ قطرہ بہا جسم سے تری خاطر
وہ تیرے نام پہ مر مٹ گیا گلاب تھا جو
وہ قتل ہو گیا ذروں میں آفتاب تھا جو
لہو لہو ہے اسی کا تمام پیراہن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاک وطن

افق افق پہ ابھرتا وہ اک ستارۂ غم
دل و نظر میں فروزاں وہ حسرتوں کا کنول
وہ سونی آنکھوں کا نوحہ اداسیوں کا سراغ
وہ بھیگی پلکوں پہ لرزاں فاقتوں کا چراغ
وہ اشک اشک میں ڈوبی محبتوں کی کرن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاک وطن

وہ آنسوؤں کے جزیرے کا اک دیا روشن
شفق شفق پہ چمکتی ہیں سرخیاں اس کی
لہولہان ہیں آنکھوں میں بستیاں اس کی
ہے اس کے نور سے ساری تری فضا روشن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاکِ وطن

وہ تیری خاک کا پیکر ترا سراپا تھا
وہ چاند چہرہ تھا سورج تھا اک ستارا تھا
ہے چور چور وہ زخموں سے پھول پھول بدن
اسے سنبھال کے رکھنا اے میری خاکِ وطن

●●

منظر محمود آبادی
محمود آباد - سیتاپور

عقیدت کے پھول

قطعات تاریخ وفات

(۱)

یاد کرکے اسے روئے گا زمانہ برسوں
چھپ گئی خاک میں جو رخِ چمن جانِ چمن
ہائے محروم ہوئے اس کی ضیا پاشی سے
وائے گل ہو گئی جو شمعِ شبستانِ وطن
۱۶ ۵۰ ۴۱ ۴۱۰۹ ۸۱۲ ۹۵
۱۴۰۵ھ

(۲)

اندرا گاندھی نے دنیا چھوڑ دی
چاہنے والے نہیں ہیں ہوش میں
جن کے کچھ سپنے ادھورے رہ گئے
یہ وہی ہیں موت کی آغوش میں
۱۵ ۲۱ ۹۵ ۴۴۶ ۳۰ ۱۳۰۷ ۱۰۰
۱۹[illegible]ء

(۳)

بھول سکتے نہیں وطن والے
ہائے اس واردات کا منظر
کاش ہم کو خدا نہ دکھلاتا
اندرا کی وفات کا منظر
۲۵۶ ۳۰ ۴۸۷ ۲۱ ۱۱۹۰
۱۹۸۴ء

●●

معراج فیض آبادی
(سنی وقف بورڈ) لکھنؤ

خوشبو کی تحریریں اجالوں کی صدا

(محترمہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کے چند تاثرات)

صندل کی گونگی لکڑیاں، کہتیں بھی کیا!
یہ کیا ہوا! یہ کیوں ہوا! کیسے ہوا!
جلتی رہی سچ کی چتا
سرگوشیاں کرتا ہوا
پیغامِ امن و آشتی دیتا ہوا
بوجھل دھواں اٹھتا رہا
اور اس دھوئیں کی ہمسفر اک آتما
اک دستِ شفقت اک مجسم ماتا
خاموشیوں کی گود میں اک فلسفہ
خوشبو کی تحریریں اجالوں کی صدا
ننگے سروں پر آدمیت کی ردا
دیتی رہی ہم سب کو جینے کی دعا
صندل کی گونگی لکڑیاں کہتیں بھی کیا
اور خوشبو کی زباں کوئی سمجھتا ہی نہیں
پیار کی، امن کی، ایثار و عمل کی خوشبو
آج کی گود میں پلتے ہوئے کل کی خوشبو
پرسکوں جھیل کی اور تازہ کنول کی خوشبو
چاندنی رات کی اور تاج محل کی خوشبو
اور خوشبو کی زباں کوئی سمجھتا ہی نہیں
لوگ شعلوں کی رفاقت میں دھواں دیکھتے ہیں
آگ میں نور کی تہذیب کہاں دیکھتے ہیں
لوگ کہتے ہیں ہمالہ کا بدن زخمی ہے

برف پگھلی تو کئی آگ کے دریا نکلے
برف کے دل میں مگر آگ کہاں ہوتی ہے!
لوگ کہتے ہیں کہ گنگا کا مقدس پانی
آبلے ڈال گیا پھول سے جسموں پہ مگر
ایسا ممکن ہی نہیں ماں ہے مقدس گنگا
بوڑھی زمیں روتی رہی
لیکن لہو بہتا رہا
اور وقت کا افراسیاب
جادوگروں کی بھیڑ سے
چپکے سے کچھ کہتا رہا
اور اب پاک زمیں کی چادر
اپنے بیٹوں کے لہو سے تر ہے
آنسوؤں سے ہمیں یہ داغ بھی دھونے ہوں گے
صندل کی گونگی لکڑیاں کہتیں بھی کیا!
بوجھل دھوئیں کی ہمسفر اک آتما
شفقت، محبت، سرپرستی، ماتا
کیوں کانپ اٹھی ہے اس کے ہونٹوں پر دعا!
خوشبو کی تحریریں، اجالوں کی صدا
سمجھو ذرا
سوچو ذرا
ٹھہرو ذرا

• • • • •

شریمتی اندرا گاندھی - تصویروں کے آئینے میں

اندرا جی
بچپن میں اپنی والدہ شریمتی کملا نہرو کے ساتھ

اندرا جی بچپن میں اپنے خاندان کے ساتھ
(بیٹھے ہوئے) درمیان میں پنڈت موتی لال نہرو
ان کے دائیں جانب سروپ رانی نہرو اور کملا نہرو
(کھڑے ہوئے) پنڈت جواہر لال نہرو
وجے لکشمی، کرشنا نہرو
بریہ ورشنی اندرا، اور رنجیت پنڈت۔

اندرا جی شری فیروز گاندھی کے
ساتھ، رشتۂ ازدواج میں
منسلک ہونے کے بعد

پنڈت جواہرلال نہرو، راجیو گاندھی اور
سنجے گاندھی کے ساتھ ایک یادگار تصویر

پنڈت جواہرلال نہرو، مستقبل کے ہندوستان کے
معمار راجیو گاندھی
کے ساتھ

پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر راجندر پرشاد
غیر ملکی مہمان کے ساتھ، ۱۳ مئی سنہ ۱۹۶۲ء کو راشٹرپتی بھون میں۔

ہندوستان کے تین آنجہانی وزرائے اعظم

پنڈت نہرو

لال بہادر شاستری

اور شریمتی اندرا گاندھی

پنڈت نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی
سنہ ۱۹۵۲ء میں
پیسلیو باٹنی انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں

پنڈت نہرو اور اندرا جی نومبر سنہ ۱۹۶۳ء میں اسٹاف ڈرائیوروں کے ساتھ، پرائم منسٹر ہاؤس میں

نہرو جی کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں ایک پنسلین فیکٹری میں

اندرا جی
شری لال بہادر شاستری کے ساتھ

نئی دہلی میں ۲۸ مئی ۱۹۶۴ء کو وزیر اعظم
پنڈت جواہر لال نہرو کے آخری سفر کے موقع پر
اندرا جی، لنکا کی اس وقت کی وزیر اعظم
شریمتی بھنڈار نائکے کے ساتھ نظر آرہی ہیں

یہ تصویر بھی اسی موقعہ کی ہے جس میں
اندرا جی مجسمۂ غم
بن گئی ہیں

شریمتی اندرا گاندھی
خان عبدالغفار خان سے
اپنے پوتے کو
لیتے ہوئے۔

اپنی رہائش گاہ میں
پوتی (شری راجیو گاندھی کی صاحبزادی)
کے ساتھ
کھیلتے ہوئے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک اجلاس میں بعض تعزیتی قراردادوں کے بعد دو منٹ کیلئے خاموش و ساکت کھڑی ہیں

میگھالیہ کے روایتی لباس میں

بیرسٹر نور الدّین (مرحوم) ______ اور دلیپ کمار کے ساتھ

لکھنؤ میں سنہ ۱۹۷۱ء میں منعقدہ
آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں
تصویر میں گورنر اتر پردیش شری اکبر علی
مولانا عبدالماجد دریابادی اور ایڈیٹر قومی
عشرت علی صدّیقی بھی نظر آرہے ہیں۔
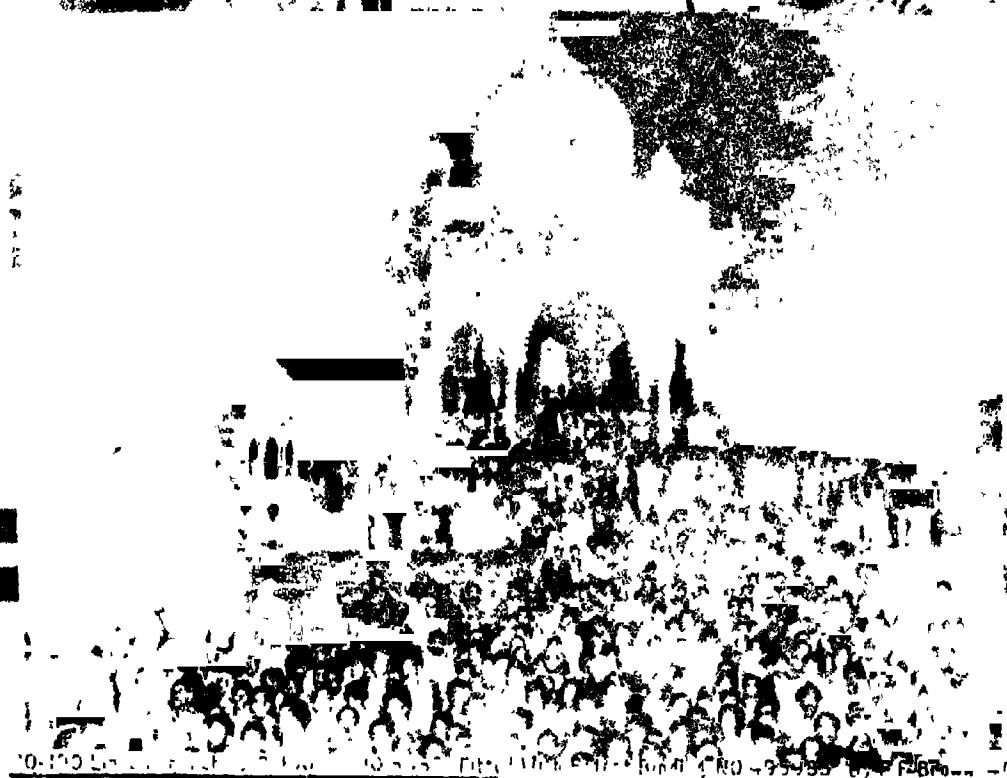
حضرت محل پارک (لکھنؤ) میں ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔ (تصویر منّے بخشی)
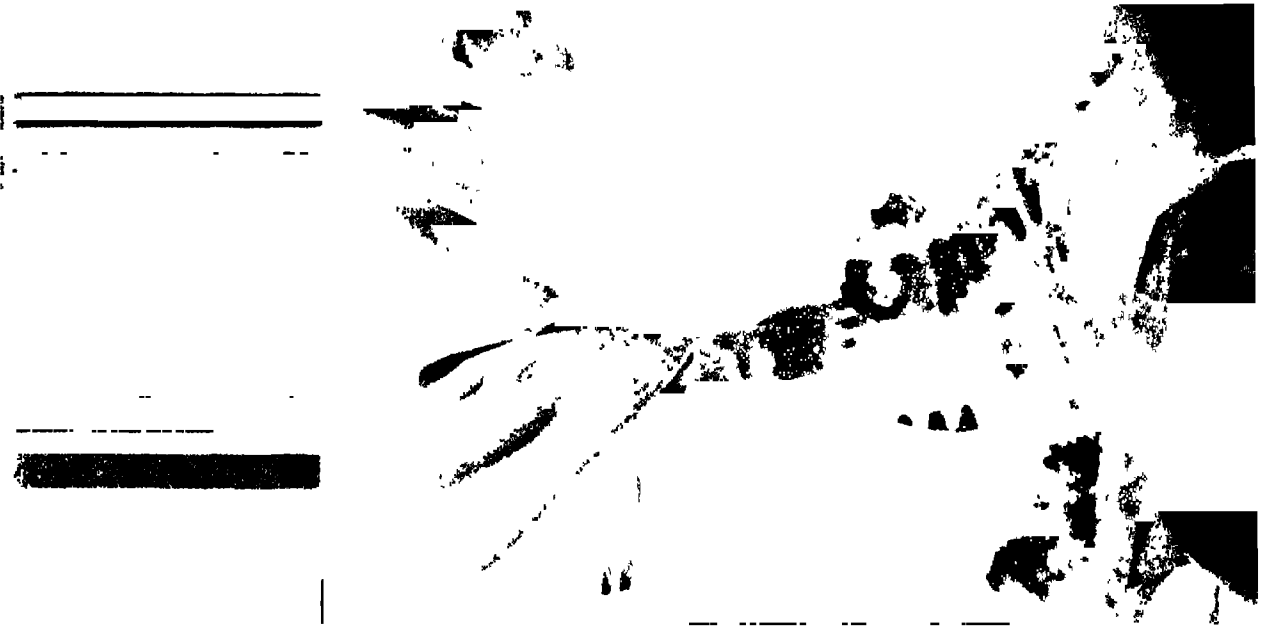
اندرا جی کے کل ہند کانگریس کی صدر منتخب ہونے پر شریمتی محسنہ قدوائی انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے

قرۃ العین حیدر، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور دیگر ادیبوں نیز دانش وروں کے ساتھ

یکم اپریل ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں ساتویں آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس کے موقع پر اندرا جی کو فاطمہ مکرم جاہ قرآن پاک کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے

بّری افواج کے سربراہ جنرل اے، ایس ویدیا کے ساتھ ۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو فوجی کمانڈروں کی کانفرنس کا افتتاح کرنے سے قبل۔

بھیونڈی (مہاراشٹر) میں فساد سے متاثرہ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے

آندھرا پردیش کے دورے کے موقع پر ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وزیر اعلیٰ شری این ٹی راما راؤ، اندرا جی کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔

شری آنند نرائن مُلّاؔ کے شعری مجموعے کی رسمِ اجرا کی تقریب میں مُلّا جی کے ساتھ، گورنر شری اکبر علی خان اور پنڈت کملا پتی ترپاٹھی بھی تصویر میں نظر آرہے ہیں۔

نئی دہلی میں ۵ رنومبر ۱۹۸۳ء کو
جشنِ کشمیر تقریبات کا
اِفتتاح
کرتے ہوئے

بھوبنیشور (اُڑیسہ) میں صدر "وائس آف انڈیا" اُوشا ترپاٹھی
کے ساتھ

نئی دہلی میں ۱۱، اکتوبر سنہ ۸۲ء
"پھول والوں کی سیر" کے
اندرا جی کو
"پنکھا" پیش کیا جا رہا

○
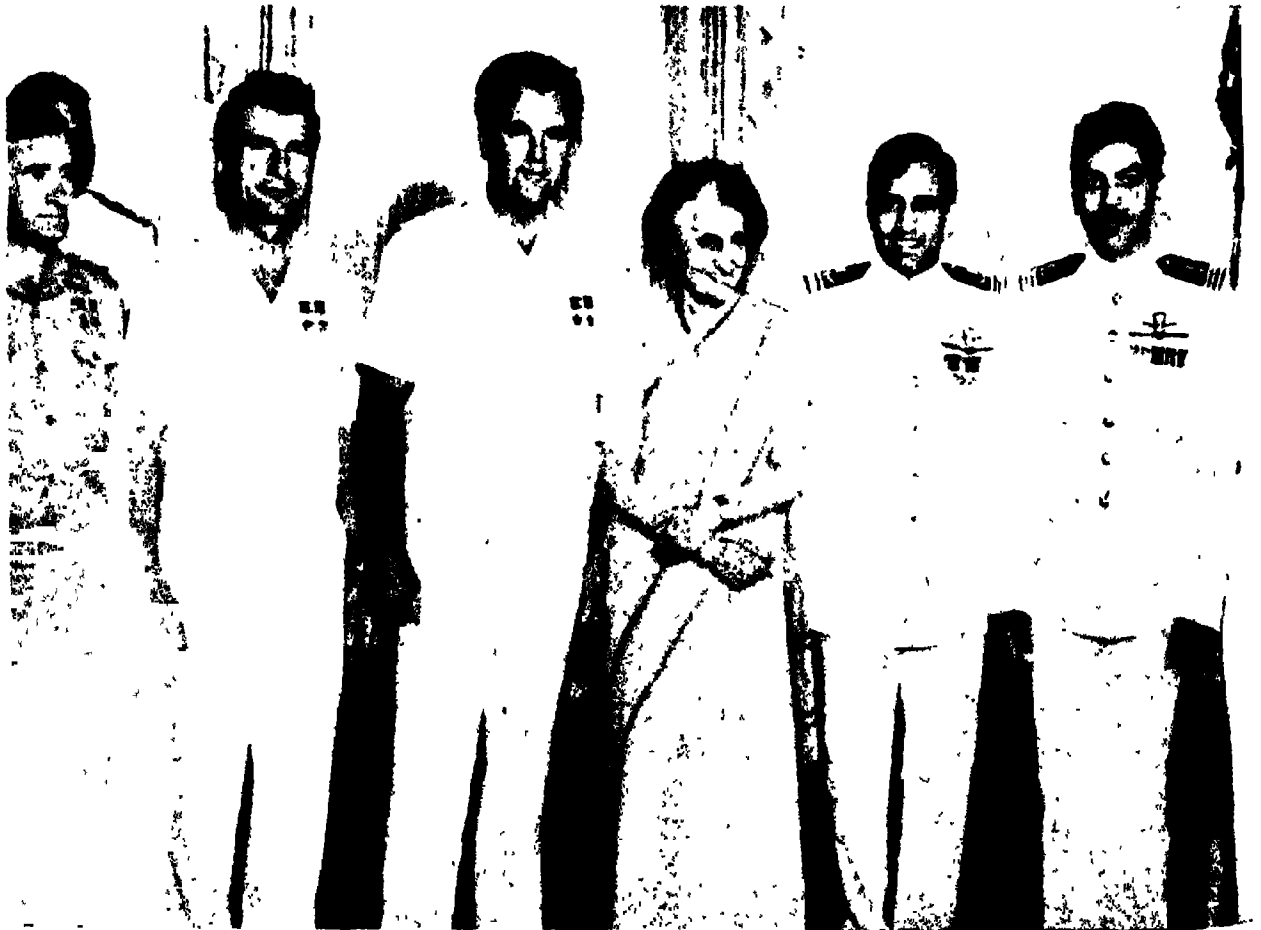
یوگوسلاویہ کے صدر
مارشل ٹیٹو کے ساتھ
ایک یادگار تصویر

نئی دہلی میں ناوابستہ ممالک کی
کانفرنس میں ۷ مارچ ۱۹۸۳ء
کو کیوبا کے صدر
ڈاکٹر فیڈل کاسترو
کے ساتھ

نئی دہلی میں کامن ویلتھ ممالک کی کانفرنس میں ــــــــ

فلسطینی مجاہد اعظم یاسر عرفات کے ساتھ ــــــــ

برطانیہ کی وزیر اعظم شریمتی مارگریٹ تھیچر کے ساتھ ——

بنگلہ دیش کے صدر جنرل ارشاد کے ساتھ، تصویر میں شری ہدایت اللہ بھی نظر آرہے ہیں ـــــــــــــ

برطانیہ کی ملکہ ایلزبیتھ (دوم)
اور ڈیوک آف ایڈن برگ پرنس فلپ
کے ساتھ ـــ
۱۷ر نومبر ۱۹۸۳ء کو، راشٹرپتی بھون
ـــ نئی دہلی میں

عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل شری کلبی کے ساتھ، ۳۱ر جنوری سنہ ۱۹۸۱ء کو نئی دہلی میں

لیبیا کے صدر کرنل معمّر قذافی اور
شریمتی صوفیہ قذافی کے ساتھ
۷، اپریل سنہ ۱۹۸۴ء کو
لیبیا میں

شری راجیو گاندھی کے
ساتھ ،

جگدیش پور (اترپردیش) میں
۴ر مارچ ۱۹۸۳ء کو بھارت ہیوی
الیکٹریکلس لمیٹڈ کے ایک پلانٹ کا
افتتاح کرتے ہوئے۔
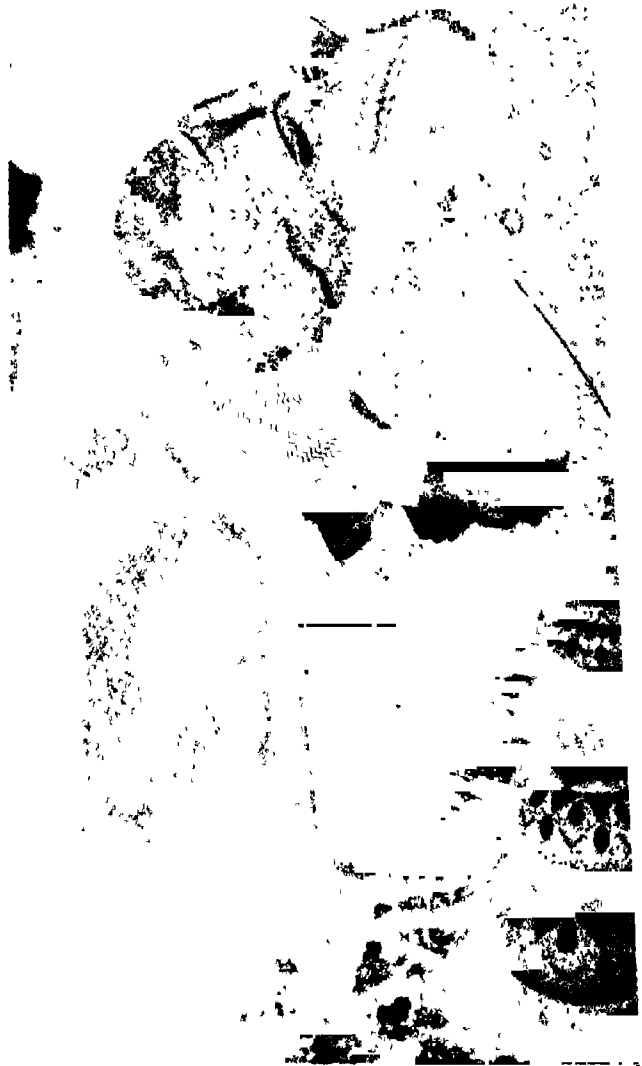
کاکوری (لکھنؤ) میں شہیدوں کی
یادگار کا سنگِ بنیاد
رکھتے ہوئے

صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے ساتھ
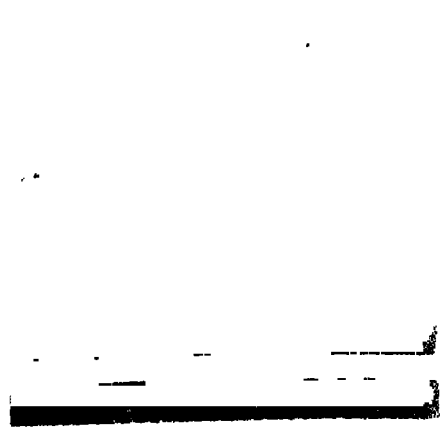
پنڈت کملاپتی ترپاٹھی اور شری
نرائن دت تیواری کے
ساتھ
(تصویر: بشکریہ کاظم رضوی)

موت جینے سے 'تمھیں' روکے گی کیا

آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے باہر اندرا جی کی رحلت کی خبر سن کر خواتین گریہ وزاری کرتے ہوئے۔

صدر جمہوریہ شری گیانی ذیل سنگھ، اندرا جی کی

سمادھی پر

عقیدت کے پھول چڑھاتے ہوئے۔
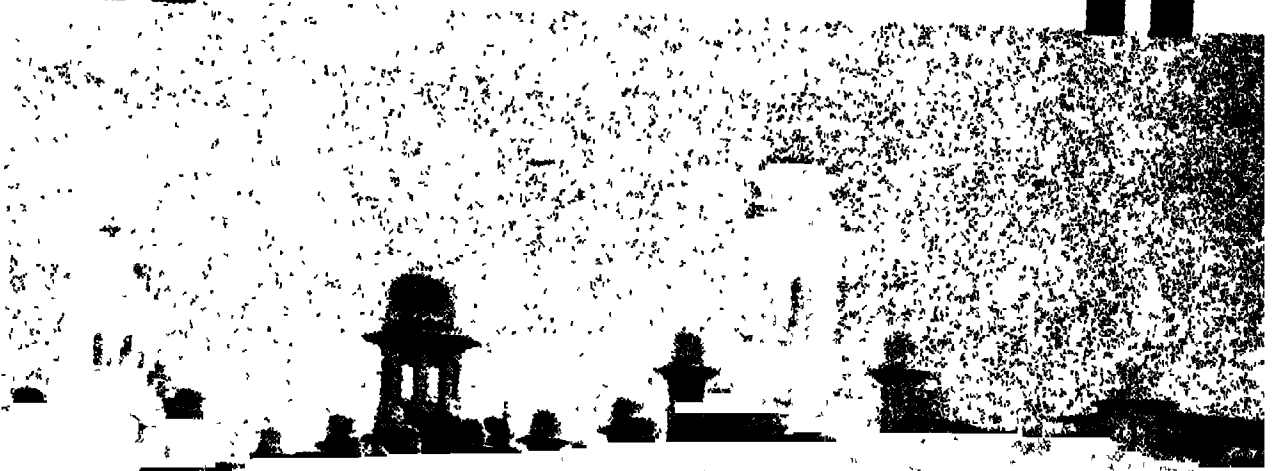
چارباغ اسٹیشن لکھنؤ کے باہر اندرا جی کے استھی کلس کی آمد کا ایک منظر ـــــــ

مرکزی وزیر شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ اور وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری
استھی کلس، اسٹیشن سے باہر لاتے ہوئے
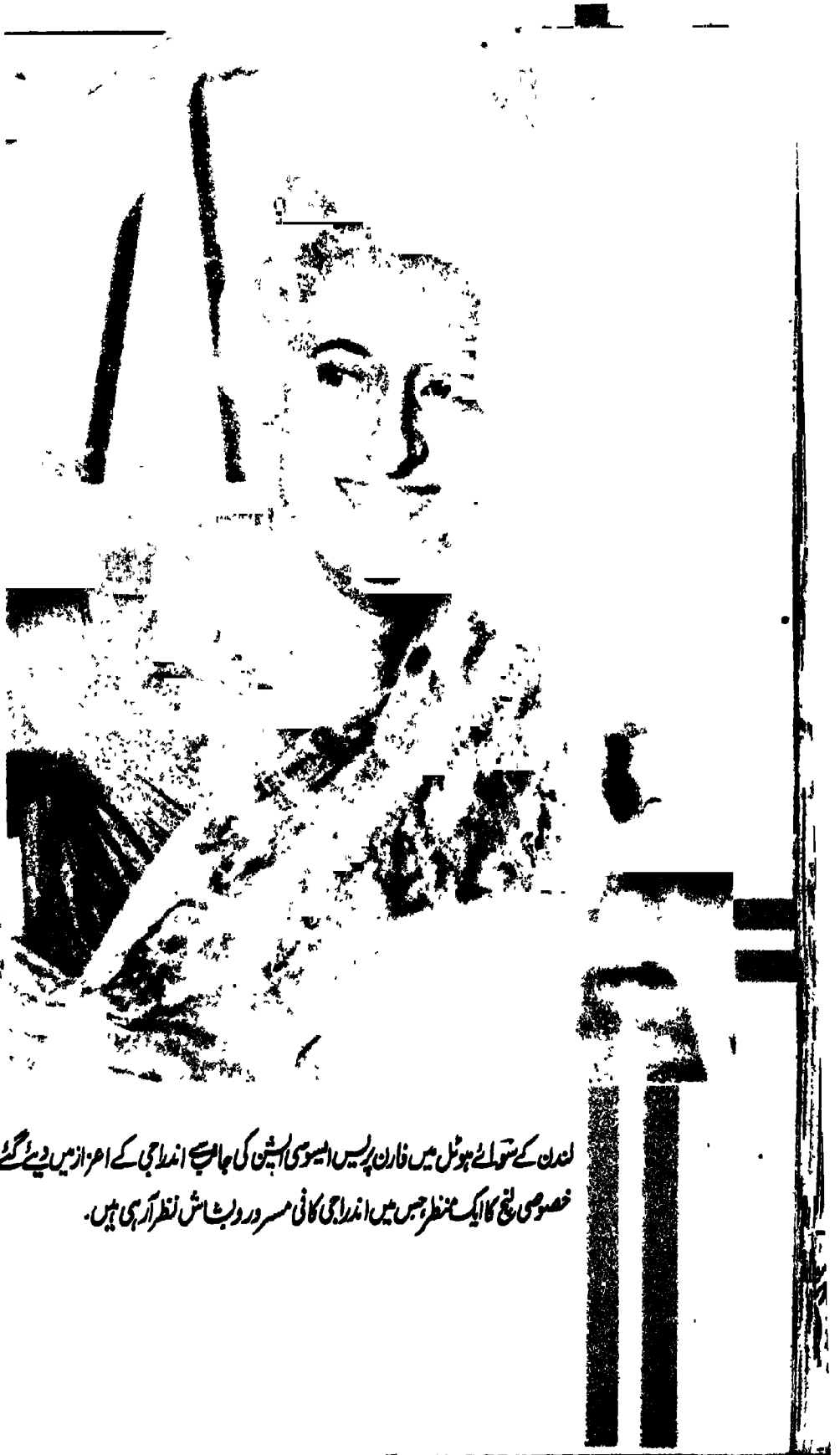
لندن کے سوائے ہوٹل میں فارن پریس ایسوسی ایشن کی جانب سے اندرا جی کے اعزاز میں دیئے گئے خصوصی لنچ کا ایک منظر جس میں اندرا جی کافی مسرور و بشاش نظر آ رہی ہیں۔

سب کو میرا سلام

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جمیل مہدی
ایڈیٹر عزائم لکھنؤ

اندرا گاندھی — بے مثال قائد بے نظیر شخصیت

گاندھی جی کے قتل کے بعد اندرا گاندھی کا قتل، دوسرا ایسا واقعہ ہے، جس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے، اگرچہ قتل کے ان دو واقعات میں نوعیت کا فرق ہے، اور اسی اعتبار سے نتائج میں بھی۔

گاندھی جی کا قتل جس خونریز منظر میں ہوا تھا، اسکے رنگ روغن میں انکے قتل کے بعد بنیادی تبدیلی آئی تھی، اور قاتلوں کا تعلق ان ہی کے فرقہ کے لوگوں سے تھا اسلئے تاسف اور صدمہ کی شدت بھی بہت تھی، پوری قوم کو اس دھچکے کا فائدہ اس طور پہنچا تھا کہ ضمیر کو ٹٹول کر دیکھنے کا اجتماعی رجحان پیدا ہو گیا تھا، اس رجحان نے یقیناً اس مضبوط اور مستحکم ہندستان کی بنیاد استوار کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا، جو جواہر لال نہرو کی، ۱۷ سال کی طویل قیادت کے ختم ہونے کے بعد اندرا گاندھی کو ورثے کے طور پر حاصل ہوا تھا۔

گاندھی جی کا قتل جن حالات میں ہوا تھا، وہ خواہ کتنے ہی دردناک اور پیچیدہ کیوں نہ ہوں، اس اعتبار سے، آج کے دور سے بالکل مختلف تھے کہ ان کے منظر ہستی سے اٹھ جانے کے بعد، عظیم رہنماؤں کی ایک پوری صف انکی جگہ لینے کیلئے موجود تھی، اور ہندستان جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، راجگوپال اچاریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے لوگوں کی طرف امید، اور اعتماد کے ساتھ دیکھ سکتا تھا۔ ریاستوں تک میں، بی جی کھیر، گووند بلبھ پنت، سی بی گپتا بی سی رائے، روی شنکر شکلا، اور سکھاڈیہ جیسے لوگ موجود تھے۔

اندرا گاندھی کے قتل کے بعد، اس طرح کا کوئی اطمینان اور اعتماد ملک کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے، اس لیے ان کا قتل، گاندھی جی کے قتل، ——— سے کہیں زیادہ تشویش ناک ردعمل، اور خوف و خطر کے حامل جذبات اور گاندھی جی کے قتل سے کہیں زیادہ دوررس نتائج اور اندیشوں سے بھرپور ہے۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد۔ برنارڈ شا نے کہا تھا کہ "بہت زیادہ نیک ہونا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔" لیکن اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جو بات سب سے زیادہ خیال انگیز ہے وہ مسز تھیچر کی زبان سے نکلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اندرا گاندھی کے قتل نے جس خوفناک حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت میں بھی تشدد اور قتل کے واقعات ہو سکتے ہیں۔

اندرا گاندھی کا سولہ سالہ دور اقتدار، ہندستان کی ۳۵ سالہ آزادی میں سب سے زیادہ اہم دور ہے، اس دور میں جتنے تہلکہ خیز اور طلاطم انگیز واقعات ہوئے، ان کی بھی کوئی نظیر اپنے پہلے کے دو وزراء اعظم، جواہر لال نہرو، اور لال بہادر شاستری کے دور میں نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اندرا گاندھی سمیت تینوں وزراء اعظم کے دور میں، ایک جنگ کی آزمائش سے ہندستان کو گذرنا پڑا۔ نہرو کے دور میں چین کے حملہ (۱۹۶۲ء) لال بہادر شاستری کے دور میں ہند پاکستان جنگ (۱۹۶۵ء) اور اندرا گاندھی کے دور میں بنگلہ دیش کے بحران، اور ہند پاکستان جنگ (۱۹۷۱ء) کے واقعات پیش آئے، لیکن ان تینوں جنگوں کے نتائج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جہاں چین کے حملے نے ہندستان کی ایسی کمزوری ظاہر کی تھی جس کا صدمہ جواہر لال نہرو کیلئے ناقابل برداشت ثابت ہوا، اور ہند پاکستان جنگ، جسکے نتائج لال بہادر شاستری کے دور میں بے نتیجہ ثابت ہوئے، اور تاشقند معاہدہ کے بعد، حالات جوں کے توں رہ گئے وہاں ۱۹۷۱ء کی جنگ نے اندرا گاندھی کو ایسی عظیم کامیابی

اور فیصلہ کن تجربے سے دو چار کیا کہ ان کی شخصیت، ملک اور اس کے محدود دائرے کو توڑ کر بین الاقوامی وسعتوں کو چھونے لگی اور ان کا شمار ان ڈپلومیٹوں، اور دانش مند، بہادر اور بے خوف حکمرانوں میں ہونے لگا۔ جو ان کے زمانے میں گنی چنی تعداد میں ہی بین الاقوامی منظر پر باقی رہ گئے تھے۔

اندرا گاندھی نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے بعد جو امن پسندانہ کردار اپنایا وہ ہندوستان کے طویل، تاریخی اور روایتی پس منظر میں اشوک کی یاد دلانے والا کردار تھا۔ جس نے کالنگا کی ایک لڑائی جیتنے کے بعد پھر کبھی جنگ کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔

۱۹۷۱ء کے بعد انھوں نے فی الواقعہ اپنی ساری توجہ عالمی امن، داخلی صنعتی اور اقتصادی ترقی پر لگائی اور ۱۹۷۴ء میں ایٹمی تجربہ کے علاوہ کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس کی بین الاقوامی سطح پر تعریف و تحسین نہ ہوئی ہو، ان کی قیادت میں، ہندوستان ایٹمی دور میں داخل ہوا، ان ہی کی رہنمائی میں شری ہرکوٹا کا خلائی مرکز قائم ہوا، جس نے ہندوستان کے اپنے خلائی سیارہ انسیٹ بی کو خلا میں قائم کر کے، ہندوستان کے دور دراز حصوں کو ٹیلی ویژن کے ذریعہ ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ ان ہی کی دلچسپی، انہماک اور کوشش کی بدولت، ہندوستان دفاعی حیثیت سے اتنا طاقتور اور دفاعی سامان کی پیداوار میں اس حد تک خود کفیل ہو گیا کہ آج اسکا شمار تیسری دنیا کے سب سے زیادہ ترقی پذیر ملکوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معاشی اور صنعتی اعتبار سے مضبوط و مستحکم ملکوں میں کیا جاتا ہے، ان ہی کے دور اقتدار میں، ہندوستان مشین اینڈ ٹول کمپنی (ایچ۔ ایم۔ ٹی) نے گھڑیوں کے نازک پرزوں سے لیکر بھاری مشینوں کی پیداوار میں عالمی اہمیت حاصل کی۔ ان ہی کے دور میں بی ایچ ایل نے بجلی کے بھاری ٹربائینوں سے لیکر، چھوٹے بجلی کے کارخانوں تک کی پیداوار شروع کی، ان ہی کے دور میں، وشاکھاپٹنم اور دوسری بندرگاہوں میں، مال بردار بحری جہازوں سے لیکر جنگی جہازوں اور آبدوزوں تک کی تیاری کا کام شروع ہوا، ان ہی کی قیادت میں ہندوستان نے اپنے

مگ، جگوار اور دوسرے جنگی طیاروں کو بنایا، اور غذائی پیداوار میں سبز انقلاب کے نام سے ایسی بے مثال کامیابی حاصل کی کہ ساری دنیا کے لوگ، اسکے طریقۂ کار کا مطالعہ کرنے کیلئے ہندوستان آئے۔

یہ ان ہی کی ان تھک محنت اور تعمیر کی جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان درجنوں ترقی پذیر ملکوں میں ریلوے لائن بچھا رہا ہے، ریلوں کے انجن اور مال گاڑیوں اور مسافر گاڑیوں کے ڈبے سپلائی کر رہا ہے، درجنوں ملکوں میں سڑکیں اور پل بنانے کا کام ٹھیکے پر کر رہا ہے، ان ہی کے دور میں ڈاکٹروں، انجنیئروں، سائنس دانوں اور فنون کے ماہروں کی ایسی قطاریں ملک میں نمودار ہوئیں کہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ہندوستان کے ماہرین فن کام نہ کر رہے ہوں اور عزت کی نظر سے نہ دیکھے جا رہے ہوں،

بین الاقوامی سیاست میں انھوں نے بڑی طاقتوں کی باہمی آویزش کے خاتمہ اور عالمی امن کو یقینی بنانے کیلئے لگاتار کام کیا، اور ہندوستان کو بڑی طاقتوں کی آویزش سے بالاتر رکھ کر، دونوں کیمپوں کے ساتھ تعلقات میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کی، وہ روس کی دوست تھیں، لیکن امریکہ اور مغربی ملکوں کی دشمن نہیں تھیں، ایک مغربی ماہر سیاست اور دانشور کے الفاظ میں۔

> مغرب نے بالآخر یہ بات سمجھ لی تھی کہ اندرا گاندھی کے طرز فکر میں روس اور مغرب نوازی کا کوئی عنصر شامل نہیں اور وہ سرتاسر ہندوستان کے اپنے فائدے اور نقصان کے اندازے پر قائم ہے۔ اسی طرح مغرب نے اندرا گاندھی کے ساتھ اس دنیا میں رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔"

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ روس کے وزیر دفاع مارشل استی نوف نے انھیں "سودے بازی کے معاملہ میں انتہائی سخت" بتایا تھا اور صدر ریگن اس کا ایک سے زیادہ مرتبہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ اندرا گاندھی کے دور میں متعدد مسائل میں اختلافات باقی رہنے کے باوجود امریکہ اور ہندوستان کے تعلقات کسی بھی دور کے مقابلہ میں زیادہ خوشگوار اور قریبی ہو گئے تھے۔

۱۹۸۳ء کے بعد بین الاقوامی سطح پر ان کا سیاسی عروج بلندی کے آخری نقطہ پر ۱۹۸۳ء کی ناوابستہ کانفرنس کے بعد پہنچا، جبکہ وہ ایک سو سے زیادہ ترقی پذیر اور غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم کی صدر بنائی گئیں، اور شخصی اعتبار سے دنیا کے حکمرانوں میں ایسی قدر، عزت اور اہمیت کی نظروں سے دیکھی جانے لگیں جو ان سے پہلے ہندستان کے کسی لیڈر کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ کمزور، اور پریشان ملک ان کی طرف امداد اور سرپرستی کیلئے دیکھتے، برابر کے ملک ان سے دوستانہ تعاون اور اشتراک کے خواہش مند رہتے، ان سے بڑے لیڈر، اور ہندستان سے بڑے ملک ان کی تائید، اور حمایت کی جستجو میں لگے رہتے۔ ان کی بے نظیر قابلیت اور قائدانہ صلاحیت کے ناقابل تردید ثبوت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے، کہ بڑی عالمی طاقتوں میں روس اور امریکہ جیسی ایک دوسرے کی حریف طاقتیں، اور ناوابستہ ملکوں میں عراق اور ایران جیسے برسرپیکار ملک، ان پر یکساں اعتماد رکھتے اور ان کی تائید اور خوشنودی کے حصول کے منتظر رہتے تھے۔

جوں جوں دن گذرتے جائینگے اور جذباتی ہیجان کی کیفیت میں اعتدال پیدا ہو جائے گا، اندرا گاندھی کے قتل کی اہمیت اور عین عروج کے وقت انکے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جانے کے نقصان کا احساس قومی اور بین الاقوامی سطح پر بڑھتا جائے گا، ان کے ناوقت اور بیدردانہ قتل کے رنجیدہ اور صدمہ انگیز واقعہ نے کئی لوگوں کو جذباتی طور پر اتنی شدید کیفیات سے دوچار کیا کہ وہ ہندستان کی سوسائٹی کے مستقبل سے ہی مایوس نظر آنے لگے ہیں مثال کے طور پر، انکے ایک بڑے نکتہ چیں، اور مشہور دانشور صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ "انکے قتل کی اس نوعیت نے کہ جمہوری نظام میں تشدد کا فیصلہ کن استعمال ہوا، اور ایک نہیں دو دو مردوں نے ایک عورت پر وحشیانہ حملے میں بہیمانہ خصلت کی آخری حدوں کو پار کیا، جس پر ہاتھ اٹھانا، ہندستان کی تہذیبی روایتوں کے خلاف اور تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا، مجھے، ہندستانی قوم اور اسکی سوسائٹی کے مستقبل سے بالکل مایوس کر دیا ہے۔"

لیکن قوموں اور ملکوں کے معاملات میں، مایوسی اور دل شکستگی سے تو کام چلتا نہیں۔ صدمات خواہ کتنے ہی جاں کاہ اور دلخراش ہوں اور چیلنج خواہ کتنے ہی خوفناک اور حوصلہ شکن ہوں، بالآخر انھیں قبول کرکے ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، تیسرے ہندستانی حکمراں کی حیثیت سے آج یہ چیلنج راجیو گاندھی کو ہی نہیں، پوری ہندستانی قوم کو بھی درپیش ہے۔ کہ وہ اندرا گاندھی کی ناوقت اور ناقابل برداشت جدائی کا صدمہ برداشت کرکے، ہندستان کی تعمیر و ترقی کا کام کیسے جاری رکھے، یہ وقت نوحہ فریاد و ماتم کا ہے، نہ مایوسی اور دل گرفتگی کے عالم میں، حوصلہ اور ہمت سے محروم ہو جانے کا۔ اسکے بجائے یہ وقت استقلال دکھانے اور پامردی کے ساتھ اندرا گاندھی کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کی جد و جہد میں لگ جانے کا ہے۔

سب سے بڑا سبق، جو اندرا گاندھی کی قیمتی شخصیت سے محرومی نے ہندستانی قوم کو دیا ہے، اور ان کے وحشیانہ قتل کے لامحدود صدمے اور دردناک نتائج کا جو اصل اور واحد خلاصہ پوری قوم کے سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے کہ صنعتی ترقی، سیاسی عروج، خلائی فتوحات اپنی جگہ اہم اور قابل قدر سہی، لیکن ہندستان کا اصل مسئلہ فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ قومیت کے تحفظ اور فرقہ واریت کے سرایت شدہ زہر کو سماج کے رگ و ریشہ سے ختم کرنے کا ہے۔ اور اس حقیقت کو بہر حال پیش نظر رکھنے کا ہے کہ ساری ترقیاں سارا عروج، اقتصادی اور معاشی اعتبار سے خوشحالی کے فرقہ وارانہ نفرتوں کے مقابلہ میں بے معنی اور بیکار ہو جانے کا خطرہ ہی اصل خطرہ ہے، اس خطرہ کو دور کئے بغیر ملک کے مستقبل سے بے فکری کا کوئی امکان موجود نہیں۔

●

> ان کا نظریہ اس سلسلہ میں بالکل واضح تھا کہ ھندستان کو کس طرح متحد رکھا جائے اور اسے عالمی برادری میں باعزت مقام دلایا جائے۔
>
> ڈاکٹر ہنری کسنجر

صغیر احمد صغیر
نئی مسجد، گیوال بیگھہ
گیا۔ بہار

اندرا گاندھی کی شخصیت کے چند اوراق

اندرا گاندھی کی پیدائش الہ آباد میں ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں یہ جواہر لال نہرو کی صاحبزادی تھیں اور ان کے دادا کا نام موتی لال نہرو تھا۔ یہ جواہر لال نہرو کی اکلوتی بیٹی تھیں اس لیے نہرو نے اندرا کی شخصیت کو سنوارنے میں کافی محنت کی۔ نہرو یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ عورتیں اپنے روایتی رول کی پابند رہیں۔ نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ خوش حال طبقے میں جہاں ہر کام مردوں کی مرضی سے ہوتا ہے عورتیں سامان زیب و زینت بن کر رہ جائیں۔ نہرو نے اندرا کی تعلیم کے بارے میں اے۔ کے چندرا کو شانتی نکیتن میں ایک خط لکھا تھا۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ محض ایک معمولی، عام اور روایتی قسم کی لڑکی بن کر رہ جائے بلکہ اسے ایک مختلف سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ نہرو نے لکھا تھا:۔

"میں ایسی تعلیم پسند نہیں کرتا جس سے لڑکی محض ڈرائنگ روم میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل بن جائے اور دوسرا کوئی کام نہ کر سکے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اپنی بیٹی کو سال بھر تک کسی فیکٹری میں عام مزدور کے طور پر کام کرنے کو بھیج دیتا اور اسے بھی اس کی تعلیم کا ایک حصہ تصور کرتا۔"

شانتی نکیتن کے لیے داخلہ فارم بھرتے وقت نہرو نے اپنی بیٹی کی خصوصیات اور رجحانات پر قابل قدر نوٹ لکھا تھا اسے شریمتی اندرا گاندھی کی پہلی سوانح کہا جا سکتا ہے۔ اس نوٹ میں نہرو نے وضاحت کی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی تعلیم کس نہج پر چاہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا:۔

"اندرا کے والدین کی خواہش ہے کہ وہ آئندہ کسی ایسے مضمون یا مضامین میں مہارت حاصل کرے جن کی مدد سے وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دے سکے جو سماجی طور پر مفید ہو۔ یہی نہیں بلکہ جب تک موجودہ سماجی ڈھانچہ برقرار رہتا ہے وہ اقتصادی طور پر خود کفیل بھی ہو سکے۔ ایک تو اس کا کوئی امکان نہیں کہ اسے ورثے میں کوئی دولت مل جائے تاکہ اُسے خود کمانا نہ پڑے۔ دوسرے اس کے والدین یہ بھی نہیں پسند کرتے کہ وہ اپنے شوہر یا کسی دوسرے کی دست نگر ہو۔ .."

".... .. اندرا کے والدین یہ بھی نہیں چاہتے کہ وہ محض ادبی قسم کی یا ایسی کوئی تربیت حاصل کرے جو اُسے بالکل نکما بنا دے اور وہ اپنے پیروں آپ کھڑی نہ ہو سکے۔"

اس طرح نہرو نے اندرا کی تربیت کا رُخ تو متعین کر دیا تھا لیکن ابھی کوئی واضح مقصد یا منزل سامنے نہ تھی اُس وقت تو یہ بات نہرو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ کسی دن آزاد ہندوستان کے

وزیراعظم بن سکتے ہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ خیال کہ اُن کی بیٹی بھی ایک روز ان کی جانشین ہوسکتی ہے عرصۂ دراز تک اُن کے ذہن میں نہ آیا ہوگا۔ یہ تو سب پر عیاں ہے کہ نہرو نے صرف ایک مقصد یعنی ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنے کو وقف کر رکھا تھا اور جب وقت آیا تو نہرو کو ملک میں وہ مرتبہ وہ مقام حاصل ہو چکا تھا کہ وزیراعظم کے عہدے کے لیے ان کے علاوہ کسی اور کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اندرا گاندھی کے معاملے میں یہ عمل زیادہ تدریجی اور ارتقائی مراحل سے گزرا۔ یونیورسٹی کے داخلے کے وقت اندرا کے رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے نہرو نے لکھا تھا:۔

"اس کی ایک مبہم سی خواہش یہ ہے کہ سماجی خدمت یا سیاسی کام کرے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی سرگرمیوں کو بہ نظرِ تحسین دیکھتی ہے"

لیکن جب اندرا نے پہلی بار کانگریس کا ممبر بننے کی خواہش ظاہر کی اور دلیری کے ساتھ کم سن کارکنوں کا ایک جتھا بنایا، جسے اُن کے دادا نے ہنس کر "بانر سینا" کا لقب دیا، تو اُن کی عمر محض بارہ سال تھی۔ سینا کی تفصیل بتاتے ہوئے شریمتی گاندھی نے لکھا ہے:۔

"کاموں کی تقسیم کے لیے مختلف گروہ بہ لحاظِ عمر بنائے گئے تھے۔ ہم نے کوشش کی کہ ہر ممکن کام بڑے لوگوں کے ہاتھوں سے ہم لے لیں تاکہ وہ آزادی سے دوسرے اہم کام کر سکیں۔ جب پہلے پہل یہ تجویز پیش کی گئی تھی تو لوگ ہم سے بڑے مربیانہ انداز سے پیش آئے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُن کا یہ رویّہ بدل گیا کیونکہ ہم نے سچ مچ بہت سے سخت اور مشکل کام خوش اسلوبی سے کر دکھائے"

دراصل یہ قول اندرا کی زندگی کے ہر دَور پر صادق آتا ہے اس وقت بھی جب وہ پہلے پہل وزیراعظم بنیں۔ ان کے چہرے کے نستعلیق خطوط، اُن کے بُوٹے سے قد اور نازک قامت میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ نازک شخصیت ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اُن کی ذات اندر سے بالکل فولاد کے مانند تھی اور کسی بھی چیلنج کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ میرے خیال میں ان میں دو زبردست خصوصیتیں تھیں، مصمّم ارادہ اور تنظیمی صلاحیت! ان دونوں خصوصیتوں کا اظہار ہر موقع پر ہوا ہے۔ بچپن میں بھی اور شانتی نکیتن کے بعد یورپ کے دوران قیام میں بھی۔ اور بلاشبہ اُس وقت بھی جب اُن کا دورِ اقتدار شروع ہوا تھا۔ پہلے اپنے والد کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں میزبان کی حیثیت سے اور پھر کانگریس کے شعبۂ خواتین میں جبکہ انھوں نے اس شعبے کے ذریعہ خواتین کو سرگرم اور فعّال بنایا۔ ان خصوصیات کا اظہار اُس وقت بھی ہوا جب سیاسی دائرۂ کار میں وہ زیادہ مُوثر بنیں اور اس وقت بھی جب ۱۹۵۹ء میں پہلی بار انھوں نے صدر کانگریس کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا اور پھر جب وہ وزیراعظم بنیں۔ ۱۹۲۶ء میں اپنی ماں کی وفات کے بعد جب وہ لندن گئی تھیں اور کرشنا مینن کی انڈیا لیگ میں کام کرنے لگی تھیں تو انتظامی کاموں میں مہارت اور کام کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لینے کی عادت کی وجہ سے وہ بہت سے اداروں میں منسلک ہوگئیں تھیں۔ کسی کی سکریٹری تھیں تو کسی کی خازن! — مہاتما گاندھی نے ان کی صلاحیتوں کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ کملا نہرو کی موت کے بعد جو تعزیتی خط انھوں نے لکھا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُن کے کتنے مدّاح تھے اور اندرا سے ان کو کیا توقعات وابستہ تھیں۔ باپو نے لکھا تھا۔

"کملا کے گزر جانے کے بعد تمھاری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ میں تمھارے لیئے متردد نہیں ہوں۔ تم بڑی ہوگئی ہو اور اپنے فرائض کو خوب سمجھتی ہو۔ کملا میں ایسی خوبیاں تھیں جو عام طور سے عورتوں میں نہیں ہوتیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان ہی کی طرح یہ ساری خوبیاں تم میں بھی ہونگی۔ خدا تمھیں صبر اور ہمت دے تاکہ تم اپنی ماں کی ساری خوبیاں اپنا سکو!"

گو کہ اندرا گاندھی نے اپنی ابتدائی عمر میں اپنی ماں سے جذباتی تسکین حاصل کی تھی جب کہ ان کے والد کا جیل میں آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ اپنی ماں کی ہمت اور نیکی کی مداح اور معترف بھی تھیں لیکن اندرا کے سیاسی اور ذہنی ارتقا میں اس زمانے کی عظیم ترین شخصیتوں موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو اور رابندر ناتھ ٹیگور کا ہاتھ تھا۔ مہاتما گاندھی سے انھوں نے بڑا سیدھا اور آسان سبق یہ سیکھا کہ کسی بھی کام کے صحیح ہونے کی کسوٹی کیا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اور خصوصاً ۱۹۶۶ء میں وزیر اعظم بننے کے بعد وہ اپنی تقریروں میں بار بار اس کا ذکر کرتی رہی ہیں کہ اگر کسی کام کے کرنے سے غریبوں کی اکثریت کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اچھا ہے اور اگر نہیں تو خراب ہے۔ جواہر لال نہرو سے انھوں نے وہ تصورات و نظریات اور بصیرت ورثے میں پائی جن کے دائرہ کار میں انھوں نے اپنا لائحہ عمل مرتب کیا۔ ان ہی سے انسان دوستی کی وہ آفاقیت سیکھی جو قومی سرحدوں کی تنگنائے سے بالاتر ہوتی ہے، وہ جمہوری آزاد خیالی بھی سیکھی جس سے آزاد ہندوستان کی نشوونما ہوئی تھی اور کسی مسئلے کے ہر پہلو کو دیکھنا اور پرکھنا بھی سیکھا۔

اندرا گاندھی کے ماحول اور روایات نے بھی ان کو کافی متاثر کیا اور اسی ماحول نے انھیں انسان دوست بھی بنایا۔ اُن کے اس مزاج کی تشکیل میں دنیا کے دانشوروں کے وسیع اور عمیق مطالعے اور اُن سے اخذ کردہ خیالات و نظریات کا بھی حصہ ہے جس نے اُن کے تاثر پذیر ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اُن کے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں رابندر ناتھ ٹیگور کے خیالات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ شانتی نکیتن میں ان کا قیام اور وہاں رابندر ناتھ ٹیگور جیسی متنوع صلاحیتوں کی مالک شخصیت کے اثرات نے سیاست کے خشک میدان میں چلنے والی اس خاتون میں ہمدردی اور دلسوزی کا جذبہ پیدا کیا۔ "مجھے اچانک یوں لگا کہ میں ایک دوسری ہی دنیا میں آگئی ہوں" شریمتی گاندھی نے بتایا تھا۔

اندرا جی فیروز گاندھی سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اُن کی محبت کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے فیروز کی ناوقت موت کے فوراً بعد اپنے ایک دوست کو لکھا تھا:-

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ بہت دکھی ہوں، شدید تنہائی کا احساس ہے، تمھیں معلوم ہی ہے کہ مجھ میں اور فیروز میں اختلاف رائے رہا اور ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی رہے لیکن اس سے ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا اور ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے گئے۔ ہم نے سرینگر میں ہاؤس بوٹ میں ایک مہینے کی چھٹیاں بڑے مزے سے گزاری تھیں اور مستقبل کے بہت سے منصوبے بھی بنائے تھے۔ اب ہمارے لڑکوں کی عمر ایسی ہے کہ انھیں ماں سے زیادہ باپ کی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں کھو گئی ہوں اور خود کو کھوکھلا اور بے جان محسوس کرتی ہوں۔ لیکن زندہ تو رہنا ہی ہے۔ گو ہوش و حواس بجا نہیں ہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ اپنے آپ کو سنبھالنا ہے اور کسی کام میں لگ جانا ہے لیکن جب کسی بات میں جی ہی نہ لگے تو اس کا کیا فائدہ"

اندرا گاندھی ایک عظیم شخصیت کی مالک تھیں جن کا سیاست کے علاوہ دوسری دنیاؤں پر بھی راج تھا۔ گو کہ آج وہ ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے اور ان کی شخصیت ہمیشہ زندۂ جاوید رہے گی اور رہتی دنیا تک لوگ ان کا نام لیتے رہیں گے۔

●••

احمد ابراہیم علوی
۳۰۔ بلیتھ اسکوائر
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

شریمتی اندرا گاندھی کی سیاسی بصیرت

ہندستان آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے اس لیے اس کے مسائل بھی بڑے پیچیدہ اور بے شمار ہیں' غریبی بے روزگاری اور ناخواندگی خوفناک حد تک ہے ایسے ملک کی قیادت سر پر کانٹوں کا تاج رکھنا ہے. جس وقت مسز اندرا گاندھی نے یہ بار اٹھایا عدم اعتماد اور خوف کا ماحول تھا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اتنے بڑے ملک کے اتنے سنگین مسائل کا حل ایک ایسی خاتون پیش کر سکے گی جو بظاہر بڑی بے سہارا نحیف اور ناتوان معلوم ہوتی ہے. مسز اندرا گاندھی نے اپنے عظیم باپ کے عظیم ورثے میں صبر و استقلال سے حالات کا مقابلہ کرنے کا فن پایا تھا اس لیے انھوں نے حالات پر غور کیا' مسائل کو سمجھا اور اپنے عوام پر اعتماد کیا پھر ان کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا گیا. وہ جو سمجھتے تھے کہ ان کو چٹکیوں میں دبا لیا جائے گا ان کو اپنی سنگین غلطی کا احساس ہونے لگا ہر وہ طاقت جو ان سے ٹکرانے کا بھرم رکھتی تھی اس نے ان کے مقابلے میں اپنے کو بہت کمزور اور بے بساط پایا.

مسز اندرا گاندھی نے وزارتِ عظمیٰ کی عظیم تر ذمہ داریوں کو پہلے پہل قبول کر کے اپنے محترم والد اور ملک کے سب سے لائق وزیر اعظم مسٹر جواہر لال نہرو کی قائم کردہ روایات کو برقرار رکھا پھر بوقتِ ضرورت ان سے انحراف بھی کیا لیکن یہ ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا کہ جب انھوں نے روایات کا پاس رکھا تب اور جب روایات سے انحراف کیا تب ان کے عزائم کی مضبوطی اس طرح منکشف ہوئی کہ ان سے ٹکرانے اور مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھنے والے شل ہوگئے.

مسز گاندھی نے ملک میں استحکام پیدا کرنے کیلئے یہ ضروری سمجھا کہ مرکز کو بہت مضبوط ہونا چاہیئے. اس لیے انھوں نے سب سے پہلے مرکز پر نظر کی جہاں جہاں کمزوریاں تھیں ان کو دور کیا اور حالات پر اتنی مضبوط گرفت کی کہ کوئی فرد تصور بھی نہ کر سکا کہ کبھی حالات ایسا بھی رخ اختیار کر سکتے ہیں کہ وہ مسز اندرا گاندھی کے قابو سے باہر ہو جائیں. عوام کا یہ تصور اور مسز اندرا گاندھی کا یہ حوصلہ ان کو ہمیشہ بڑے سے بڑے کارنامے انجام دینے کی راہ میں ممد و معاون ہوا جس کے سبب انھوں نے سابق والیانِ ریاست کی مخصوص مراعات کو ختم کیا ان کو دیئے جانے والے پریوی پرس (صرفِ خاص) کو روکا اور بینکوں کو قومیا لیا. یہ دونوں اقدام بڑے انقلابی اور بڑے پرخطر تھے سوائے مسز اندرا گاندھی کے اور کوئی دوسرا ایسا سرفروشانہ اقدام کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا کیونکہ اگر مسز اندرا گاندھی کے پائے استقلال کو ذرا بھی جنبش ہوتی تو کیا کا کیا ہو سکتا تھا سابق راجواڑے مضبوط جڑیں رکھتے تھے ان کے محلات میں بڑے بڑے

اسلحہ خانے تھے ان کے عزائم بڑے خونخوار اور ارادے بڑے بھیانک تھے وہ اپنے اپنے علاقوں میں عوام کو بہکا بھی سکتے تھے کوئی بھی سنگین سے سنگین حربہ اختیار کرسکتے تھے۔ غیر ملکی طاقتوں کے سہارے لے سکتے تھے ملک میں خون خرابہ ہوسکتا تھا مگر مسز اندرا گاندھی نے بڑی دانشمندی، بڑی جسارت اور بڑی چستی سے ان پر ایسا بھرپور وار کیا تھا کہ سب دم بخود رہ گئے سبھی کے حوصلے پست ہوگئے اس کے برعکس عوام نے اس انقلابی کاوش کا خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ملک میں جمہوریت کی جڑوں کو پائیدار کرنے کے لیے نہایت مفید اور ضروری اقدام تھا مسز گاندھی کی طاقت بجائے کچھ کم ہونے کے کچھ اور بڑھ ہی گئی۔ بینکوں کو قومیانے کا کام بھی کوئی معمولی کام نہ تھا۔ بڑے مسائل تھے بڑی زحمتیں تھیں لیکن جب مسز اندرا گاندھی نے فیصلہ کرلیا تو پھر عمل کرکے ہی دم لیا اور عوام نے دیکھا کہ اس کا مفید ردِ عمل ہوا بینکوں کا مصرف صحیح معنوں میں عوام کے لیے ہوا عوام نے اپنے منصوبوں کو اس طرح تکمیل تک پہنچتے ہوئے دیکھا۔

مسز اندرا گاندھی کی نگاہِ دوررس نے دیکھ لیا تھا کہ جب تک ملک کے بڑے بڑے بینکوں کو قومیا نہ لیا جائے گا ملک کی دولت کے اصل مالک و وارث اس کے کروڑہا کروڑ عوام اس دولت سے فیضیاب نہ ہوسکیں گے اسی لیے انھوں نے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر یہ انقلابی قدم اٹھا کر ہی دم لیا۔

دنیا پر منڈلاتے ہوئے جنگ کے ہولناک بادلوں کو اپنے ملک سے دور رکھنے کیلئے مسز اندرا گاندھی نے یہ ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے ملک کو فوجی ضرورتوں کے معاملے میں خود کفیل بنایا جائے اسکے لیے انھوں نے منصوبہ بند طریقے سے کام شروع کیا جس کا یہ دل خوش کن نتیجہ برآمد ہوا کہ ملک اپنی فوجی ضرورتیں خود پوری کرنے کے لائق ہوگیا اسکے بعد مسز اندرا گاندھی نے دنیا کی پس ماندہ اقوام کی طرف نظر کی انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ایٹمی اسلحہ جات کی دوڑ کم نہ ہوگی۔ پسماندہ اقوام اور ملکوں کی بنیادی ضرورتوں کی طرف کوئی نظر بھی نہ کرنے گا اس لیے انھوں نے ایٹمی اسلحے کے پھیلاؤ کو روکنے کیلئے بڑی شدومد سے مہم شروع کی۔ بڑی طاقتوں کے خونیں عزائم سے ترقی پذیر ممالک کو باخبر کیا اور ترقی پذیر ممالک نے محسوس کیا کہ یہ بڑی طاقتیں اسلحہ جات بناتے انھیں ایجاد کرنے اور ان کا ذخیرہ کرنے کی دُھن میں ان کو روند کر رکھ دینے کا ارادہ رکھتی ہیں اس لیے انھوں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مسز اندرا گاندھی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسلحے کی دوڑ کو روکنے کیلئے پرزور مطالبہ کیا تبھی بڑی طاقتوں کو بھی احساس ہوا کہ ان کے عزائم خود ان ہی کیلئے بڑے مہلک ثابت ہوں گے۔ کوئی شک نہیں کہ مسز اندرا گاندھی نے دنیا کی محکوم قوموں کو آزادی دلانے، جنگ و جدل کے منڈلاتے بادلوں کو روکنے اور دنیا کو نیوکلیائی بربادی سے محفوظ رکھنے و بین الاقوامی کشیدگی کو نمایاں طور سے کم کرنے کیلئے بڑا اہم کردار ادا کیا جس کے لیے دنیا ان کی شکر گزار رہے گی۔

مسز اندرا گاندھی ہندستان کی وزیر اعظم بن کر عالمی بساطِ سیاست پر نمودار ہوئی تھیں مگر انھوں نے جلدی ہی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر دولتِ مشترکہ میں ایک اہم حیثیت حاصل کر لی انھوں نے اقوام متحدہ میں اپنی عظمت کو دنیا بھر سے تسلیم کروایا اور ناوابستہ ممالک کو یکجا کرکے اس کو ایک بڑی طاقت کا روپ دے کر اسکی سربراہی کی جس کی بنا پر ساری دنیا کے عظیم رہنماؤں نے ان کو عظیم ترین لیڈر تسلیم کیا۔ انھوں نے ہر حیثیت سے ہندستان کو عروج بخشا۔ دنیا کی محکوم قوموں، پسماندہ ممالک اور ترقی پذیر حکومتوں کو حوصلہ عطا کیا ان کی مدد کی تعاون دیا راستہ دکھایا اور جب انھوں نے خواہش ظاہر کی تو ان کی رہبری بھی کی۔

مسز اندرا گاندھی عالمی سیاست کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتی تھیں انھیں یہ احساس تھا کہ وہ ممالک مشکل سے اپنی بقا میں کامیاب ہوسکیں گے جو بس اپنے ہی مسائل میں الجھے رہیں گے ہندستان میں اتنے مسائل تھے کہ کسی بھی ہوشیار سے ہوشیار سیاست داں کیلئے ان مسائل سے قطع نظر کرکے عالمی مسائل میں الجھنا اور ان کے حل کیلئے تدابیر اختیار کرنا، راستہ دکھانا کوئی معمولی کام نہ تھا لیکن مسز اندرا گاندھی خوب سمجھتی تھیں جب تک کہ وہ ان مسائل سے قطع نظر کرکے چہار جانب پھیلے ہوئے الجھے ہوئے مسائل

پر نظر رکھیں گی ان کے لیے خود اپنے مسائل کو سلجھانا ممکن نہ ہو سکے گا اس لیے انھوں نے عالمی سیاست میں اس سرگرمی سے حصہ لیا جس سرگرمی سے وہ ملکی سیاست میں منہمک تھیں اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندستان ابھر کر سامنے آیا۔ دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک نے بھی ہندستان کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم کیا۔ مسز گاندھی نے دنیا کی بڑی طاقتوں کو یہ اچھی طرح اور کر جتا دیا کہ ہندستان کے ستر کروڑ عوام اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت کو نظر انداز کر کے دنیا میں کوئی اقدام کرنا دنیا کی کسی بھی طاقت کیلئے اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ماضی بعید اور ماضی قریب میں رہ چکا ہے انھوں نے بڑی طاقتوں کو یہ جتا دیا کہ ہندستان غریب ہے لیکن بے سہارا نہیں یہاں مسائل ہیں اور بے شمار مسائل ہیں مگر یہ دوسروں کے مسائل بھی حل کر سکتا ہے اور دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو اس کے خلاف بڑی شدومد سے سینہ سپر ہو سکتا ہے۔

دولتِ مشترکہ برطانیہ کے حاشیہ برداروں کی ایک بے جان سی تنظیم بن کر رہ جاتی اگر مسز اندرا گاندھی جیسی باصلاحیت لیڈر ہندستان جیسے ملک سے اٹھ کر اسکو نئی روح اور نئی طاقت عطا کرنے کا اہم فریضہ نہ انجام دیتیں مسز اندرا گاندھی نے دولت مشترکہ کو منظم کیا دوسرے ممالک کو اپنی اہمیت سمجھنے کا موقع دیا اور پھر ان میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ وہ اس تنظیم کے ذریعہ دنیا کی بڑی طاقتوں پر اثر انداز ہونے کا ہنر سیکھیں۔

مسز اندرا گاندھی نے جس خلوص، لگن، ذہانت و دیانت سے اپنے ملک کی رہبری کی اسی طرح دولتِ مشترکہ ممالک کی تنظیم کو بھی حوصلہ بخش کر اپنے مسائل کو باوقار طور سے حل کرنے کا فن دیا۔

مسز گاندھی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بڑی طاقتوں کی باہمی کشیدگی کے سبب دنیا کو جنگ کے خطرے سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے وہ بڑی طاقتوں کو اپنے خطرناک عزائم سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتی رہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طاقت کے اعتبار سے ملکی مسائل کے سبب اور ہندستان کی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ہندستان کا بڑی طاقتوں کی رقابتوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش بڑی مضحکہ خیز کوشش تھی لیکن مسز اندرا گاندھی نے اپنی سیاسی بصیرت اور دانشورانہ قیادت کے سبب اپنے گویا اپنے ملک کو مذاق کا موضوع نہ بننے دیا بلکہ ایسا ماحول بنا دیا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اس کی بات پر کان دھرنے کیلئے مجبور ہو گئیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ہندستان نے بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بہت کم تر ہوتے ہوئے بھی براہِ راست تصادم کو روکنے اور امریکہ و روس کے بالواسطہ تصادم کے امکانات کو کم کرنے کی حتی المقدور کوشش کی بعض بڑی طاقتوں نے ہندستان کو اس نیک کام کی انجام دہی سے باز رکھنے کیلئے اس پر دباؤ ڈالا دھمکیاں دیں اور اسکی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر مسز اندرا گاندھی نے اپنی دانشمندی اور دوراندیشی سے کسی کو اس کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ دوسرے ممالک جن میں سے بعض نے ہندستان سے پہلے یہ کام شروع کیا تھا وہ رک گئے یا ڈر گئے مگر ہندستان ایک مرتبہ بیچ میں پڑ گیا تو پھر ہٹا نہیں بلکہ اسے ایک طرح حکم تسلیم کر لیا گیا یہ مسز گاندھی کی دوراندیشانہ سیاسی پیش رفت کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کو ناوابستہ ممالک کی سربراہی کا قابلِ صد تحسین و ستائش فریضہ انجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مسز اندرا گاندھی کی سربراہی میں نئی دہلی میں ناوابستہ ممالک کے سربراہان کی کانفرنس ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جسکی نظیر تلاش کرنا بڑا مشکل ہے اور لاکھ کوشش کے باوجود اسکی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا ہے اس کانفرنس میں جو تجاویز منظور ہوئیں وہ اپنی اہمیت، افادیت اور نوعیت کے اعتبار سے بڑی تاریخی اور دور رس ثابت ہوئیں۔ یہ مسز اندرا گاندھی کی نگاہِ دور رس کی غمازاور تدبر کی مظہر ہیں۔ یہ کانفرنس عہد حاضر کے سنگین ترین مسائل کو حل کرنے میں کوئی پیش رفت تو نہ کر سکی لیکن اس نے عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ عرب اسرائیل تنازعہ، ایران عراق جنگ، افغانستان میں روسی مداخلت اور کمپوچیا کے مسائل کو حل کرنے میں یہ کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی اور کوئی بھی بڑی سے بڑی کانفرنس اتنے اہم اور سنگین مسائل کو حل کرنے میں

کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ آج کی عالمی سیاست نے کچھ رخ ہی ایسا اختیار کر لیا ہے۔ اس کانفرنس نے مسز گاندھی کی قیادت میں مسائل کو تشدد کا رخ اختیار کرنے سے اپنے طور پر باز رکھنے کی ضرور کوشش کی اس طرح ہندستان نے تیسری عالمی جنگ کے ہولناک اندیشے کو کچھ عرصے کیلئے ٹالنے میں ضرور کامیابی حاصل کر لی جس کے لیے مسز اندرا گاندھی یقیناً مبارکباد کی مستحق تھیں۔ دنیا میں جنگ کیلئے تیاریاں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہی ہو رہی ہیں حالانکہ سب ہی تاریخ سے خوفزدہ ہیں سبھی جنگ کو برا کہتے ہیں لیکن یقیناً ایسی کوششیں بالکل نہیں ہو رہی ہیں جن سے جنگ کو روکا جا سکے۔ مسز اندرا گاندھی نے اقوام عالم کو یہ سمجھانے کی ضرور کوشش کی کہ جنگ کے لیے تیاریوں کے ساتھ ساتھ جنگ کو روکنے کی بات کرنا آگ لگا کر پانی کو دوڑنا ہے۔ مسز گاندھی جنگ کی آندھیوں کو روکنے اور امن کی شمع کو روشن رکھنے کے مقدس فریضے کو تادم آخر انجام دیتی رہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ترقی پذیر ممالک کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ سنگین سے سنگین اور مہلک سے مہلک ہتھیار جوڑنے کی حماقت میں مبتلا ہو کر اپنے عوام کے مسائل کو حل کرنے کیلئے اپنی تمام تر پیداواری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں منہمک رہیں کیونکہ یہ ان کے عوام کے حق میں کہیں زیادہ بلند، اہم اور افضل کام ہے۔

قوموں کی بقا اور ملکوں کے تحفظ کے لیے اسلحہ جات کی اپنی اہمیت ہے۔ ان کی ضرورت تسلیم ہے لیکن عوام کی خوشحالی اور ان کی فارغ البالی اسلحہ جات کے ذخائر سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر قوم خوشحال، صحت مند، تندرست و توانا ہے تو یقیناً وہ بڑے سے بڑے حملے کو جھیل لینے کی صلاحیت رکھے گی لیکن اس کے برعکس قوم نحیف و ناتواں، غیر مطمئن اور ناخوش ہے تو جدید سے جدید تر اور مہلک ترین اسلحہ جات کے ذخائر بھی بے سود ثابت ہوں گے۔ مسز گاندھی زندگی بھر پسماندہ ممالک کو یہ احساس دلاتی رہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسکا بہت اثر ہوا لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس سے اتنا تو بہر حال ہوا کہ عوام کی خوشحالی اور بہتری کے لیے تدابیر اختیار کرنے کی فکر ضرور عام ہوئی جس سے عوام کو یقیناً فائدہ پہنچا اور پہنچتا رہے گا۔

آج کے انسان کو جتنی راحتیں حاصل ہیں اتنی راحتیں اس سے قبل کے انسان کو کبھی حاصل نہیں رہیں لیکن یہ آج کے انسان کی بدقسمتی ہی ہے کہ آج وہ جتنا پریشان حال، فکرمند اور تباہ حال ہے اتنا کبھی کسی دور کا انسان نہ رہا ہوگا۔ یہ سب اس لیے کہ انسان نے مہلک ترین اسلحہ جات ایجاد کر لیے ہیں اس ایجاد کی بدولت اسلحے کے ذخائر میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے جس کے سبب عوام ننگے بھوکے ہیں، بھکمری اور قحط و افلاس وبائی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اسلحہ جات وہاں بھی ڈھیر ہیں جہاں کھانے کو کچھ نہیں اور وہاں بھی جہاں یہ مسئلہ ہے کہ وافر مقدار کی کھپت کہاں ہو؟ اسلحہ سازی بند کی جائے تو بڑے بڑے کارخانے بند ہو جائیں گے لاکھوں انسان بے روزگار ہو جائیں گے پھر اگر جنگ ہو گئی، دو ایک ملک نے بھرپور وار کر دیا تب کیا ہوگا جتنی تیزی سے اسلحہ سازی ہو رہی ہے اس سے کہیں تیزی سے ان کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی جدید ترین ایجادات نے انسانی زندگی کو انتہائی پرخطر بنا دیا ہے دنیا کے انصاف پسند لیڈر امن عالم کے علمبردار ہمیشہ ایٹمی اسلحہ کی دوڑ کو روکنے کیلئے بڑی شد و مد سے اپنی آواز اٹھاتے رہے ہیں کیونکہ یہ بالکل واضح حقیقت ہے جب تک یہ دوڑ ختم نہ ہوگی انسان کو سکون نہ حاصل ہو سکے گا۔ مسز اندرا گاندھی ایسے امن پسند لیڈروں میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں۔ انھوں نے امریکہ اور روس دونوں کی روایتی رقابتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی دونوں سے یکساں دوستانہ اور باوقار تعلقات رکھنے اور دونوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ انھیں کی اسلحہ سازی کے سبب بنی نوع انسان خطرے سے دو چار ہے۔

مسز گاندھی اقوام متحدہ اور دولت مشترکہ و ناوابستہ ممالک کی تنظیم کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ عالمی امن کے استحکام کیلئے ہی کوشاں رہیں۔ انھوں نے ہمیشہ قوموں اور ملکوں کو جنگ کے خطرے سے آگاہ کیا۔ دنیا کے بیشتر ممالک نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور انہیں کی طرح عالمی امن کے لیے اپنی سی کوششیں کرنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ سال گذشتہ مسز اندرا گاندھی نے اقوام متحدہ کے اجلاس
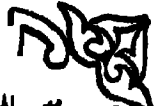
میں عالمی معاشی مسائل پر غور و خوض کیلئے اقوام عالم کو خصوصی دعوت دی تو بہتوں نے لبیک کہا۔ بڑی طاقتیں معاشی اعتبار سے اتنی مضبوط ہیں کہ چھوٹی طاقتیں ان کی رہینِ منت ہو کر رہ گئی ہیں ان بڑی طاقتوں نے طاقت کے سرچشموں کو اپنی گرفت میں لے کر باقی ماندہ دنیا کو اپنا دستِ نگر رہنے پر مجبور کر دیا ہے جس سے معاشی استحصال عام ہے اور چھوٹی طاقتیں، ترقی پذیر ممالک ان کی طرف دیکھتے رہنے کیلئے مجبور ہیں۔ مسز اندرا گاندھی نے ہمیشہ یہ کوششیں کیں کہ کوئی ملک چاہے جتنا چھوٹا ہو اسے معاشی آزادی حاصل ہونا چاہیئے اسے اپنے وسائل پر ہی تکیہ کرنا چاہیئے یہ کام انھوں نے سب سے پہلے اپنے ملک میں شروع کیا انھوں نے بڑی طاقتوں اور بڑے ممالک کے وسائل سے اپنے ملک کو بے نیاز رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں، اس سے یہ ہوا کہ ملک میں اعتماد پیدا ہوا عوام نے یہ سمجھ لیا کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اپنے ملک میں پیدا نہیں ہوتی اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آسانی سے پیدا نہ کی جا سکے۔ جب دیگر ممالک کی پیداوار پر انحصار کرنے سے گریز عام ہو گیا تو پھر اپنے ملک میں پیداوار بڑھانے کا رجحان بھی پیدا ہوا اس سے ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو بڑا سہارا ملا اور بڑی طاقتوں کی رعونت کم ہونے لگی۔

دنیا کی بڑی طاقتیں ہمیشہ سے چھوٹی طاقتوں اور ترقی پذیر ممالک کو آنکھیں دکھانے، ڈرانے اور دھمکانے کی عادی تھیں۔ چھوٹی طاقتوں نے ان کے اس رویہ کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا لیکن ہندستان میں پہلے جواہر لعل نہرو کی قیادت میں اور بعد میں مسز اندرا گاندھی کی رہنمائی میں ان طاقتوں کو مساویانہ رویہ اختیار کرنے کی ایسی کامیاب کوشش ہوئی کہ بڑی طاقتوں کو خود اپنی غلط روی کا احساس ہونے لگا جس کا اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندستان باوجود پس ماندہ ہونے کے بڑی طاقتوں کیلئے باعزت ہو گیا وہ طاقتیں جو کل تک ہندستان کو بہت حقیر سمجھتی تھیں انھیں احساس ہو گیا ہندستان نے جمہوریت سوشلزم اور سیکولرزم کا راستہ اختیار کرکے یقیناً اقوام عالم میں ایک باوقار مقام بنایا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت اقوام عالم میں ہندستان کو جو باوقار مقام حاصل ہے اسکے لیے وہ ہمیشہ مسز اندرا گاندھی کی سیاسی بصیرت کا رہینِ منت رہے گا۔ ●●●

ڈاکٹر سلمان عباسی
۵، ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ
لکھنو ۲۲۶۰۰۱

پریہ درشنی

> "اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی"
>
> شریمتی اندرا گاندھی

مجھ کو دنیا سے گزرنا ہے گزر جاؤں گی
"روشنی بن کے اندھیروں میں بکھر جاؤں گی"

میرا مذہب ہے مذاہب کو ملائے رکھنا
ساری دنیا کو سنواروں گی سنور جاؤں گی

اپنے جمہور کی بہبود کی خاطر اک روز
ملک اور قوم کی رگ رگ میں اتر جاؤں گی

خود فراموش زمانے کو سبق دینا ہے
میرا کیا ہے میں جئے جاؤں کہ مر جاؤں گی

فلسفے موت کے مجھ پر نہ مسلط ہوں گے
میں امر آئی تھی دنیا میں، امر جاؤں گی

جو مری جاں کے محافظ تھے وہ قاتل نکلے
مجھ کو مرنا تھا بہر حال میں مر جاؤں گی

تم مری خاک فضاؤں کے حوالے کرنا
میں ہمالہ کی بلندی پہ بکھر جاؤں گی

مہدی پرتاپگڑھی

جو دلوں میں بس گئے، وہ مر کے بھی مرتے نہیں

بجھ گیا خورشید عالمتاب پھیلی تیرگی
روشنی کی لاش پر نوحہ کناں ہے آدمی

وہ کہ جس کا مسلک، پیار تھا اور اتحاد باہمی
جو کبھی محنت کے استحصال کی حامی نہ تھی

جس نے بھارت کو غلامی دور میں بھی جگا دیا
نام اپنے ملک کا سنسار میں اونچا کیا

ملک کی تشکیل میں جو روز و شب مشغول تھی
آئینہ سازِ ثقافت اس کی ساری زندگی

جس کی حکمت سے کھلے تعمیر کے کتنے ہی باب
ذات جس کی تھی زمانے کی نظر میں انتخاب

جس کی دانش نے کھلائے زیست کی راہوں میں پھول
رہنمائے راحت و امن و سکوں جس کے اصول

کچھ جنونی سر پھروں نے قتل اس کو کر دیا
عالمِ انسانیت میں قہر سا برپا ہوا

چھا گیا ساری فضائے ہند پر حزن و ملال
سوگ وہ طاری ہے ملتی ہی نہیں جس کی مثال

جسم تو فانی تھا، مٹی تھا ہی، مٹی میں ملا
اندرا کا نام اک تاریخ کا حصہ ہوا

اس کے آدرشوں کو لیکن مل گئی تازہ حیات
ایک خوش آئند مستقبل کی ضامن اس کی ذات

اس کے آدرشوں کو اپناؤ یہ ہے راہِ حیات
آدمی مرتا ہے زندہ رہتے ہیں اس کے صفات

روح پرور جو زخم آتے ہیں کبھی بھرتے نہیں
جو دلوں میں بس گئے وہ مر کے بھی مرتے نہیں

اظہر لکھنوی

گردشِ دوراں اداس ہے

میں کیا اداس ہوں کہ ہر انساں اداس ہے
میری نظر میں عالمِ امکاں اداس ہے

ہستی کی قید سے ہوئی آزاد اس طرح
میرے وطن کا آج نگہباں اداس ہے

قربان ملک و قوم پر اس طرح ہو گئی
یہ انتہا ہے گردشِ دوراں اداس ہے

ہر انجمن میں ذکر ہے اب تیرا صبح و شام
تیرے بغیر بزمِ سخنداں اداس ہے

جس انقلابی دور سے اظہر گزر گئے
اس انقلابِ زیست کا طوفاں اداس ہے

شوکت پردیسی
جمدہاں (جونپور)

اندرا گاندھی

مشعلِ راہِ وفا ہے اندرا گاندھی کا نام
روحِ عزم و ارتقا ہے اندرا گاندھی کا نام
جہدِ پیہم اور استقلال کا آئینہ دار
پُر وقار و باحیا ہے اندرا گاندھی کا نام

اندرا گاندھی نے بخشی ملک کو تابندگی
اس کی اپنی ذات سے شمعِ وفا روشن ہوئی
خارزاروں کو بھی اس نے کر دیا گلزارِ نو
ہر طرف اِک روح دوڑا دی نئی تعمیر کی

آخری دم تک رہی وہ پاسدارِ علم و فن
اس کے سینے میں رہا تا زندگی دردِ وطن
خطۂ امن و اماں ہو ایشیا کی سرزمیں
اس کی یہ کوشش تھی پیہم، دل میں تھی سچی لگن

اس نے اک کنبہ کے مانند سب پہ کی یکساں نگاہ
اس کی یہ خواہش تھی آپس میں نہ ہو کچھ اشتباہ
ساری قومیں مل کے بھارت کو بنائیں دلنشیں
ایک کا غم، دوسرے کے دل میں بھی پائے پناہ

قاتلوں کی بزدلی ناکام کر سکتی نہیں
جسم مر سکتا ہے لیکن روح مر سکتی نہیں
اندرا گاندھی تھی صادق، وہ امر ہو کے رہی
اس کی عظمت اور نکھرے گی، بکھر سکتی نہیں

اشرف مالوی
پوسٹ: مال ضلع لکھنؤ
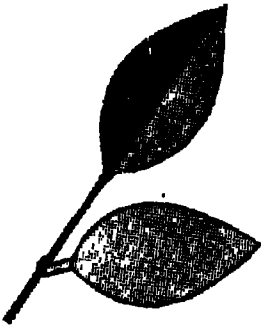
جمہوریت کا قتل

منتشر افکار لب خاموش نظریں بے قرار　　مضمحل چہرے دل افسردہ فضا بھی سوگوار
کس کے غم میں عالم انسانیت ہے اشک بار　　کس طرح کوئی کرے گا اب کسی کا اعتبار

کیا خبر تھی بربریت یہ گھڑی دکھلائے گی
شمع یوں فانوس کی یلغار سے بجھ جائے گی

جذبۂ تعمیر و فکر حریت کا خون ہے　　قوم و نسل و رنگ کی وحدانیت کا خون ہے
بزدلوں کے ہاتھ سے جمہوریت کا خون ہے　　ایک انساں کا نہیں انسانیت کا خون ہے

ایکتا اور پیار کے سندیش کا یہ قتل ہے
اندرا کیا بلکہ سارے دیش کا یہ قتل ہے

جس کی عظمت عظمت ہندوستاں تھی بالیقیں　　جس کے آگے خم ہوئی جاتی تھی دنیا کی جبیں
جس کی دوراندیش نظریں تھیں حقیقت آفریں　　جس کا قد ناپے ابھی ایسا کوئی آلہ نہیں

دل کو یہ محسوس ہوتا ہے اب اس کے قتل پر
ریزہ ریزہ ہو گیا جیسے ہمالہ ٹوٹ کر

خوف کھایا ہی نہ تھا جس نے کبھی اغیار سے　　دشمنوں کو بھی گلے جس نے لگایا پیار سے
جس نے گھبرانا نہ سیکھا تھا رہِ دشوار سے　　دیش کی کشتی بچائی تھی سدا منجدھار سے

موت نے صد حیف گھیرا اس کو منزل کے قریب
کشتیٔ عمر رواں ڈوبی ہے ساحل کے قریب

کب یہ سوچا تھا اپنا اک خطا ہو جائے گی　　قوم کی سچی مسیحائی سزا ہو جائے گی
وحشت و دیوانگی حد سے سوا ہو جائے گی　　فرقہ وارانہ جنوں کی انتہا ہو جائے گی

منصب و جاہ و حشم سے جس نے دامن بھر دیا
تم نے اس محسن کو آخر قتل کیسے کر دیا!

جس نے ماں کی گود میں سیکھا تھا جینے کا ہنر　　باپ کی شفقت نے بخشی وسعت فکر و نظر
محور علم و سیاست بن گیا تھا جس کا گھر　　دوسروں کے غم میں جس کی آنکھ ہو جاتی تھی تر

پیش کرتا ہوں اسے حسن عقیدت کا سلام
میری آنکھوں کا ہر آنسو اندرا گاندھی کے نام

جندر سریواستو

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے بات چیت

شریمتی اندرا گاندھی سے میں محض اس لیے متاثر نہیں ہوں کہ وہ ملک کے عظیم المرتبت رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی دختر یا وزیر اعظم اور ہماری قومی رہنما ہیں۔ قوم اور ملک کے لیے درپیش موجودہ داخلی اور خارجی پیچیدہ حالات سے نپٹنے کے لیے شریمتی اندرا گاندھی کی اختیار کردہ حکمتِ عملی اور اقدامات مجھ جیسے ایک قلم کار اور اخبار نویس کے لیے یقیناً متاثر کن ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کو میں نے مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے سٹی کالج گراؤنڈ حیدرآباد میں منعقدہ ایک جلسہ عام میں چند برس پہلے تقریر کرتے ہوئے سنا تھا اور ان کے خیالات' افکار اور نظریات کی صدائے بازگشت آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اندرا گاندھی سے میں متعدد مرتبہ ملاقات اور بات چیت کر چکا ہوں اور علٰحدہ تلنگانہ تحریک کی شدت کے دوران نئی دہلی میں ۱۹۶۹ء میں میری ان سے ملاقات بے باکانہ بات چیت' اور ان کے موقف بیان اور گفتگو کا ایک ایک لفظ آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے اندرا گاندھی' جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد ہماری قومی سیاست کے منظر پر ابھرنے والی وہ واحد شخصیت ہیں جن کی برابری اور ہمسری کی قلیل ترین اہلیت یا اہلیتوں کی حامل ایک بھی متبادل شخصیت اس وقت ملک میں کہیں نظر نہیں آتی۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ۲۶ ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ۸½ بجے صبح ان کی کوٹھی ۱۔ اکبر روڈ نئی دہلی پر میں نے سابق ریاستی وزیر اور رکنِ مقننہ جناب ایم باگا ریڈی کے ہمراہ ملاقات کی اس موقع پر ریاستی اسمبلی کے ممبران پی. گوردھن ریڈی' وی. وینکٹیشور راؤ' پی. راجم اور ایم. راجیندر ریڈی بھی موجود تھے۔ وزیر اعظم سے یہ ملاقات میری نئی تصنیف "مسلمان اور سیکولر دھارا" کی انھیں پیشکشی کے سلسلہ میں تھی۔ اس کتاب کی قبولیت کے لیے وزیر اعظم نے میرے لیے خصوصی وقت دیا تھا۔ جناب ایم باگا ریڈی نے بھی اس کتاب کے موضوع سے متعلق وزیر اعظم کو ایک مکتوب روانہ کرتے ہوئے "مسلمان اور سیکولر دھارا" کی پیشکشی کے لیے وقت مقرر کرنے کی خواہش کی تھی۔ جناب باگا ریڈی اور دیگر لیجسلیٹرس کے ہمراہ جب ہم ۳. اشوکا روڈ سے اکبر روڈ کے لیے موٹروں میں روانہ ہوئے تو اس وقت دہلی میں زبردست موسلا دھار بارش مسلسل جاری تھی اور ہم یہ قیاس تک بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وزیر اعظم کی قیام گاہ کے روبرو اس بارش کے باوجود دور دور تک سڑکوں پر کوئی اجتماع موجود ہو سکتا ہے۔ اس وقت مسز گاندھی کے مشتاقانِ دید کی تعداد ایک ہزار سے زائد افراد بشمول خواتین نوجوانوں' بوڑھوں وغیرہ پر مشتمل تھی جو اتر پردیش' بہار دہلی' ہریانہ' اور پنجاب جیسے دور دراز علاقوں سے اپنی مشکلات اور مسائل کے ضمن میں شریمتی اندرا گاندھی سے نمائندگی کے لیے وہاں موجود تھے۔ وزیر اعظم نے ہمارے گروپ کو ٹھیک ۹ بجے اپنے اجلاس پر طلب کیا۔ جناب ایم باگا ریڈی

نے میرا اور دیگر ارکان کا تعارف کروایا۔ میں نے اپنی کتاب "مسلمان اور سیکولر دھارا" ان کی خدمت میں پیش کی جس پر یہ الفاظ درج تھے۔

"شریمتی اندرا گاندھی کے لیے جو وزیر اعظم یا قوم رہتا ہے نہیں ہمارے قومی احساسات، امنگوں اور آرزوؤں کی روشن علامت ہیں"

اندرا جی نے اس تحریر کو بغور دیکھا اور پڑھنے کی کوشش کی جو حیدرآباد کے نامور خوشنویس محمود سلیم کی لکھی ہوئی تھی۔ کتاب پیش کرنے کے بعد میں نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے پہلے انگریزی اور بعد میں اردو میں یہ کہا کہ ہندوستانی مسلمان بدبختی سے کانگریس پارٹی اور آپ کی شخصیت اور قیادت سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں آسام کے سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے جب میں نے اس مسئلہ سے نپٹنے کے سلسلے میں مسلم احساسات سے انھیں باخبر کیا تو وزیر اعظم نے بیان کیا کہ آسام میں مسلمانوں کے تحفظ اور ترقی کے لیے ہم نے جو موقف اختیار کیا یا متعدد اقدامات عمل میں لائے اس کے نتیجے میں وہاں کی اقلیتوں خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً تمام مخالف سیاسی جماعتوں نے آسام کے بیرونی شہریوں کے سوال پر دوہرا رویہ اختیار کیا اور حالات کو بہتر بنانے اور بحالیٔ امن کے سلسلہ میں انھوں نے اپنے مفادات ہی کو عزیز رکھا۔ اس سلسلہ میں وزیر اعظم نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے تبدیل شدہ رویہ کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ بیرونی شہریوں کے مسئلہ پر کیا اس پارٹی نے اقلیتوں کے مفاد کی کوئی خدمت کی ہے؟ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے اس مرحلہ پر میں نے یہ کہا کہ تقریباً تمام مسلم جماعتوں نے المیۂ آسام کے سلسلہ میں، حقیقی قاتلوں اور خاطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کو ان حالات کا ذمہ دار قرار دیا ہے حالانکہ میری غور کردہ ناقابلِ تردید رائے میں آپ نے ہمارے قومی مفادات، سیکولر ڈھانچہ اور اپنی فکر و ذہن کے مطابق جو اقدامات کئے ہیں، انھیں نظر انداز یا فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اپنی اس کتاب "مسلمان اور سیکولر دھارا" میں مسئلۂ آسام کے پس منظر اور حقائق پر بحث کرتے ہوئے آپ کے رول کا احاطہ کیا ہے۔ میں نے اس بات پر بھی اظہار تاسف کیا کہ کانگریسی مسلمان ایک بے بنیاد اور زہریلے پروپگنڈے کے زیر اثر ہندوستانی مسلمانوں کو حقائق سے واقف کروانے کے سلسلہ میں تقریباً ناکام رہے ہیں۔ جناب ایم باگا ریڈی نے وزیر اعظم کو بتایا کہ چندر سریواستو نے انتہائی موثر اور دل نشین انداز میں آسام ٹریجڈی اور آپ کے قابلِ رشک و فخر رول پر اپنی کتاب میں کھل کر بحث کی ہے۔ جناب باگا ریڈی نے وزیر اعظم کو یاد دلایا کہ وہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے علاقائی مرکز کرنول کا افتتاح کر چکی ہیں اور سریواستو جی اسی ادارہ کے سکریٹری / ڈائرکٹر اور ایک بے باک حق پسند جرنلسٹ بھی ہیں۔ شریمتی گاندھی نے کہا کہ یہ بات انھیں یاد ہے۔ جناب باگا ریڈی نے ۱۹۸۰ء میں منعقدہ لوک سبھا کے انتخابات کی مہم میں حلقہ میدک میں میری خدمات اور کام کا تذکرہ بھی فرمایا۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ابتدا میں یہ دریافت کیا تھا کہ آسام کے نازک موضوع پر میں نے کتاب کس پس منظر میں لکھی ہے؟

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے مسلمانوں کی بے تعلقی یا دوری سے متعلق میرے راست اظہارِ خیال کی انھوں نے پوری سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ سماعت کی اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پہلی مرتبہ شاید ایسی حقیقت ان پر منکشف ہوئی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی سے میں نے اپنی کتاب پر اردو میں یادگار دستخط کرنے کی خواہش کی جس پر انھوں نے جب یہ کہا "اردو......!" اس مرحلہ پر فوری میں نے ان سے یہ کہا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اردو میں دستخط کر سکتی ہیں۔ شریمتی گاندھی نے میری اس خواہش کی مسکراتے ہوئے فوری تکمیل کی اور قومی دھارے میں مسلمانوں کی شمولیت اور موجودگی کی ثابت کرنے والی اس تصنیف پر اظہارِ خوشنودی کیا اور مبارکباد دی ـــ وزیر اعظم سے ۱۰ منٹ تک مسئلہ آسام پر ہی بات چیت ہوئی۔ انھوں نے سرکاری فوٹو گرافر کو خود طلب کیا اور اپنی شدید مصروفیت کے باوجود پندرہ منٹ کے بعد

وہ ہمارے پاس بار بار پہنچ گئیں اور گروپ فوٹو کے لیے موقع فراہم کیا۔ اس موقع پر ان کی قیام گاہ کی لانس پر سینکڑوں لوگ موجود تھے، جن میں ہندو، سکھ اور مسلمان بھی شامل تھے۔ اندرا جی نے میری کتاب کے (۳) زائد نسخے پارٹی کے لیے تحفتاً قبول کئے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے شریمتی اندرا گاندھی علی الصبح سے تقریباً نصف شب تک تھکا دینے والی مسلسل مصروفیات کے باوجود لوگوں سے حسین مسکراہٹ، خوش دلی، اخلاق و تہذیب اور زبان و بیان کی تازگی کے ساتھ ملتی ہیں اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض ایک نحیف خاتون نہیں ہیں۔ ہماری اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ہم نے کسی ریاست کے معمولی وزیر سے اعلیٰ عہدیدار تک لاتعداد شخصیتوں کے طرزِ عمل اور جھنجلاہٹ کے مناظر دیکھے ہیں جو اپنی تھکن اور سرکاری و عوامی مصروفیات کا اس انداز میں ذکر کرتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے ملنے والوں کو احسان مندی کا ایک اور موقع فراہم کر رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں اندرا گاندھی کا طرزِ عمل نہ صرف منفرد، بے مثال بلکہ واحد نظیر بلا خوفِ تردید قرار دیا جا سکتا ہے۔

نئی دہلی میں اپنے ۱۰ روزہ قیام کے دوران میں نے پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال سے سڑکوں، ہوٹلوں، ٹیکسیوں اور آٹو رکشاؤں میں مختلف اور متضاد سماجی اور سیاسی فکر کی ترجمانی کرنے والی بڑی اور عام شخصیتوں سے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بارے میں بات چیت کرنے کے بعد یہ انمٹ تاثر حاصل کیا ہے۔ مسز گاندھی سے بعض امور میں اختلافِ رائے کے باوجود سماج کے سبھی تمام طبقات انھیں حالتِ امن اور جنگ کی قومی رہنما قرار دیتے ہیں۔ اور ان حلقوں کو جنوبی ہند سے اٹھنے والی نئی علاقائی تحریکات اور آسام اور پنجاب کے واقعات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اپوزیشن اور علاقائی جماعتیں ملک کے اتحاد اور قومی مفادات کو منتشر اور متاثر کرنا چاہتی ہیں جبکہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ہندوستان کی وحدت سالمیت اور قومی اتحاد کے تحفظ کے لیے وقف ہیں — یہی وہ احساس یا تاثر ہے جو شریمتی اندرا گاندھی کو ہندوستانی قوم کے دلوں میں فوقیت اور وجاہت عطا کرتا ہے۔ دہلی کے حلقوں کا یہ خیال بھی ہے کہ لوک سبھا کے انتخابات قبل از وقت یا وقت مقررہ پر جب بھی منعقد ہوں، شمالی ہند حسبِ واحد کی طرح اندرا گاندھی کی پشت پناہی کرے گا۔ جنوب کی طرف سے وزارت عظمیٰ کے لیے استحقاق اور اس سلسلہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی پر زور وکالت نے شمالی ہند کے عوام کو اندرا گاندھی ہی کا ساتھ دینے کی طرف راغب کر دیا ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی جانب سے مسلمانوں کے حقوق اور مفادات بالخصوص معاشی و فلاحی حقوق کی تکمیل کے لیے اقدامات کی ابتدا ہو چکی ہے جس میں بہار میں پانچ کروڑ روپے کے سرمائے سے مسلم فینانشیل کارپوریشن کے قیام کے اعلان کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی اقدامات اتر پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور دیگر چند ریاستوں میں متوقع ہیں۔ ان ریاستوں میں سرکاری اور نیم سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کو بہتر بنانے کے لیے بھی شروعات ہو چکی ہے۔

(بشکریہ "قومی زبان" ستمبر ۱۹۸۴ء)

★

اِندرا گاندھی

شریمتی اندرا گاندھی کے
اردو
میں دستخط

اُما چکبست ـــــ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

چاچا نہرو کی بیٹی کے ساتھ

انٹرویو

اُما چکبست: آج کی اس ملاقات میں اندرا جی میں آپ سے ہندستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے پیارے چاچا نہرو کی بیٹی کی حیثیت سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی زندگی کے ورق الٹنے کے ساتھ ساتھ چاچا نہرو کی شخصیت کا بھی مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔ چاچا نہرو کو دنیا کے تمام بچوں سے بے پناہ محبت تھی تو پھر آپ جو ان کی اکلوتی بیٹی ہیں آپ سے کس قدر محبت ہوگی اس کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ کی پرورش میں نہرو جی نے خاص توجہ دی۔ اسی لیے عام روش سے ہٹ کر ان کے خطوں میں جو انھوں نے آپ کو بچپن میں لکھے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا وجود کیسے ہوا؟ انسان اور دوسرے جانداروں نے کیسے ترقی کی؟ تاریخ کے دور کے شروع ہونے تک۔ اس کے علاوہ عالمی اتہاس کی جھلک ان خطوں میں ہمیں ملتی ہے۔ جب آپ کو یہ خط ملتے تھے تو ان کو پڑھتے وقت آپ اکتاہٹ محسوس کرتی تھیں یا ان میں دلچسپی ہوتی تھی آپ کو۔

شریمتی اندرا گاندھی: میں جب چھوٹی تھی تو میں بہت سے سوال کرتی تھی۔ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ کب ہوا؟ اور جب بھی ان کو وقت ملتا تھا تو وہ اس کا جواب دیتے تھے۔

اُما چکبست: آپ ان کو پاپو کہتی تھیں؟

شریمتی گاندھی: پاپو کہتی تھی۔ اور وہ ایسے شروع ہوا کیونکہ گاندھی جی کو ہم باپو کہتے تھے تو اس وجہ سے اس کو اس میں ملایا کسی طرح سے تو جب میں قریب آٹھ برس کی تھی تو گرمیوں میں اپنی ماں کے ساتھ میں مسوری گئی تھی۔ اور وہ الٰہ آباد میں تھیں۔ تو جانے کے پہلے میں نے ان سے یہی پوچھا تھا دنیا کیسے شروع ہوئی؟ کون پہلے اس میں جیتے تھے؟ کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں انھوں نے پہلے وہ کتاب لکھی (باپ کے خط بیٹی کے نام) تو وہ چھپنے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے اور میں تو بہت دلچسپی سے ان کو پڑھتی تھی اور پڑھ کے ان سے بہت باتیں پوچھا کرتی تھی۔ بعد میں جب وہ جیل میں تھے لمبے عرصے کے لیے تب انھوں نے سوچا کہ اور آگے اس کو لے جائیں اتہاس میں اور یہ دوسرے خط لکھے۔ وہ خط مجھے ایک ایک کر کے نہیں ملے کیونکہ جب جیل میں تھے تو وہ ایک ہی خط لکھ سکتے تھے۔ کئی جیلوں میں تھے، نینی میں تھے اور کبھی دہرہ دون میں تھے کبھی

کہیں اور سے۔ وہ ادھر اُدھر بھیجے جاتے تھے۔ لیکن خط مہینے میں دو لکھ سکتے تھے۔ اور ایک ہی کو لکھ سکتے تھے ایک خط۔ تو عام طور سے جو بھی لوگ جیل میں ہوتے تھے تو وہ ایک سارے پریوار کو سارے خاندان کو لکھتے تھے جو ظاہر ہے وہ اپنی ہی خبر دیتے تھے۔ اس لیے یہ خط انہیں رکتے تھے باہر یہ تو کبھی کبھی ناجائز طریقے سے۔ جیسے کوئی ملاقات کے لیے گیا تب دے دیا یا ہم نے کچھ سامان ان کو بھیجا ہوا اس میں چھپا کے بھیج دیا۔ کچھ تو ویسے آئے اور کچھ تو جب جیل سے چھوٹے تب بہت بڑی گڈی کی شکل میں آئے۔

اُما چکبست: آپ جب نہرو جی سے ملنے جاتی تھیں جیل میں۔ میں نے ان کو خطوں میں پڑھا ہے کہ وہ لکھتے تھے کہ پندرہ دن میں آپ ایک بار ان سے مل پاتی تھیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپ کی ماں دونوں جیل میں ہوتی تھیں اور ماں اور باپ کے بیچ میں مسینجر کا کام آپ کرتی تھیں۔ اس بارے میں کچھ آپ کو یاد ہے؟

شریمتی گاندھی: ہاں بہت اچھی طرح سے یاد ہے تب اتنی چھوٹی تو نہیں تھی میں اور خالی ان کی نہیں کیونکہ اس وقت تو ہم لوگ اتنے زیادہ آزادی کی لڑائی میں پھنسے تھے کہ ہم سبھی کو خاندان مانتے تھے۔ آپ نے شروع میں کہا کہ نہرو جی سب بچوں سے پیار کرتے تھے اور مجھ سے زیادہ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سب کو برابر دیکھتے تھے۔ میں وہاں تھی لیکن وہ مجھے دوسروں سے زیادہ اپنا نہیں سمجھتے تھے سب بچوں کو وہ اپنا سمجھتے تھے اور اسی طرح سے ہم بھی جو دوسرے لوگ جیل میں تھے ان کو بھی سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے خاندان کے ہیں۔ تو اگر ان سے کوئی ملنے نہیں جا سکتا تھا تو ہم لوگ ملنے جاتے تھے ان کے لیے خط لکھتے تھے تو ان کی بھی خبر یا سندیش ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے۔

اُما چکبست: اچھا اندرا جی چونکہ آپ کے ماں اور باپ جیل میں رہتے تھے اور دادا بھی آپ کے موتی لال جی بھی کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ بھی گھر میں نہیں ہوتے تھے وہ بھی جیل جاتے تھے۔ تو آپ کو اکیلے پن کا احساس بہت کھٹکتا ہوگا۔

شریمتی گاندھی: نہیں مجھے تو بالکل یاد نہیں اکیلا پن اس وقت۔ اور خالی میرے ماں باپ دادا دادی نہیں لیکن میری نانی میرے جتنے ماما تھے کئی چچیرے بھائی پتا جی کے۔ میرے چچیرے بھائی بھاوج ہمارے پریوار میں سے مجھے پتہ نہیں کم سے کم پینتالیس لوگ تو جیل میں ہوں گے ایک وقت میں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر جیل نہ جائیں تب کچھ غلط بات ہے ٹھیک سے آندولن میں نہیں لگے ہیں یا اپنا فرض ادا نہیں کر رہے ہیں ملک کے لیے۔

اُما چکبست: اس کے علاوہ آپ تو اکلوتی بیٹی تھیں نہرو جی کی اس کی وجہ سے انھوں نے آپ کی ہر خواہش پوری کی ہوگی لیکن کیا کبھی آپ کو ٹوکتے بھی تھے — آپ کی بیجا خواہش پر؟

شریمتی گاندھی: ایک تو مجھے خواہش کرنی یاد ہی نہیں بالکل کبھی میں نے کوئی چیز مانگی نہیں جہاں تک مجھے یاد ہے۔ خالی ایک دفعہ مجھے کوئی ایک گھڑی چاہیے تھی اور وہ بالکل مہنگی بھی نہیں تھی لیکن میرے ماتا پتا نے کہا کہ دیکھو کہ تم ابھی مانگ رہی ہو بہت جلدی اس سے اوب جاؤ گی اور ابھی کا یہ فیشن ہے یہ چلنے والا نہیں ہے۔ لیکن میں نے بہت ضد کی تو مجھے مل گئی۔ اور جو انھوں نے کہا تھا وہ بالکل سچ نکلا۔ کیونکہ دو ہفتے کے بعد مجھے وہ اچھی نہیں لگی۔ تو اس سے میں نے عمر بھر کے لیے ایک سبق سیکھا۔ کہ اس طرح سے اکثر چاہیے ہوتی ہیں بچپن میں کھلونے بعد میں دوسری چیزیں لیکن اصل میں ان کی بہت کم جگہ ہے کسی کی بھی زندگی میں۔ سوال ڈانٹ میں نے اکثر کھائی یہ کس چیز پر کھائی یہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔

اُما چکبست: اچھا اس کے علاوہ جیب خرچ دیتے تھے آپ کو نہرو جی؟

شریمتی گاندھی: کیونکہ گھر کا خرچ تو میں کر رہی تھی وہ کیا دیتے وہ لوگ تو وہاں رہتے ہی نہیں تھے۔ میں تو بہت چھوٹی تھی جی ہاں میں باہر کہیں جاتی تھی ریل پہ اکیلے ہی جانا ہوتا تھا ٹکٹ لینا ہوتا تھا گھر سنبھالنا ہوتا تھا میں سبھی کچھ خود دیکھتی تھی کس اسکول جاؤں گی کیا پڑھوں گی یہ مجھے ہی کو تبھی سے کرنا پڑ رہا تھا۔

اُما چکبست: اچھا نہرو جی کا غصہ بہت مشہور ہے۔ بہت پیاری شخصیت تھی ان کی۔ مگر ان کو غصہ بھی بہت آتا تھا تو کیا کبھی آپ کو بھی ان کا غصہ سہنا پڑا۔

شریمتی گاندھی: نہیں مطلب سہنا پڑا کیا غصہ ہوئے ہوں گے لیکن مجھ پر اس کا کچھ اثر پڑتا نہیں تھا۔ کیونکہ میں نے کبھی اس کو غصہ مانا نہیں اور اصلیت

میں وہ غصہ نہیں تھا۔ وہ تھا جسے انگریزی میں اریٹیشن کہتے ہیں، الجھا کہ جب کوئی کام ٹھیک نہیں کر رہا ہے یا کوئی بیوقوفی کرے اس چیز پر وہ الجھتے تھے اور وہ اسی وقت ختم ہو جاتی تھی وہ چیز اور اس آدمی سے کبھی کبھی معافی بھی مانگ لیتے تھے، پیار بھی کر لیتے تھے اور ایک طریقہ تھا ان کا کہ کام اچھی طرح سے ہو۔ مگر میں جب ایسے ان کو دیکھتی تھی تو میں ان کو ہمیشہ ٹھنڈا کر دیتی تھی۔

اُما چکبست : اچھا، وہ کیسے؟ پیار کر کے؟

شریمتی گاندھی : نہیں نہیں مجھے پتہ نہیں وہ تو موقع پر تھا کہ کس طرح سے اس چیز کو بدلے جس سے اس پر سے دھیان ہٹ جائے دوسرا کچھ ہو۔

اُما چکبست : اس کے علاوہ اندرا جی آپ کی والدہ کملا نہرو نے جب بچوں کی جو آپ نے بریگیڈ بنائی تھی اس کو بانر سینا کا نام دیا تو آپ کو برا نہیں لگا کیونکہ بانر جو بندر ہوتے ہیں وہ تو توڑ پھوڑ کے لیے مشہور ہوتے ہیں اور آپ اتنا اچھا کام کر رہی تھیں۔

شریمتی گاندھی : نہیں ہم تو بہت خوش ہوئے کیونکہ ہماری اس بانر سینا کا مقصد کیا تھا؟ اس کا مقصد تھا کہ جو کام بڑے کر رہے ہیں اس میں ہم مدد کریں۔

اُما چکبست : وہ کیسے کرتی تھیں آپ؟

شریمتی گاندھی : اب بانر جو تھے انھوں نے رام چندر جی کی مدد کی تو ہم اس طرح سے دیکھ رہے تھے کہ یہ بہت بڑے کام ہیں، بہت بڑی لڑائی میں یہ لوگ لگے ہیں۔ یہ سب کام ہم نہیں کر سکتے ہیں تو جو بھی کر سکتے ہیں اتنا ہم کریں۔ بندروں نے پتھر اٹھائے اور ایسے دوسرے دوسرے کام کیے۔ کچھ تو بالکل ہی چھوٹے بچے تھے تو ان سے ہم کبھی کہیں خبر بھیجنی ہو تو وہ کام کرتے تھے۔ دوسرے دفتر کا کام تھا جو خط لکھ سکتے تھے لڑکے لڑکیاں وہ خط لکھتے تھے یا پوسٹر بنانا ہو، اعلان کے لیے کچھ لکھنا ہو، اخبار کے لیے کچھ لکھنا ہو، پھر جب جلوس نکلتے تھے تو پانی پلانا کھانا کھلانا، کسی کو چوٹ لگی ہو ڈاکٹر کے پاس لے جانا بہت سے چھوٹے چھوٹے ایسے کام ہیں۔ دوسرے جو ایک کافی ضروری کام تھا وہ یہ تھا کہ اکثر پولیس والے تھانے پر جو گپ شپ کرتے تھے تو جو گلی کے لڑکے وہاں گلی میں کھیلتے تھے، بہت سی باتیں ان کو سننے میں ملتی تھیں کون گرفتار ہونے والا ہے کہاں پر تلاشی ہوگی کہاں کیا ہوا۔ تو وہ سب خبریں ہمیں لاکے دیتے تھے۔ جو ہم بڑوں کو دے سکتے تھے اور بہت سی باتیں ہمیں پتہ چلتی تھی۔ اور پھر جھنڈے سینا، کھانا بھی پکانا جیسے بڑا جلوس یا میٹنگ ہوا اور والنٹیرس کو کھلانا بہت سے ایسے کام اس وقت سب کام تو مجھے یاد بھی نہیں آرہے ہیں۔ جلوسوں میں شامل بھی ہوتے تھے۔

اُما چکبست : تو آپ کی بانر سینا کے بارے میں کیا انگریزوں کو نہیں معلوم ہوا تھا؟

شریمتی گاندھی : ہاں جب پکڑے جاتے تھے تو پٹتے تھے۔ ہم بھی پٹے ہیں پولیس تھانے میں۔

اُما چکبست : ان کو پتہ چل گیا تھا کہ بچے یہ کام کر رہے ہیں۔؟

شریمتی گاندھی : بچے کر رہے ہیں کہ نہیں یہ پتہ نہیں اگر دیکھتے تھے کوئی بچہ پکڑا گیا کوئی خط ہے، یا پوسٹر چپکا رہا ہے کچھ اعلان وغیرہ ہے تو پھر پکڑ کے پٹائی ہوتی تھی۔

اُما چکبست : "ڈسکوری آف انڈیا" میں نہرو جی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کو دوبارہ مطالعہ کرنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا تو اس کام کو آپ نے پورا کیا۔

شریمتی گاندھی : اس وقت تو میں کافی بڑی ہو گئی تھی میں تھوڑا بہت ان کے سکریٹری کا کام بھی کر رہی تھی۔ ٹائپنگ بھی کرتی تھی، ان کے لیے اپنے دوسرے بہت سے خط وغیرہ کا جواب دینا۔

اُما چکبست : اچھا ٹائپنگ جانتی ہیں؟

شریمتی گاندھی : اب اتنی اچھی تو نہیں جانتی لیکن کام چلاؤ تو تھا ہی، "ڈسکوری" کے پروف میں نے پڑھے اور ایسے وقت جب میں سخت بیمار تھی مجھے بخار بھی بہت تیز تھا اور تمام منہ سوجا ہوا تھا۔ لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کیونکہ وہ کلکتے میں تھے اور میں الہ آباد میں تو وہاں سے وہ لکھتے پروف جلدی کیوں نہیں آرہے ہیں، بار بار خبر بھیج رہے تھے۔

اُما چکبست : ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہوں گی کہ اسکول میں آپ کے ٹیچر جتنی تعلیم دیتے تھے اس کے علاوہ آپ جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں؟

شریمتی گاندھی: دیکھئے میں تو سمجھتی ہوں کہ جانکاری ہر سکینڈ لوگ حاصل کرتے ہیں چاہے کسی سے بھی لیں۔ میں نے کبھی بھی کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں مانا۔ میرے پتا جی کی کتاب میں اور خطوں میں بھی شاید آپ نے دیکھا ہوگا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ پتھر سے بھی ہم سیکھتے ہیں۔ پودوں سے ہر چیز سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ تو ہر وقت اپنی آنکھ اور کان کھلے رہنے چاہیئں اور بھی میں دورے میں جاتی ہوں۔ دورہ تو راج نیتک ہوتا ہے لیکن میں کھلی جیپ میں کھڑی ہوتی ہوں۔ ایک طرف تو میں لوگوں کو دیکھتی ہوں اور ان کو نمسکار کرتی ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ایک کو دیکھوں الگ الگ۔ یہ نہیں کہ ایک بھیڑ ہے لیکن ہر ایک کی آنکھ دیکھوں۔ کیونکہ اس سے ایک سمبندھ بنتا ہے لیکن جتنا اور بھی سب ہو رہا ہوتا ہے وہ بھی سب اس کی تصویریں میرے من میں آتی ہے۔

اماچکبست: آپ شانتی نکیتن جب گئیں تو وہاں جانے سے آپ کی زندگی میں کوئی نیا موڑ آیا؟

شریمتی گاندھی: ہاں کیونکہ اس کے پہلے کلا اور سنگیت کا تو تھوڑا بہت ہمارے گھر میں تو بالکل سنگیت نہیں تھا۔ لیکن شانتی نکیتن جانے کے پہلے میں پونا میں اسکول میں تھی۔ اور وہاں جن کا اسکول تھا وہ وشنو دگمبر کی شاگرد رہ چکی تھیں خود بہت اچھا گاتی تھیں۔ اور ان کو بہت شوق تھا تو ان کے سنگ جتنے اچھے وہاں پہ ہوتے تھے گانے کے سیشن یا کنسرٹ اس میں جایا کرتی تھی۔ لیکن وہ ایک باہری چیز تھی روز مرہ کی چیز نہیں تھی۔ شانتی نکیتن میں تو زیادہ سمبندھ ان سب چیزوں سے بھی بنا اور بھی بڑھی اور پرکرتی سے بھی اور زیادہ پاس گئے کیونکہ الہ آباد میں تو ہم ہمیشہ جیسا۔ آپ نے کہا اکیلے پن کا احساس۔ مگر اکیلے پن کا موقع ملا ہی نہیں۔ ہمارے یہاں ہمیشہ ایک بھیڑ رہتی تھی کسانوں کی بھی جیولوں کی۔ ہندوستانیوں کی۔ انگریزوں کی۔ آندولن چل رہا تھا تب بھی ہمارے یہاں انگریز فرانسیسی الگ الگ دیش کے لوگ ودیگیانک آتے رہتے تھے۔

اماچکبست: اصل میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ کی شخصیت میں جو گہرائی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں آپ کو کافی اکیلے پن یا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے یہ گہرائی پیدا ہوئی۔ اس لیے میں نے کہا تھا۔

شریمتی گاندھی: جو اکیلا پن ہوتا ہے اس سے لوگوں سے کچھ مطلب نہیں ہے طاقت ہوتی ہے اندرونی اپنے اندر ہوتی ہے۔ میں بھیڑ میں رہ کے بھی اکیلی ہو سکتی ہوں اور اکیلی رہ کر بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اکیلا پن مجھے لگے۔

اماچکبست: اور بچپن کی کچھ شرارتیں آپ کو یاد ہیں۔؟

شریمتی گاندھی: شرارتیں تو میں بہت تھی۔ لیکن اب کس عمر میں وہ بند ہوئیں یہ مجھے پتہ نہیں۔ بہت چھوٹی تھی۔ ایکدم جب بولنا شروع کرتے ہیں، اس وقت کا۔ چار برس کی ہوں گی تب مجھے یاد ہے کہ میری چھوٹی پھوپھی جو تھیں تو ان کے پاس ان کی کوئی کریم تھی منھ پہ لگانے کی میرا ایک بھالو بہت پیارا کھلونا تھا۔ ایک دن یہ لوگ سب باہر گئے تھے میں نے سوچا بھالو کو اور سندر بناؤں گی اور وہ ساری کریم اور مجھے کیا معلوم تھا کہ کسی نے ان کو بہت ہی مہنگی کریم جو نئی چیز ولایت میں نکلی تھی، ولایت سے بھیجی تھی اور سارا کریم تمہا نے اپنے بھالو پر لگایا، وہ بھالو تو بالکل ستیاناس ہو گیا کیونکہ اس کے بال وال چپک گئے اور کبھی دھونے سے بھی ٹھیک نہیں ہوا وہ۔ اور اس پر بھی بڑی ڈانٹ پڑی تھی، انھوں نے ڈانٹا۔ مطلب ماں باپ نے نہیں۔ اور یہ بات ہوئی ڈلہوزی میں جب ہم چھٹیوں میں، گرمیوں میں وہاں گئے ہوئے تھے اور وہیں پہ ایک دن مجھے کچھ کرنے کو نہیں تھا اور دھوبی کے کپڑے آئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا میں ان کو پھر سے دھوؤں گی۔ سب کپڑوں کو لیکے ٹب میں ڈالا۔ اس میں بھی کپڑے اور صابن اور سب لے کر سردی میں بیٹھی تھی۔ جب لوگ آئے تو مجھے نکالا۔

اماچکبست: اس کے علاوہ بچپن میں آپ کو کون سے کھیل اچھے لگتے تھے؟

شریمتی گاندھی: کھیل میں نے بہت کم کھیلے ہیں۔ مجھے دوڑنے کا شوق بھی تھا اور میرے پتا جی کی بھی بہت خواہش تھی کہ میں اچھا دوڑ دوں۔ تو اس لیے مجھے ہمیشہ دوڑنا ہوتا تھا۔ اور کافی تیز ایک تو تیزی سے دھیان دینا ہوتا ہے اور کس طرح سے کس ڈھنگ سے اس پر بھی ان کا دھیان اتنا ہی جاتا تھا۔ تیرنے کا بھی مجھے بہت شوق تھا کیوں کے ہمارے گھر تالاب تھا۔ اور گھوڑے پر بھی چڑھتی تھی۔ پیڑ پر چڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔

اُماچکبست: ہاں تو گری بھی ہوں گی کبھی یا نہیں ؟

شریمتی گاندھی: ہاں ایک دفعہ گری اور سر ٹوٹتے ٹوٹتے بھی بچا۔ مگر بچ گیا۔

اُماچکبست: اس کے علاوہ ڈرامے آپ نے کیے ہیں۔ اسکول میں اپنے ؟

شریمتی گاندھی: اسکول میں بڑی ہوئی تب کیے ہیں لیکن مجھے شوق تھا ڈرامہ کرنے کا تو میری چھوٹی پھپھیری بہنیں تھیں ان پر میں ذرا کچھ کم ظلم نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ ان کو زبردستی پاٹھ سکھا کے کبھی کبھی تو میں خود ہی لکھتی تھی اور کبھی کبھی کہیں ڈھونڈ کے ان سے ناٹک کرواتی تھی۔ ہاں بہت برس ہوئے ایک دفعہ کشمیری صاحبہ نے ناٹک پرنس چنڈ کیا تھا الٰہ آباد میں تو اس میں ہم سب نے حصہ لیا تھا۔ میری چھوٹی پھپھی نے بھی۔ اور میں نے بھی۔

اُماچکبست: اور اس کے علاوہ ناچ گانے کا ؟

شریمتی گاندھی: ناچنا تو پھر بعد میں شانتی نکیتن میں سیکھ رہی تھی گانے کی آواز تو میری کبھی اچھی نہیں رہی اور یہ مجھے بہت برا لگتا ہے کہ میں اچھا نہیں گا سکتی۔

اُماچکبست: اندرا جی آپ ٹیگور سے ملیں اور گاندھی جی سے بھی ملیں۔ اتنی بڑی بڑی شخصیتوں کے بارے میں آپ کچھ بتائیں گی۔

شریمتی گاندھی: ویسے ٹیگور کو میں پہلے سے نہیں جانتی تھی تو ان کا تھوڑا رعب تھا گاندھی جی کو تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ہی ہیں تو ان سے مذاق کرتے تھے اور ایک تو مجھے میں ان سے جب چھوٹی تھی تو ناراض رہتی تھی۔ میں نے کہا تھا آپ نے میری ناک گھسیٹ کے ملی کی ہے۔ لیکن ٹیگور کا مجھ پہ کچھ رعب تھا۔ جب میں شرودنا میں گئی۔ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ بھئی یہ لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں، تم ملنے نہیں آتی ہو۔ میں نے کہا آپ کتنے کام میں ہوں گے۔ میں تو آنا چاہتی ہوں لیکن آپ کا وقت کیسے ضائع کروں تو انھوں نے کہا نہیں آیا کرو۔ اس کے بعد ہم تین چار لڑکیاں اکثر شام کو ان کے پاس جاتے تھے۔ اور ہر طرح کی بات کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی۔ کبھی وہ سناتے تھے کبھی ہم پوچھتے تھے۔

اُماچکبست: اور گاندھی جی سے آپ کا کیا جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ ؟

شریمتی گاندھی: جھگڑا تو ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کی کئی باتیں مجھے نہیں اچھی لگتی تھیں۔

اُماچکبست: جیسے ؟

شریمتی گاندھی: اب اس وقت ہر ایک بات تو یاد نہیں ہے لیکن کئی چیزیں تھیں جو مجھے لگتا تھا ان کے وچار ہیں۔ یا انھوں نے ٹھیک نہیں کہا ہے۔

اُماچکبست: کیوں ؟ آپ تو اتنی چھوٹی سی تھیں ؟

شریمتی گاندھی: نہیں مجھے کبھی لگا نہیں کہ میں چھوٹی ہوں کیونکہ گھر میں تو جو میں کہتی تھی وہی زیادہ چلتا تھا۔ میرے دادا سے سب ڈرتے تھے سوائے میرے۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ میں نے آدر نہیں کیا کیونکہ آدر تو میں آج بھی بڑوں کا بھی چھوٹوں کا بھی سب کا آدر کرتی ہوں لیکن من میں سب کو برابر دیکھنا یہ شروع سے تھا۔

اُماچکبست: اچھا آپ کس عمر میں سب سے پہلے جیل گئیں ؟

شریمتی گاندھی: آزادی کے آندولن میں تو ایک ہی دفعہ گئی۔ تب تو میری شادی ہو چکی تھی۔ بیالیس میں۔

اُماچکبست: اچھا بڑی عمر میں۔

شریمتی گاندھی: لیکن پولیس لاک اپ میں۔ ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لیے تھی۔ اور سب میں پہلے جب مجھے مار پڑی تب مجھے یاد نہیں کہ میری کیا عمر تھی۔ لیکن میں پونا گئی اس کے پہلے کی بات تھی جھنڈا چڑھایا جا رہا تھا الٰہ آباد کالج میں۔ میں تو خالی دیکھنے گئی تھی لیکن جو اسٹوڈنٹ چڑھا رہا تھا اس کو پولیس نے مارا اور جھنڈا گرانے کی کوشش کی اس نے دوسرے کو دیا اس طرح ایک ایک کر کے اور آخر میں کیا بیچ میں کسی نے میرے ہاتھ میں رکھا۔ اتنا بھاری تھا میرے لیے کہ مجھ سے سدھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ میں گراؤں نہیں اس کو کسی طرح سے خیر پھر کسی اور نے لے لیا اور پھر مجھے مار پڑی تو میں تو گر گئی۔ ہاں رسیلا آپ نے پوچھا تھا مجھے ایک بہت بڑا کام جو انھوں نے کیا وہ اس وقت یاد نہیں رہا تھا وہ یہ تھا کہ الٰہ آباد کے پاس گولی کانڈ ہوا تھا اور اس میں کئی لوگ گھائل ہوئے لیکن تین لڑکوں کو بہت زیادہ چوٹ لگی اور

اس وقت انگریزوں نے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ کوئی علاج نہ کریں۔ تو میری ماں گئی تھیں، ہماری موٹر میں ہمارے گھر لائیں اور ہم نے اپنے گھر میں چھوٹا سا اسپتال جیسا بنایا۔ کیونکہ ان کو فوراً آپریشن کرنا تھا گولیاں نکالنے کے لیے۔ تو دو کی تو آسانی سے نکل گئیں ایک کو بہت زیادہ لگی تھیں اس کے تمام پیٹ اور انتڑیاں وغیرہ سب نکل گئیں تھیں۔ تو ڈاکٹر نے کہا کہ یہ بچ نہیں سکتا ہے قریب ہم سے تھوڑا ہی بڑا تھا وہ عمر میں۔ اس وقت بھی ہمارے جو لڑکے لڑکیاں تھے انھوں نے لانے میں، دوڑنے میں، دوائی منگانی تھی۔ کمرہ صاف کرنا تھا ہر چیز میں اس چیز میں بھی بہت مدد کی اور ہم دو تین بڑی لڑکیاں اتنی بڑی تو خیر نہیں تھے تب بھی پتہ نہیں تیرہ چودہ کیا عمر تھی تو ہم نے نرسنگ کا کام اس وقت ہم نے کیا اور کچھ آتا نہیں تھا لیکن اس وقت سیکھا۔ کیونکہ ڈاکٹر بتاتے تھے کہ ایسا کرو ویسا کرو اور رات دن بیٹھے بھی جب تک اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ ہم نے کہا ہم نہیں کھائیں گے، ہم پیئں گے نہیں، اس کو ٹھیک کر کے اٹھیں گے۔

اُماچکبست : تو سماج سیوا کی بھاؤنا بچپن سے تھی آپ کو۔

شریمتی گاندھی : ہاں خیر وہ تو لازمی تھا۔ جس گھر میں پیدا ہوئے۔

اماچکبست : نہرو جی بھارت کے بچوں کو کیسا دیکھنا چاہتے تھے اندرا جی۔

شریمتی گاندھی : اچھے ناگرک۔ جو دیش کی، ملک کی ایکتا کو مضبوط کریں۔ اور ہر طرح سے۔ ملک کیسے بڑھے۔ مطلب ایک تو بڑھنا ہے کہ غریبی دور ہو، یہ بہت ضروری ہے لیکن اس کے سنگ سنگ دماغ بڑھے نئے خیالات آئیں اور دوسروں کی نقل نہ کریں۔ ایسے اپنے یہاں بھی ہم نئی چیزیں پیدا کریں۔ ایسے مطلب دیکھنے کی استعمال کرنے کی چیزیں بھی اور خیالات بھی کیونکہ ملک اونچا تو انھیں چیزوں سے ہوتا ہے۔ کسی کی نقل سے اونچا نہیں ہو سکتا ہے۔ چاہے امیر ہو جائے تو یہ سب باتیں تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ بچے ہی آگے کر سکتے تھے ہمارے زمانے میں تو اتنا ہوگا نہیں۔

اُماچکبست : اور اس میں آپ یہ نہیں سمجھتی ہیں کہ جیسے آپ نے بتایا ہمیں کہ آپ کے ماں باپ ایک اچھے ساتھی تھے اسی طرح سے جو ہمارے سماج میں ماں باپ ہیں ان کو بھی اپنے بچوں کا اچھا ساتھی ہونا چاہئے۔

شریمتی گاندھی : ظاہر ہے۔ اور دکھ کی بات یہ ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی عورت کام کر رہی ہے نوکری کر رہی ہے اور اپنے بچوں کو اتنا وقت نہیں دے سکتی یا سماج سیوا کر رہی۔ میرے ہی بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ بچوں کو پورا وقت دیا ہے کہ نہیں لیکن جب کوئی کام کرتے ہیں تو دھیان رکھتے ہیں کہ جو وقت ہے اس کا اچھا استعمال ہونا چاہیے خاص طور سے بچے جب ہوں۔ تو وہ وقت۔ بچوں کا ہونا چاہئے۔ یا خاندان کا یا جو بھی ہو بہت سی عورتیں ہیں جو کچھ کام نہیں کرتی ہیں لیکن وہ وقت ان کے بچوں کا نہیں ہوتا ہے۔ گپ شپ کر رہی ہیں۔ یا کچھ اور گھر کا کچھ کر رہی ہیں تو بچے کو اتنا ہی اکیلا پن لگ سکتا ہے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ایک کہانی میں نے بھی سنائی ہے جب سنجے بہت چھوٹا تھا کنڈر گارڈن میں تھا تو اس کے ایک دوست کی ماں مجھ سے ملنے آئیں اور کہا کہ آپ تو اس کام میں لگی ہیں تو آپ اتنا وقت نہیں دے سکتی ہوں گی۔ بچوں کو۔ تو میں سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دوں، جب سنجے نے کہا کہ آپ کا لڑکا تو کہتا ہے کہ آپ دن بھر برج کھیلتی ہیں۔ آپ کب وقت دیتی ہیں، تو اس لیے یہ ہے ہر ایک کو خود دیکھنا ہے کہ کیسے دھیان دے سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ بچے کی پرسنالٹی ہے، وہ بڑھنے دینی چاہئے۔ اپنی پرسنالٹی کو بچے پر نہیں ڈالنا چاہئے۔

اُماچکبست : اچھا نہرو جی جب پہلی بار نانا بنے تو عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو نانا دادا ہی زیادہ دلار کرتے ہیں تو آپ کو کچھ یاد ہے۔ ؟

شریمتی گاندھی : پہلے تو انھوں نے بچے کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ جیل میں احمد نگر فورٹ میں تھے۔ اور انھوں نے جب پہلی دفعہ دیکھا تو بہت ہی تھوڑی روشنی میں نینی جیل کے پھاٹک پر اس میں ہم نے کوشش کی کہ بہت اونچا اٹھائیں بتی کے پاس۔ اور وہ دیکھ لیں بچے کو۔ نہ انھوں نے مجھے اپائل کیا جب میں چھوٹی تھی اور نہ اپنے نواسوں کو کیا۔

اُماچکبست : اور بچوں سے ان کو کیا امید تھی ؟

شریمتی گاندھی : اب بھی امید تھی کہ وہ خود سوچنا سیکھیں، جیسے میں نے پہلے کہا کہ اچھے ناگرک بنیں۔ اور یہ نہیں کہ شیطانی نہ کریں، شیطانی تو بچوں کو کرنی چاہئے لیکن توڑ پھوڑ یا جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے یا دوسرے کو چوٹ لگے

(باقی ملاحظہ ہو)

ایک اور انٹرویو

مارٹن اوبرین

مجھ پر بارہا حملے ہوئے اور میں نے کافی چوٹیں کھائیں

[واردات قتل سے کچھ دن پہلے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے امریکہ کے مردوں کے ایک فیشن میگزین "M" کے مارٹن اوبرین کو بالکل شخصی نوعیت کا انٹرویو دیا تھا جو میگزین کے اکتوبر ۱۹۸۴ شمارے میں چھپا ہے مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ انھیں اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے کہ انھیں یاد رکھا جائے اور یہ سوچنا بہت زیادہ فخر کرنا ہوگا کہ ہندستان نے ان سے کچھ حاصل کیا ہے بلکہ یہ تو میں ہوں جس نے ہندستان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے میگزین کی طرف سے مسز گاندھی سے پوچھا گیا تھا کہ وہ کس طرح یاد کی جانا پسند کریں گی؟۔

جواب میں انھوں نے کہا تھا "یہ عجیب بات ہے کہ میرے والد جواہر لال جی تاریخ داں تھے اور تاریخی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ تاریخ کے متعلق میرا احساس ویسا نہیں ہے"۔

مسز گاندھی نے کہا کہ "وہ ہمیشہ اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کرتی ہیں دوسرے لوگوں کے مسائل کے بارے میں وہ ہمیشہ فکر مند رہتی ہیں۔ اگرچہ میں بنیادی طور پر ایک نظام کے تحت ہوں مگر درحقیقت میں نظام مخالف شخصیت ہوں میں لوگوں کی جانب عددی حساب و نظر سے نہیں دیکھتی میں انھیں انفرادی اور شخصی طور پر دیکھتی ہوں۔ حتیٰ کہ ایک کھلی جیپ سے بھی ان کو ایک بھیڑ کی شکل میں نہیں دیکھتی بلکہ ان کے الگ الگ چہرے دیکھتی ہوں۔ وہ میرے لیے ایک ایک فرد ہوتے ہیں نہ کہ ایک ہجوم"۔

انٹرویو میں مسز اندرا گاندھی نے مختلف قسم کے سوالات کے جوابات دیئے جیسے ان کی شخصی پسند اور ناپسند کیا کسی گاؤں میں چکرس یا کیمپ ڈیوڈ جیسا ان کا گوشہ عافیت ہے یا نہیں، اگر انہیں ایک برس کی چھٹی مل جائے تو وہ کیا کریں گی ان پر ہونے والے حملے ان کا بچپن اور اپنے والد پنڈت نہرو کے ساتھ پروان چڑھنے میں انہیں کیسا لگا۔]

جب میری ناک ٹوٹی

سوال : کسی نے مجھے بتایا تھا کہ انگلی یا ناک کی ہڈی ٹوٹنا سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے آپ کو اس کا کبھی تجربہ ہوا؟ —

جواب: انتخابی جلسوں کے درمیان بار ہا مجھ پر حملے ہوئے میری انگلی بھی ٹوٹ چکی ہے اور ناک کی ہڈی بھی۔ یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے، میں انتخابی مہم میں حصہ لے رہی تھی۔ جنوبی ہند میں ایک جلسہ تھا جہاں پنچ پر میرے ساتھ ایک نوجوان سیاسی لیڈر بیٹھا تھا، اسے میرے بعد بولنا تھا مگر وہ مجھ سے پہلے بولنے کھڑا ہوگیا وہ جیسے ہی بولنے اٹھا لوگوں نے اس پہ پہلے تو جوتے چپل وغیرہ پھینکے پھر پتھر آنے لگے۔ اس پر مجھے بڑا غصہ آیا تب میں اٹھی اور آگے بڑھ کر کہا۔ آپ چاہے اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر اس شخص کی بات تو سنیں۔ میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اینٹ کا ایک ٹکڑا جو اس آدمی کے مارا گیا تھا سیدھا آکر میری ناک پر پڑا۔ تب میں نے کہا۔ جب تک جلسہ ختم نہ ہو جائے کوئی مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتا۔ میں یہیں بیٹھوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اور میری ناک سے خون ابل رہا تھا لیکن کسی کو اس کی فکر نہیں تھی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میری ناک شاید ہمیشہ کیلئے خراب ہو جائے اور میں نے لوگوں سے کہا۔ اب میں گھر جاتی ہوں۔ میں ایسی جگہ پڑی تھی جہاں کوئی مناسب ڈاکٹر موجود نہیں تھا لہٰذا میں اپنے باتھ روم میں گئی اور دیکھا کہ میری ناک کھسک کر ایک طرف ٹلک گئی ہے تب میں نے اسے ایک جھٹکے سے ہٹایا اور ہڈی کھٹاک سے بیٹھ گئی۔ میرا خیال ہے کہ ناک میں اب بھی تھوڑا سا خم باقی ہے بہرحال میں خوش قسمت تھی کہ کچھ زیادہ نہیں ہوا اس وقت مجھے صرف اپنی ناک سیدھی کرنے کی فکر تھی۔

جب میں حکومت سے باہر ہوگئی تھی، ۱۹۷۷ء میں تب بھی مجھ پر حملے کیے گئے۔ بارہا پتھراؤ ہوا۔ ایک ایسا ہی حملہ مدراس میں ہوا جہاں لوگوں نے لاٹھیوں سے کار پر حملہ کر دیا۔ مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ کالی جھنڈیاں دکھائی جائیں گی میں نے کہا کہ اس سے کیا ہوتا ہے میں اس کی عادی ہوں۔ تب مدراس ایرپورٹ سے جاتے ہوئے ایک مقام پر ہجوم دوڑ کر آگیا اور گاڑیوں کے قافلے کو روک لیا اور لاٹھیاں برسانے لگے۔ میری گاڑی میں میرے ساتھیوں نے بڑی پھرتی دکھائی۔ انھوں نے مجھے سیٹ کے نیچے دہرا کر کے ڈال دیا اور اوپر سے تکیے رکھ دئے۔ تاکہ چوٹ نہ لگے تب بھی مجھے کچھ خراشیں اور چوٹیں آئیں۔ مگر میری قسمت اچھی تھی کہ اس حملے میں بچ گئی میری گاڑی میں اگلی سیٹ پر جو شخص بیٹھا تھا اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔

نہرو کے زیر سایہ

جواہر لال نہرو کے ساتھ رہنا باعث مسرت تھا مگر وہ اکثر گھر سے باہر دوروں پہ رہتے تھے گھر میں ہر وقت زبردست تناؤ رہتا تھا۔ یہ تصور کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم نہیں جانتے تھے کہ کب پولس آئے گی اور ہمیں گرفتار کر کے لے جائے گی۔ جس رات میری ماں پکڑی گئیں وہ مجھے خوب یاد ہے۔ والد پہلے ہی سے جیل میں تھے اور گھر میں ہم صرف دو ماں بیٹی ہی تھیں۔ ٹیلی فون بجا میں نے ریسیور اٹھایا اور مجھے بتایا گیا کہ اسی رات میری ماں گرفتار کی جائیں گی۔ ماں نے یہ سن کر کہا کہ یہ محض افواہ بھی ہو سکتی ہے تب بھی ہمیں تیار رہنا چاہئے۔

سوال:- برٹش سرکار نے گرفتار کیا تھا؟

مسز گاندھی: جی ہاں اس وقت میں صرف تیرہ سال کی لڑکی تھی لیکن میں اپنے کو کافی عمر دار سمجھنے لگی تھی۔

گاندھی جی کا غصہ

سوال۔ گاندھی جی سے متعلق کوئی یاد؟

مسز گاندھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے سامنے بڑھی پلی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے خاندان کے ساتھ ان کا تعلق اس وقت سے تھا جب میں دودھ پیتی بچی تھی اس لیے جب آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو گاندھی جی کو پایا یہی وجہ ہے کہ میں گاندھی جی کو بہت بڑا آدمی یا بہت بڑا لیڈر نہیں بلکہ گھر کا ایک بزرگ سمجھتی تھی۔ گاندھی جی کے لیے بہت بیزرگ ہوتی تھی، میرے گھر کے بھی ان کی بڑی آؤ بھگت تھی لیکن میں تو انھیں بس خاندان کا ایک بزرگ مانتی تھی جس سے ہمارے گھر کے ہر معاملے میں صلاح لی جاتی تھی۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے گاندھی جی کوئی ایسے خاموش اور پرسکون آدمی نہیں تھے۔ جب انھیں غصہ آتا تھا تو دیکھنے والا ہوتا تھا مگر وہ غصے میں چیخنے چلاتے نہیں تھے نہ ایسی کوئی اور بات کرتے تھے لیکن ان کا غصہ ہم محسوس کر سکتے تھے غصے میں وہ تمتمانے لگتے تھے۔ مگر گاندھی جی مجھ سے کبھی غصہ نہیں ہوئے میں نے اس حالت میں انہیں دوسروں کے ساتھ دیکھا تھا۔

گاندھی جی اپنے عقائد اور پالیسیوں میں بہت پختہ یقین رکھتے تھے اس میں انہیں اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا تھا وہ

پاؤں جماکر کھڑے رہتے تھے۔ ان کی انگلیاں ہمیشہ عوام کی نبض پر رہتی تھیں وہ عوام کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے اور یہ ہندستانی عوام ہی تھے جنھوں نے گاندھی جی کو اتنا بڑا آدمی بنا دیا۔ ان کے بغیر گاندھی جی وہ نہ بن سکتے تھے جو وہ تھے مجھے اس میں شک ہے ہندستانی عوام کو ان کے جیسے ایک لیڈر کی ضرورت تھی اس خاص وقت میں گاندھی جی جیسا لیڈر عوام کو چاہئے تھا۔

پریوں کی کہانی کی شہزادی

سوال ــ کیا آپ کا بچپن سیاسی رنگ میں رنگ گیا تھا یا اس پر ثقافت کا رنگ چڑھا۔ ؟

مسز گاندھی۔ جی نہیں میں پڑھتی رہتی تھی، ہاں اس کے علاوہ یہ سیاسی ماحول تھا۔ میرے ہاتھ جو چیز لگ جاتی میں اسے پڑھنے لگتی۔ چاہے میری سمجھ میں وہ آتی یا نہ آتی۔ میرے والد پڑھنے کے لیے مجھے ایسی کتابیں دیتے جو میری سمجھ سے باہر ہوتیں لیکن اس کی وجہ سے مجھے مطالعہ کرنے کی عادت ہو گئی۔ مجھے پریوں کی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا والد اس کے سخت خلاف تھے، مجبوراً مجھے جو کہانیاں پسند تھیں ان میں گری بالڈی، سائمن لیو لیورا جان آف آرک یہ سب میرے دل و دماغ پر چھائے رہتے۔

میرے ماں باپ یکساں طور پر سیاسی دنیا میں با اثر نہیں تھے۔ میری ماں نے میرے باپ کی اس وقت ہمت بندھائی جب خاندان کے دوسرے لوگوں کو اس بارے میں شبہہ تھا کہ گاندھی جی کا ساتھ دیتے رہنا چاہیے۔ ماں نے پتا جی سے کہا کہ آپ گاندھی جی کا ساتھ دیں یہی ٹھیک راستہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ماں نے میرے پتا جی کو مختلف مشورہ دیا ہوتا تب بھی وہ رہتے گاندھی جی کے ساتھ ہی مگر تب ان کے اندر کافی تذبذب پیدا ہو جاتا۔ میری ماں بڑی ہمت والی اور بہت حساس عورت تھیں۔ وہ میرے والد سے زیادہ ہندستان کی دھرتی میں پیوست تھیں۔

بیوہ وزیر اعظم کا پرچار

سوال: مردوں کی برتری والے سماج میں ایک خاتون وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ کو کیا لگتا ہے اس میں کتنی دشواری کا آپ کو سامنا کرنا پڑتا ہے یا آپ کو کچھ خاص فوائد حاصل ہیں۔

مسز گاندھی: میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں تک فوائد کا سوال ہے تو خاتون وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ بھی مجھے حاصل نہیں جب میں مفید کام نہ کر سکوں تو وہ میری ذات پوچھنے لگتے ہیں کہ میں دکھنی ہوں یا اتری کوئی نہ کوئی پہلو وہ وار کرنے کا تلاش کر لیتے ہیں۔ ہندستان کی ایک کٹر اور دقیانوسی پارٹی نے یہ سوال اٹھا دیا کہ ایک بیوہ کا وزیر اعظم ہونا ملک کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوگا کسی عورت کے شوہر کا مر جانا اس عورت کے بدنصیب اور منحوس ہونے کا ثبوت مانا جاتا ہے۔ اس کا ان لوگوں نے پرچار شروع کر دیا لیکن عوام الناس نے اس بکواس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

سوال:۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ کا سب سے مشکل کام کیا رہا ہے !

مسز گاندھی: میں ہمیشہ سے آزادی کی جد و جہد میں مصروف رہی ہوں۔ میں ایسا نہیں سمجھتی کہ سیاسی آزادی حاصل ہونے سے سب کچھ مل گیا۔ ہم آزاد ضرور ہیں مگر ابھی تک آزادی کے پھل ہمارے سب لوگوں تک نہیں پہنچے۔

سال بھر کی چھٹی

سوال:۔ اگر آپ کو سال بھر کی چھٹی مل جائے تو کیا کریں گی ؟

مسز گاندھی: میں ایسی سیکڑوں چیزیں کروں گی جو مجھے کرنا پسند ہیں۔ اگر میں یہ سن لوں گی کہ کوئی مصیبت زدہ ہے تو میں دور دراز کا سفر طے کر کے اس تک پہونچوں گی اور اس طرح میں اس آدمی کے لئے کام کرنے لگوں گی چاہے میں اسے جانتی بھی نہ ہوں۔

سوال:۔ اچھا تو اگر آپ کو سال بھر کی چھٹی دی جائے تب بھی آپ خالی نہیں بیٹھیں گی اور کچھ کرنے لگیں گی !

مسز گاندھی: میں ایسا چاہتی تو نہیں مگر میرے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

سوال:۔ آپ کا غیر سیاسی پسندیدہ مشغلہ کیا ہے۔ ؟

مسز گاندھی: بچوں کے ساتھ کام کرنا میں پسند کروں گی۔

سوال:۔ اگر آپ آنے والے الیکشن میں ہار جائیں تو کیا

(باقی صفحہ [illegible] پر)

لال وانی

ترجمہ: ڈاکٹر رضیہ اکبر

اندرا گاندھی سے چند خاص باتیں

س آپ بہت کم عمری سے ہی تحریک آزادی اور سیاست میں الجھ گئیں تو آپ کی ان خواہشات اور آرزوؤں کا کیا ہوا، جو ہر نوجوان لڑکی کے دل میں ہوتی ہیں۔ آپ نے دبا دیا یا وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئیں

ج:۔ وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ اس وقت آزادی کی جد و جہد کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی نہ تھا۔ میری کوئی سہیلی نہ تھی، صرف چچازاد بھائی تھے۔ مجھے فضول گپ شپ سے جسے عورتوں سے منسوب کیا جاتا ہے شروع سے نفرت تھی اور ہمیشہ رہی۔ کھیلوں سے مجھے رغبت تھی اور بچپن میں درختوں پر چڑھنا وغیرہ جیسی حرکتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

س کیا اس زمانے کی کچھ دوسری لڑکیوں کی طرح آپ مغربی لباس پہنتی تھیں؟

ج ہاں ــــ ہم صرف کھادی پہنتے تھے اور اس وقت کھادی بہت موٹی ہوتی تھی اس میں کچھ تراش خراش اور فیشن کی بہت کم گنجائش تھی۔ کھادی پہننا اس زمانے میں ایک بہت بڑا اعزاز تھا جس پر فخر و ناز کیا جاتا تھا اور اس دوران میں سوئٹزرلینڈ اسکول میں پڑھ رہی تھی۔

س:۔ اس زمانے کے کون سے خوشگوار لمحے آپ کو یاد ہیں؟

ج:۔ (ہنس کر) پتا نہیں، مجھے اپنے والدین کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ان سے بہت کم مل پاتی تھی تو جب ایک بار میرے والد جیل سے چھوٹ کر وہاں آئے میں بے حد خوش ہوئی اور مجھے پہاڑ پر جانے کی ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی تھی۔

س:۔ نوجوانی میں کیا آپ نے کبھی ملک کے سربراہ ہونے کی آرزو کی تھی؟

ج:۔ بالکل نہیں ــــ یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا اس کا کوئی سوال ہی نہ تھا، آپ کو پتا ہے اس وقت تو ہم یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اپنی زندگی میں ہم کو آزادی ملے گی!

س:۔ اپنے والد کے علاوہ آپ کسی کو اپنا مربی سمجھتی ہیں؟

ج:۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرے والد میرے مربی تھے۔

س:۔ تو گویا آپ نے خود اپنی شخصیت بنائی ہے؟

ج:۔ نہیں، میں خود ساختہ نہیں ہوں۔ ہم دوسروں سے سیکھتے ہیں، لیکن...... میرا مطلب ہے ہم ہر وقت دوسروں سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں اور ضروری نہیں کہ یہ صرف کسی بڑی شخصیت سے ہو، ہم ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔

س:۔ آپ کے ہیرو کون ہیں؟

ج:۔ وہ تمام لوگ جو آزادی کے لیے لڑے۔ جد و جہد آزادی کی اور ایسی ہی کہانیاں پڑھنا مجھے پسند تھا۔

س:۔ کیا بچپن میں کسی عورت نے آپ کی زندگی میں بہت اہم حصہ لیا؟

ج:۔ سوائے میری ماں کے کسی نے نہیں۔ میں ۱۹ برس کی تھی جب ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ ۳۶ برس کی تھیں اور ایک طویل بیماری سے وہ فوت ہوئیں۔

س:۔ کیا اس سانحے سے آپ کی زندگی بالکل بدل گئی ؟

ج:۔ نہیں تو ۔۔۔ میں نہیں سمجھتی اس واقعہ سے میری زندگی میں کوئی خاص تبدیلی آئی۔ میرا خیال ہے کہ رنج و غم ہمارے اندر کچھ کرتا ہے مگر وہ ہماری زندگی کے بہاؤ کو روک نہیں سکتا ہاں مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ حیات رہتیں تو غالباً میں شادی نہ کرتی، یہ فیصلہ کرنے میں ضرور اس سانحہ کا کچھ دخل رہا۔

س:۔ فیروز گاندھی سے آپ کا رومان کہاں شروع ہوا۔ کیا آپ ان سے یہاں ہندوستان میں ملیں ؟

ج:۔ ہاں یہیں، اپنے آبائی وطن میں۔ جب میں ۱۳، ۱۴ برس کی تھی، انھوں نے مجھے دیکھا اور جب میں ۱۶ کی ہوئی تب شادی کی پیشکش کی اور جب تک میں شادی پر آمادہ نہ ہوئی، وہ مسلسل کوشش کرتے رہے۔

س:۔ کیا خاندان والوں نے اس کی کچھ مخالفت کی ؟

ج:۔ ہاں کچھ تو کی اس لیے نہیں کہ وہ پارسی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ بالکل مختلف ماحول سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ بڑے بوڑھوں نے یہ بھی سوچا کہ وہ مجھے اتنے آرام و آسائش سے نہ رکھ سکیں گے جیسے ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں رہ رہی تھی۔

س:۔ لیکن آپ نے بہرحال اپنی بات منوالی ؟

ج:۔ بات منوانے کا کوئی سوال نہ تھا، میں نے ہمیشہ جو چاہا وہی کیا ہے۔

س:۔ کیا آپ کے والدین نے کبھی یہ نہ چاہا کہ آپ ان کی پسند سے شادی کریں ؟

ج:۔ کبھی نہیں، انھیں پورا یقین تھا اور خود مجھے بھی کہ میں کبھی کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کروں گی جسے کوئی دوسرا میرے لیے منتخب کرے۔

س:۔ کیا فیروز گاندھی آپ کی زندگی میں پہلے مرد تھے ؟

ج:۔ ہاں صرف وہی اکیلے میری زندگی میں آئے میں نے اپنی زندگی کے انتہائی قیمتی لمحات ان کے ساتھ گزارے ہیں۔

س:۔ بچوں کے تعلقات اپنے باپ سے کیسے تھے ؟

ج:۔ بہت اچھے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا۔ وہ دونوں بورڈنگ ہاؤس میں تھے۔

س:۔ آپ کی اتنی مصروف زندگی کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی آپ کو ایک مثالی ماں کہہ سکتا ہے ؟

ج:۔ کیوں نہیں ؟ میں نے اپنے بچوں کے لیے سب کچھ کیا۔ میں نے کسی اور کو انھیں چھونے تک نہیں دیا۔ میں ان کی اس سے بہت زیادہ دیکھ بھال کرتی تھی جتنی میں نے کسی اور ماں کو کرتے دیکھا ہے۔

س:۔ کام کرنے والی ماؤں کو آپ کیا مشورہ دیں گی، کیونکہ روز بروز یہ صورت حال بری ہو رہی ہے۔

ج:۔ ہندوستان میں ہم کو ابھی نوکروں کی بڑی سہولت حاصل ہے جیسی کہ دوسرے ملکوں میں نہیں ہے۔ صرف دولتمندوں کو ہی نہیں، متوسط طبقہ کو بھی، اور ابھی ہمارے ہاں کنبہ داری زندگی کا رواج بھی بہت ہے۔ یہ بھی ایک سہولت ہے جہاں بچوں کی بھی دیکھ بھال ہوتی ہے اور بڑے بوڑھوں کی بھی۔ لہٰذا ہماری ماؤں کو اس کے لیے اتنا پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن میں یقیناً یہ سمجھتی ہوں کہ ایک عورت جو بچہ کو جنم دیتی ہے اس کو اس کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیئے۔

س:۔ اپنی ساس سے آپ کے تعلقات کیسے تھے ؟

ج:۔ ہم جہاں بھی رہے ان سے بہت قریب نہیں رہے مگر میرے تعلقات ان کے ساتھ بہت اچھے تھے بلکہ ایک طرح سے میں ان کے گھر والوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب لائی۔ جب وہ سیاست میں پڑ گئے تو گھر والوں سے رشتہ ٹوٹ گیا، ان کی والدہ خاص طور پر کچھ سمجھ نہ سکیں کہ کیا ہو رہا تھا۔

س:۔ جب آپ ماں بننے والی تھیں، آپ کو یاد ہے کون سا لمحہ آپ کے لیے انتہائی اطمینان بخش تھا ؟

ج:۔ جب میرا پہلا لڑکا پیدا ہوا مجھے بڑا پرسکون احساس ہوا۔ میں نے واقعی محسوس کیا جیسے میں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کچھ پایا ہے۔

س:۔ کیا آپ کو کبھی لڑکی کی خواہش نہیں ہوئی یا دو کی بجائے یوں

میں کسی قسم کی رقابت تھی ؟

ج :۔ میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی، میں صرف بچے چاہتی تھی، لڑکے ہوں یا لڑکی ؟ ہاں میں سمجھتی ہوں بھائیوں میں کچھ تھوڑی رقابت تو تھی۔ کیونکہ چھوٹا ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہر وہ کام نہیں کر سکتا جو بڑا کر سکتا ہے اور بڑا ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ پہلے ساری توجہ مجھے ملتی تھی اور اب ایک دوسرا بھی اس میں شریک ہے۔ مگر وہ دونوں بڑے اچھے دوست تھے ان کی بہت سی دلچسپیاں ایک تھیں، میرے شوہر بہت میکانکی ذہن کے آدمی تھے اور بہت اچھے میکانک اور دونوں لڑکے بھی۔

س :۔ کیا آج آپ کے ایسے دوست زیادہ ہیں جنھیں آپ بچپن کا ساتھی کہہ سکیں یا وہ نئے دوست ہیں ؟

ج :۔ میرے اسکول اور کالج کے دوست بہت ہیں۔

س :۔ تقریباً سب ہی عورتیں یہ جاننا چاہتی ہیں کہ آپ کتنی فیشن پسند ہیں ؟

ج :۔ سب نہیں، کچھ کہئے، میں لوگوں کو خوش پوشاک دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ کچھ فیشن لیڈرز سے میں نے فیشن پر بحث بھی کی ہے اگر فیشن سے آپ کی مراد بدلتے ہوئے فیشن سے ہو تو میرا خیال ہو کہ ہر شخص کو خود اپنے اسٹائل کا انتخاب کرنا چاہئیے ہو سکتا ہے جوانی میں آپ کو مختلف اسٹائل سوٹ کریں لیکن جب ہم بڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی ایک شخصیت بنا لیتے ہیں تب ہمکو اپنی شخصیت کا دھیان رکھنا چاہیئے نہ یہ کہ آج کیا فیشن ہے کل کیا فیشن ہے اسی میں پڑے رہیں۔

س :۔ آپ کی ساڑیاں، زیورات وغیرہ کا کون انتخاب کرتا ہے۔

ج :۔ کچھ لوگ یہ چیزیں میرے پاس لے آتے ہیں کہ میں انتخاب کروں پہلے یہ کام میری سکریٹری کرتی تھی لیکن اب میری کوئی سکریٹری نہیں، میری بہو سونیا جو کچھ سمجھتی ہے مجھے پسند ہے میرے لیے لے آتی ہے۔

س :۔ آپ کے پاس کتنی ساڑیاں ہوں گی ؟

ج :۔ ہندوستانی لباس ڈریس کی طرح نہیں ہوتے میرے پاس ابھی تک کچھ ساڑیاں ہیں جو میری ماں کی تھیں جو دھاتی چلتی ہیں اور پھر کبھی ان کو کاٹ کوٹ کر اس سے اور بہت کچھ بنا لیتے ہیں۔ میں عموماً ایک ساری اس وقت تک پہنتی ہوں جب تک کہ وہ بہت ہی پرانی نہ ہو جائے ناگفتہ بہ حد تک، میرے والد کی بھی یہی عادت تھی جب کبھی میں کسی صدری کرتے وغیرہ کو جو بہت زیادہ پرانا ہو جاتا ہے ان کی الماری سے نکال دیتی وہ فوراً پوچھتے کہ میری، وہ فلاں صدری کہاں ہے ؟ مجھے لگتا ہے شاید اب میں بھی ویسی ہی ہوتی جا رہی ہوں۔

س :۔ آپ کس قسم کے لباس کو آرام دہ سمجھتی ہیں ؟

ج :۔ مجھے اپنے دیش کے تمام علاقائی لباس پہننا پسند ہیں اور عموماً اتوار یا کسی فرصت میں پہنتی بھی ہوں لیکن آفس میں کبھی نہیں۔

س :۔ آپ کے محبوب تفریحی مشاغل کیا ہیں ؟

ج :۔ یقیناً مطالعہ اور پہاڑوں کی سیر۔ جب لڑکے چھوٹے تھے تو گرمی کی چھٹیاں، ہم دو مہینے کسی پہاڑ پر گزارتے تھے اور ہمیشہ انتہائی دشوار اور دور دراز سنسان جگہوں پر کیمپ ڈالتے تھے۔

س :۔ آخری بار آپ نے کب کھانا پکایا ہو گا۔

ج :۔ میں نے کبھی کھانا نہیں پکایا، ہاں جب میرے دادا زندہ تھے، میں بہت چھوٹی سی تھی، تب مجھے کچھ سکھایا گیا تھا اور امتحان کے طور پر مجھے کبھی ان کے لئے پکانا پڑتا تھا، میں صرف انڈا بنا سکتی ہوں۔

س :۔ آپ کو تھیٹر بہت پسند ہے ؟

ج :۔ بہت، مجھے اچھے فلم بھی پسند ہیں۔

س :۔ کیا آپ میں ایسی کوئی کمزوری نہیں جس پر آپ غالب آنا چاہیں ؟

ج :۔ کیوں نہیں، بہت سی ہیں مثلاً میں کھانا پکانا جاننا چاہوں گی، میں سمجھتی ہوں یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ ضرورت پڑنے پر پکا نہ سکوں۔ مگر مجھے انڈا اور کچی ترکاری اتنی پسند ہے کہ مجھے کبھی فاقہ نہ کرنا پڑے گا۔ میں چاہتی ہوں مجھے گانا بھی آتا۔

س :۔ شانتی نکیتن میں جب آپ تھیں تو کیا وہاں گانا نہیں سکھایا جاتا تھا۔

ج :۔ سکھایا تو جاتا تھا مگر میں نے کبھی گایا نہیں میں ناچ سکتی

تھی۔

س:۔ دیوتاؤں کے اس ملک میں آپ کا کوئی محبوب دیوتا ہے۔

ج:۔ نہیں بطورِ خاص کوئی نہیں، ہندوستان تضادات کی سرزمین ہے، ہمارے مذہب میں خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ کسی تصویر یا علامت میں نہیں۔ جب کوئی ایک مطلق تصور پر زندہ نہیں رہ سکتا اور کچھ دیکھنا ضروری سمجھتا ہے تب وہ کہتا ہے کہ ہم اسے اس شکل میں یا اس شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ مذہبی عبادات وغیرہ میرا روزانہ کا معمول نہیں۔ جب میں چھوٹی تھی میرے والدین گیتا اور رامائن پڑھتے تھے اور میری ماں اور والد دونوں مجھ سے فلسفہ کی اور دوسرے مذاہب کی باتیں کرتے تھے کہ تمام مذاہب کا بنیادی تصور ایک ہی ہے۔ محبت بھائی چارگی اور انسانیت۔

س:۔ آپ کا کہنا ہے کہ آفس میں آپ ایک عورت کی حیثیت سے نہیں وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اس لیے کیا آپ یہ محسوس کرتی ہیں — کہ خواتین کی تحریک کو نقصان پہنچ سکتا ہے بیشتر خواتین کا ایسا خیال ہے۔

ج:۔ نہیں — یہ سچ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں جب الکشن ہار گئی تھی تو بیشتر عورتوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی تحریک کو نقصان پہنچا ہے، ان کی وہ عزت نہیں رہی، ان کا وقار کم ہو گیا اور اکثر مردوں نے ان کے ساتھ سلوک بھی ایسا ہی کیا۔ گھروں میں وہ اپنی عورتوں سے "اب ہم سمجھ لیں گے۔ تم کو مزا چکھائیں گے" وغیرہ جیسی باتیں کرنے لگے۔

س:۔ تو کیا عورتوں کے مسائل سے آپ کا اتنا سمبندھ ہے ؟

ج:۔ نہیں، میں یہ نہیں مانتی، میرا ان سے اتنا ہی تعلق ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ ہر فرد کو اپنی مکمل شخصیت بنانی چاہیئے خواہ مرد ہو یا عورت اور میرا خیال ہے اگر عورتوں کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مردوں پر بھی اتنا ہی اثر پڑے گا کیونکہ اس سے پورے سماج کو نقصان پہنچے گا۔ میں عورتوں میں اس لیے دلچسپی نہیں لیتی کہ میں عورت ہوں بلکہ اس لیے کہ عورت نسل انسانی کا آدھا حصہ ہے اس لیے اس کی ترقی پوری انسانی نسل کے لیے اہم ہے۔

س:۔ بہرحال ہندوستان میں، ایسا لگتا ہے یقیناً عورت ابھی پچھڑی ہوئی ہے۔ عورت کا سماج میں کوئی حصہ نہیں ہے، وہ مظلوم ہے۔

ج:۔ نہیں، ایسا تو نہیں ہے۔ ہندوستان تضادات کی سرزمین ہے۔ یہاں آپ کو دونوں صورتیں نظر آئیں گی اور ہماری پوری تاریخ میں عورتوں کا رول بہت اہم رہا ہے اور کسی نے اس کو قابل حیرت و استعجاب بھی نہیں سمجھا ہے۔

س:۔ اس پر یقین ذرا مشکل لگتا ہے۔ میں، امریکہ میں اپنے دوستوں سے کہتی ہوں کہ ہماری اتنی بڑی قوم کی ایک عورت سربراہ ہے پھر بھی ہم ....

ج:۔ لیکن آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ ہماری وزیر اعظم صرف عورت ہے۔ ہمارے اور بہت سے اہم عہدوں پر بھی اس وقت عورتیں فائز ہیں، چیف منسٹر ہیں کونسل کی صدر ہیں۔ دیہات کی پنچایتوں میں ہیں۔

س:۔ جیسا آپ نے کہا یہ تضادات کی سرزمین ہے اور یقیناً یہاں عدم مساوات بہت زیادہ ہے تو کیا اس وجہ سے عورتوں کی بڑی تعداد ظلم نہیں اٹھاتی؟ مثال کے طور پر جہیز کا ہی مسئلہ لے لیجئے۔

ج:۔ ٹھیک ہے مگر یہ باتیں صرف کچھ حصوں میں ہیں۔ ملک کے بہت ہی کم حصوں میں خاص طور سے شمال میں —

س:۔ کیا جنوبی ہند میں جہیز کا مسئلہ نہیں ہے ؟

ج:۔ ہے، بعض طبقوں میں ..... مجھے نہیں معلوم یہ پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے یا اسے شہرت زیادہ دی جا رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس کا ایک بڑا سبب آج کا ہمارا نو دولتیہ سماج ہے۔ بہرحال ہم اس کے لیے محکم قانون بنا رہے ہیں مگر بنیادی طور پر اس کے لیے سماجی شعور کی ضرورت ہے اگر لوگ خود شدت سے اس کو محسوس کریں اور عزم کر لیں کہ وہ اسے برداشت نہ کریں گے تو میں سمجھتی ہوں اس کو ختم کرنے کا یہ واحد موثر ذریعہ ہوگا۔

س:۔ آپ اتنا زیادہ سفر کرتی ہیں کیا آپ کا کوئی محبوب ملک ہے۔

ج: (ہنس کر) یہ بتانا تو بڑی خطرناک بات ہوگی، میں جہاں بھی جاتی ہوں تقریباً ہر جگہ کو پسند کرتی ہوں کیونکہ مجھے جگہوں کو دیکھنے کا شوق ہے گو وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر کچھ بندش رہتی ہے۔ میرے پروگرام میں اس کی گنجائش نہیں نکلتی۔

س:۔ آپ کا محبوب "پکوان" کیا ہے؟

ج:۔ مجھے بہت سارے ہندوستانی پکوان پسند نہیں ہر جگہ کے پکوانوں میں مجھے کچھ نہ کچھ پسند آتا ہے مجھے چینی پکوان بھی بہت پسند ہیں مگر ایسی خاص ڈشیں جیسے مینڈک کے باز و اسانپ وغیرہ پسند نہیں۔

س:۔ اگر آپ کو پھر نئے سرے سے زندگی گزارنے کا موقع ملے تو کیا آپ اسے دوسرے انداز سے گزاریں گی۔

ج یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اس کا انحصار حالات پر ہے کہ کن حالات میں کوئی پھر جنم لیتا ہے۔ فرض کر دیں اس وقت پیدا ہوتی جب ہندوستان آزاد ہوتا تو لازماً میری زندگی مختلف ہوتی۔

س:۔ کیا آپ نے ہر سخت مشکل تجربہ سے لطف اٹھایا ہے۔

ج:۔ لطف اندوز ہونے کا سوال نہیں۔ میرا خیال ہے مشکل تجربے آدمی کو ایک بہتر انسان بناتے ہیں تنہا کوئی دشواریوں میں سے گزرتا ہے اتنی ہی اس کی شخصیت بنتی ہے جب میں چہل قدمی کرتی ہوں تو میں عمداً زیادہ دشوار گزار رستہ اختیار کرتی ہوں مجھے سیدھی سڑک پر چلنا پسند نہیں۔

س:۔ آپ دکھوں کا اور مصیبتوں کا کیسے مقابلہ کرتی ہیں۔؟
آپ نے بچپن سے اپنے اتنے عزیزوں پیاروں کو کھویا ہے۔ یہ دو سال وزیراعظم کے عہدے سے الگ رہی ہیں۔ یقیناً وہ زمانہ آپ کے لیے بہت سخت رہا ہوگا۔

ج:۔ وزیراعظم کے عہدے سے الگ رہنا تو کوئی سخت زمانہ نہیں تھا البتہ وہ بہت تکلیف دہ زمانہ تھا۔ جب ہمیں ہر طرح سے پریشان کیا گیا۔ جہاں تک میری نجی زندگی کے نقصانات کا سوال ہے۔ یہ دکھ یہ دل آزار تجربے، ہمارے اندر کچھ ٹوٹ سا جاتا ہے مگر ان سے تقویت بھی ملتی ہے، غم ہم سے بہت کچھ چھینتا ہے اور تقویت بھی پہنچاتا ہے

س:۔ کیا غم کی اس طاقت میں آپ کسی کو شریک بنا سکتی ہیں؟

ج:۔ غم میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ خوشی میں شریک کر سکتے ہیں مگر غم میں نہیں۔

س:۔ تو آپ کو اپنے دکھ اکیلے ہی اٹھانا ہوتے ہیں۔

ج:۔ ہر شخص کو ہی یہ چاہیئے، کوئی دوسرا آپ کے لیے آپ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور سچ پوچھیئے، تو ہر شخص "تنہا" ہے خواہ دوسرے اس سے کتنے ہی نزدیک ہوں، ہم کو اپنے مسائل سے خود ہی نپٹنا ہوتا ہے۔

س:۔ کیا آپ ایسے چند لوگوں کا ذکر کر سکتی ہیں جنھوں نے ایسے مشکل لمحات میں آپ کا ساتھ دیا ہے۔؟

ج:۔ نہیں، میں نے خود اکیلے ہی ان کو سہا ہے ان سے نپٹی ہوں

س وزیراعظم کی حیثیت سے وہ کون سا مسئلہ سب سے اہم ہے جس پر آپ قابو پانا چاہیں گی۔

ج:۔ اوہ، دراصل ایک مسئلہ ہے۔ وہ ہمارے ملک کی معاشی پست حالی ہے دوسری ہر چیز اسی کا ایک حصہ ہے۔ بہت برسوں پہلے جب ملک کی آبادی بہت کم تھی۔ کسی نے یہ والد سے سوال کیا تھا کہ آپ کے سامنے کتنے مسائل ہیں اور اس وقت انھوں نے جواب دیا تھا ۴۲ کروڑ ـــ جو اس وقت ہندوستان کی آبادی تھی اور اب ۱۹۸۱ کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہمارے ملک کی آبادی تقریباً ۷۰ کروڑ ہے۔

●●●

چاچا نہرو کی بیٹی کے ساتھ انٹرویو: ص۱۴۴ کا بقیہ
اکثر بچے ہنستے ہیں کسی کو کچھ کمی ہو تو اس پر ہنستے ہیں۔ یا جانوروں پر زور سے پتھر پھینکتے ہیں یہ سب چیزیں ان کو بہت بری لگتی تھیں۔

اُما چکبست: ہمیں فخر ہے اندرا جی کہ مصروف ہونے کے باوجود آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا۔ اور ہمیں اپنے بچپن اور چاچا نہرو کے بارے میں بتایا۔ شکریہ۔

جعفر عسکری

گلابِ تازہ

اے مادرِ ہند کی تقدس مآب دختر!
ابھی تو خاکِ وطن کے ذرّے
تری شجاعت کے، سرفروشی کے، دلبری کے
حسین اور دلنواز نغمے سُنا رہے ہیں
ابھی تو تیرے لہو کی خوشبو
تمام ارض و سما میں تحلیل ہو رہی ہے
اُتر رہی ہے
ترے تبسم کی دھوپ ابھی تو
دلوں کے آنگن میں زینہ زینہ
ابھی تو زخمی
ہے تیری ہجرت میں سینہ سینہ
ابھی تو تیری نوائے شیریں
دلوں کو تسخیر کر رہی ہے
ابھی تو تیری درخشاں آنکھوں
کی جوت جلوہ دکھا رہی ہے
ابھی تو تیری حسین صورت
دل و نظر میں سما رہی ہے
مہک رہا ہے
وطن کے رُخسار پر ابھی تو
تری محبت کا پاک غازہ
ابھی تو تیرے وجود کا ہے
گلاب تازہ !!

مظفر حسین ہاشمی
نور منزل محلہ زیارت
خو مہ والی رام پور

رو رہا ہے جہان کیا کہیئے

رک رہی ہے زبان کیا کہیئے
غمِ ہندوستان کیا کہیئے
سر پہ ٹوٹا ہے ایک کوہِ گراں
پھٹ پڑا آسمان کیا کہیئے
رنج و غم آہ و نالہ و شیون
رو رہا ہے جہان کیا کہیئے
ایک طوفانِ غم نے آ گھیرا
پھٹ گئے بادبان کیا کہیئے
دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹا
ضبط کا امتحان کیا کہیئے
کیوں اندھیروں پہ لوگ کرتے ہیں
روشنی کا گمان کیا کہیئے
کس طرح قوم بھول پائے گی
تجھ کو اے مہربان کیا کہیئے
رہ روی نے اکھاڑ پھینکا ہے
منزلوں کا نشان کیا کہیئے
ساتھ دیتی نہیں زباں ہاشمی
کیسے کیجے بیان کیا کہیئے

کفیل اثر سلونوی
سلون ۔ رائے بریلی

بھر دیا خونِ جگر تک ملک کی تصویر میں

جان دے دی اندرا نے دیش کی تعمیر میں
بھر دیا خونِ جگر تک ملک کی تصویر میں
کیا انھیں معلوم تھا لکھا ہو یہ تقدیر میں
کہہ گئیں بھونیشور کی آخری تقریر میں

مر بھی جاؤں دیش کی سیوا اگر کرتے ہوئے
بات فخر و ناز کی ہو گی یہ میرے واسطے
ایک اک قطرہ سہایک ہو گا میرے خون کا
دیش کو گتی شیل، طاقت ور بنانے کے لئے

عفت بانو زیبا کاکوروی

وہ آواز زندہ رہیگی

وہ آواز گنگا و جمن کی امانت!
وہ آواز کوہ و دمن کی امانت!
وہ آواز جنتا کے من کی امانت!
وہ آواز ارض وطن کی امانت!
"وہ آواز زندہ ہے، زندہ رہیگی"!
تڑپتے دلوں کی لگن بن گئی ہے
محبت کی روشن کرن بن گئی ہے
وہ سرمایۂ جان و تن بن گئی ہے
وہ آواز فخرِ وطن بن گئی ہے
"وہ آواز زندہ ہے، زندہ رہیگی"!
اجالوں کو لائی اندھیرے مٹائے
فنا کر دیے ظلم و نفرت کے سائے
نئے عزم بخشے نئے گل کھلائے
اس آواز نے کتنے جادو جگائے
"وہ آواز زندہ ہے، زندہ رہیگی"!
اس آواز کو کتنی رفعت ملی ہے
محبت ملی ہے، عقیدت ملی ہے
زمانے کی نظروں میں عظمت ملی ہے
وفاؤں کی خاطر شہادت ملی ہے
وہ آواز زندہ ہے، زندہ رہیگی!
ابھی کہہ رہا ہے کہ ہم جاوداں ہیں!
وہی عزم محکم ہیں عزم جواں ہیں
ہر اک شاخِ گل میں چمن میں نہاں ہیں
وطن تیرے ہم آج بھی پاسباں ہیں!
"وہ آواز زندہ ہے، زندہ رہیگی"!

فاطمہ وصیّہ جائسی

تھی ہمالہ کی طرح مضبوط....

مسکراتی ہیں ہمالہ پر یہ کس کی استھیاں
وہ ہمالہ جو نقیبِ عظمتِ ہندوستاں
تو وہ بیٹی تھی جو اپنے دیش پر قرباں ہوئی
ساری دنیا کے لیے اک موجۂ طوفاں ہوئی
تھی ہمالہ کی طرح مضبوط استحکام میں
تیرے دم سے تقویت تھی ہر دلِ ناکام میں
اپنے ہاتھوں سے جو پہنا تھا لباسِ آخری
لوگ کہتے ہیں کہ اسکا رنگ بھی تھا کیسری
تجھ سے کس نے کہہ دیا تھا خون ہو جائیگا آج
وہ ترا انگیں سراپا وہ ترا شیریں مزاج
پاسبانی پر جو تھے مامور دشمن ہو گئے
کیا ہوا، کس واسطے رہبر بھی رہزن ہو گئے
ماں تھی بھارت کی بہو تھی اور بیٹی بھی تھی تو
کس خطا پر بہہ گیا گھر میں ترے تیرا لہو
ہم نشاناتِ قدم پر اب قدم رکھتے رہیں
راہ جو دکھلا گئیں اس راہ پر چلتے رہیں

قاسم صہبا جمیلی
سکشن آفیسر پٹنہ ہائی کورٹ
(بہار)

ایشیا کی تمنا

وہ جسم جو کہ ہمالہ کی گودیوں میں پلا
وہ قلب جس کو سکوں سبزوادیوں میں ملا
وہ حوصلہ جسے بخشا تھا لالہ زاروں نے
ہمالیہ کے فلک بوس کوہساروں نے
سنائیں گنگا و جمنا نے لوریاں جس کو
سنوارتی رہیں فطرت کی وادیاں جس کو
سنور کے دامنِ فطرت میں فطرتِ خاکی
مہاتما کی دعا بن کے دہر پہ چھائی
جو روشنی دلِ نہرو سے پھوٹ کر نکلی
ضیا میں اس کی ہر اک فکر جگمگا اٹھی
وہ ایشیا کی تمنا تھی اندرا گاندھی
ضیا فگن تھی جو عالم پہ روشنی نہ رہی
وہ روشنی جو کرن بن کے دہر پہ چھائی
نگل گئی اسے ظلمت کی حشر سامانی

کملاپت سہاؔ ماہر بلگرامی

خراجِ عقیدت

آہ اکتیسویں یہ اکتوبر
سن یہ چوراسی اور یہ وقتِ سحر
اک قیامت سی ہے بپا گھر گھر
ٹوٹا غم کا پہاڑ بھارت پر
اندرا جس نے سب کو پیار دیا
سنتے ہیں آج اسی کو مار دیا
کر گئی قوم کا جو اونچا نام
دے گئی دیش کو جو استحکام
جس نے رکھا ہمیشہ کام سے کام
مرتے مرتے جو دے گئی یہ پیام
ایک اک قطرہ خون کا میرے
وقف ہے قوم اور وطن کے لیے
یونہی چھتیس سال قبل سنا
ہوئے مرکر امر تھے راشٹر پتا
جب تھے گاندھی جی محوِ یادِ خدا
اٹھ کے قاتل نے ان پہ وار کیا
اندرا پھر ہوئی ہے یونہی شہید
خونِ انسانیت کی ہے تجدید

اندرا ایسی اک کہانی ہے
جو فنا ہو کے بھی نہ فانی ہے
ہر کڑی اس کی جاودانی ہے
سبق آموز و پُر معانی ہے
روشنی بخش نسلِ آئندہ
اس کا ایک ایک لفظ تابندہ
دیکھئے ظرفِ رہبرِ عالم
خالی ہاتھ آیا تھا گیا خالی
حسبِ جذباتِ حضرتِ حالی
اٹھ گیا ہم سے کہہ کے یہ مالی
قوم سے جان تک عزیز نہیں
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہیں

پرشوتم سنگھ سیٹھی
۱۰۵، آفیسرز ہوسٹل
[illegible] مارگ، لکھنؤ

اندرا جی - اپنے افکار کے آئینے میں

"میں آپ کو یقین دلا سکتی ہوں کہ میں سختی کے ساتھ جمہوریت کی پابند ہوں محض اس لیے نہیں کہ یہ اچھا آدرش ہے بلکہ اس لئے بھی کہ بھارت جیسے وسیع اور گوناگوں خصوصیات کے حامل ملک میں میرا خیال ہے کہ جمہوریت یعنی عوام کی شرکت ہی کام کرنے کا واحد راستہ ہے۔"

یہ خیالات شریمتی اندرا گاندھی نے اس وقت ظاہر کئے تھے جب ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی اور عوام میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کی جا رہی تھیں۔

انھوں نے ایک خصوصی انٹرویو میں مجھ سے کہا تھا "میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں کس قسم کی جمہوریت میں یقین رکھتی ہوں میں ایک ایسی جمہوریت میں یقین رکھتی ہوں جس میں برسراقتدار پارٹی پر مخالف پارٹیوں کے تئیں ایک ذمہ داری ہوتی ہے اور وہ مخالف پارٹیوں کو اظہار خیال اور تنظیم کی آزادی دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ امید بھی کرتی ہے کہ مخالف پارٹیاں یا وہ لوگ جو کسی بھی پارٹی میں نہیں ہیں حکومت کے کام میں رخنہ نہیں ڈالیں گے اور قومی پروگراموں کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔"

شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا "جمہوریت کا مطلب محض اخبارات کی آزادی یا آزادانہ انتخابات نہیں ہے بلکہ جمہوریت دراصل ملک کی تعمیر اور ترقی میں عوام کے تمام طبقوں کی مخلصانہ شرکت کا نام ہے۔" گزشتہ چالیس سالہ صحافتی زندگی میں میں نے بیکڑوں قریب شریمتی اندرا گاندھی سے ملاقات کی ان سے سوالات کئے اور مختلف مسائل پر ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی میرے مذکورہ بالا انٹرویو مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ ان میں چند کے اقتباسات درج ذیل کیے جا رہے ہیں۔

وقت کی پابندی

"کوئی وجہ نہیں کہ لوگ ایک مقررہ وقت میں اپنے کاموں کو ختم نہ کر سکیں اور اگر وہ اپنا کام نہیں ختم کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی خامی ہے آٹھ گھنٹے میں بہت زیادہ کام کیا جا سکتا ہے میں یقین نہیں کر سکتی کہ صرف چند لوگوں یا کسی مخصوص بحران کو چھوڑ کر باقی دنوں میں لوگوں کے پاس اتنا زیادہ کام ہوتا ہے جسے وہ ایک دن میں پورا نہیں کر سکتے۔"

قانون کیسا ہو

"قانون کو سماجی اور معاشی تبدیلی کی راہ میں رخنہ ڈالنے کا ایک وسیلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ غریبوں میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ ان کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا ہے۔"

"ہم دیکھتے ہیں کہ قانون کا استعمال کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اکثر بے قصور مصیبت میں پھنس جاتے ہیں اور قصوروار رہا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس صورت حال کی اصلاح کرنا ہے لاکھوں عوام اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب انھیں سماجی انصاف ملے گا اور قانون پر تیزی سے عمل درآمد ہوگا اور مقدمات کے اخراجات کم ہو جائیں گے۔"

وزیر اعظم کا فرض

"ایک وزیر اعظم کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ملک کے اتحاد

اور اس کی سالمیت کو برقرار رکھے اگر ہم یہی چیز کھو دیں گے تو پھر جمہوریت یا کوئی دوسری چیز کیسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔"

سوشلزم کیوں

ہم نے سوشلسٹ راستہ اپنایا ہے کیوں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ غریبی کو دور کرنے کیلئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

جمہوریت ہمارے سوشلزم کی بنیاد ہے جمہوریت فرد کو کئی حقوق دیتی ہے اور ان حقوق کے ساتھ ساتھ اسی قسم کی ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ملک ترقی کرے۔

ہمارے سوشلزم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ پرائیوٹ کارخانوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم ملی جلی اقتصادیات کے حامی رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ ایسی ملی جلی اقتصادیات جس میں سرکاری اور پرائیوٹ کارخانے سرگرمی سے کام کریں ہم نہیں چاہتے کہ گورنمنٹ سارا کام سنبھال لے گورنمنٹ کے لئے سارا بوجھ اٹھانا ناممکن ہے اور یہ بات مناسب بھی نہیں کہ ہر کام گورنمنٹ کرے۔

ہم سوشلزم کی بات کرتے ہیں برابری کی بات کرتے ہیں تو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے عوام کی بھلائی کے لیے۔ ملک میں عوام کا معیار زندگی اونچا ہوگا تو ملک خوشحال ہوگا۔

قومی فخر

ہمیں اپنے قومی فخر کا زیادہ سے زیادہ احساس ہونا چاہئے کسی فرد کا اپنے پر فخر کرنا اچھی بات نہیں ہے مگر اپنی قوم پر فخر کرنا بہت ضروری ہے ہر ملک چاہے وہ امریکہ ہو یا کوئی کمیونسٹ ملک ان کاموں پر ہمیشہ فخر محسوس کرتا ہے جو وہ انجام دیتا ہے اور یہی بات ملک کو متحد رکھتی ہے۔

ملک کی خدمت

دوسرے دیش ہمارے دیش کے کچھ لوگوں کو گمراہ کر کے ایسے حالات پیدا کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں جس سے ملک کمزور ہو۔ میں تو خطروں کے بیچ ہی پیدا ہوئی اور خطروں میں ہی پلی ہوں میری تو ایک ہی خواہش ہے کہ میرے جیون کا ایک ایک لمحہ دیش کی سیوا میں گزرے۔

ایٹمی ہتھیار

ایٹمی ہتھیاروں کی پیداوار پر روک لگنا چاہئے اور ایٹمی تجربات پر پابندی لگائی جانا چاہئے اور ہر طرح سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کو انسانیت کے خلاف جرم قرار دینا چاہئے۔ اس کے واسطے رائے عامہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندستان اور اقلیتیں

ہم محض اس بات پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے کہ تمام شہریوں سے مساویانہ سلوک کی ضمانتیں دے دی گئی ہیں۔ اقلیتوں کے خصوصی مسائل ہیں جن میں بعض تعلیمی اور معاشی پس ماندگی کی پیداوار ہیں ہم نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اقلیتی فرقے اپنے ثقافتی ڈھانچوں کو محفوظ رکھیں اسی لئے ہم نے اقلیتوں کے سماجی اور معاشی حالات کو سدھارنے کے لیے پروگراموں اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے

افسوس کی بات ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں جن کا رجحان فرقہ وارانہ ہے ہمارے بے شمار تیوہاروں کو استعمال کر کے مختلف فرقوں کے درمیان بد اعتمادی اور شک و شبہ کی تخم ریزی کرتی ہیں۔ فرقہ وارانہ واقعات کا بار بار ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انتظامی کاروائی کافی نہیں ہے ایک وسیع البنیاد قومی مہم ضروری ہے ان کو اس بات کا یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ تمام طبقات کی ترقی کا انحصار میل ملاپ اور خوش اسلوبی سے کام کرنے پر ہے۔

ملک کی سالمیت

مذہبی کٹرپن میں ادھر اضافہ ہوا ہے جو ہندستان کی رواداری کے منافی ہے۔ ملک نے دوسرے نظریوں اور مذاہب کے لیے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے ہیں لیکن اب باہر سے فرقہ پرست عناصر کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی ان کی ہمت افزائی کر رہے ہیں جو ہندوستانی شہری نہیں ہیں یہ رجحان ملک کی سالمیت اور یک جہتی کے لئے خطرناک ہے لیکن ہم اپنے ملک کی سالمیت کو ہر صورت میں برقرار رکھیں گے۔

ملک کی ایکتا اور یکجہتی

اندرا گاندھی کی آخری تقریر

بھائیو! اور پیاری بہنو!

بہت سال گزرے ہمارے ملک کی عظیم رہنما سروجنی نائیڈو نے کہا تھا کہ اڑیسہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے لیکن اس کا دل بہت بڑا ہے اور یہ سچ بھی ہے یہ ایک ریاست ہے جو ہماری تاریخ میں بہت مشہور رہی ہے بہت بہت سال پہلے سیکڑوں سال پہلے ایک بہت زبردست جنگ ہوئی تھی. یہاں کے لوگ بڑی جوانمردی سے لڑے. انھوں نے بہت قربانی دی لیکن وہ ہار گئے. مگر یہ ہار اس طرح سے ہوئی کہ جیتنے والے کا دل بدل گیا. میں شہنشاہ اشوک کی بات کر رہی ہوں، اسی ریاست میں انھوں نے فتح حاصل کی لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ ایسی جیت کی کوئی اہمیت نہیں، کوئی وقعت نہیں جیتنا ہو تو لوگوں کے دلوں کو جیتو. جیت لوگوں کو مارنے سے، لوگوں کو دکھ پہنچانے سے نہیں ہوتی اور اس دن سے انھوں نے محض کا نگا ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک میں ایک نیا نظریہ دوستی اور عدم تشدد کا پیش کیا. عدم تشدد اور ایک نئی رواداری کا جذبہ اور یہی نظریہ برسہا برس سے بھارت ورش کا نظریہ ہے. ہم کبھی بھول کرتے ہیں کبھی غلطی کرتے ہیں کبھی ہم سے کوتاہی ہوتی ہے لیکن ہمیشہ ہماری تمنا اور کوشش یہی رہتی ہے کہ ہم اس سمت میں بھارت کو لے جائیں اس کی سمت میں، عدم تشدد کی سمت میں دوستی کی سمت میں.

ملک کی خواہش

بھارت نے اپنی طویل تاریخ میں کبھی کسی دوسرے ملک پر حملہ نہیں کیا. یہاں بہت سے حملے ہوئے باہر سے لوگ آئے اور ان میں بہت سے یہاں بس گئے اور اچھے ہندوستانی بنے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے آزادی کی لڑائی میں یا آزادی کے بعد جب بھارت پر حملہ ہوا تو یہ سب لوگ جو ہندوستانی بن گئے تھے ایک ہو کر کھڑے ہوئے اور ہر مشکل کا سامنا کیا. آج ضرورت ہے کہ وہی جذبہ ہم پھر سے لوگوں کے دلوں میں ابھاریں. لوگ کہتے ہیں اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کرو لیکن سوچیے تو سہی اندرا گاندھی کی پالیسی کیا ہے. اندرا گاندھی کا کیا نصب العین ہے، یہ نہیں ہے کہ اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط ہوں بلکہ یہ ہے کہ بھارت کے رہنے والے کروڑوں لوگوں کے ہاتھ مضبوط ہوں. بھارت میں رہنے والے مرد، عورت، بزرگ، نوجوان، آدی واسی، ہریجن پسماندہ طبقات کوئی بھی لوگ یہاں کے ہوں ان کے ہاتھ مضبوط کرنے ہیں ان میں وہ ہمت پیدا کرنی ہے. وہ طاقت لانی ہے کہ وہ اپنے ملک کو اوپر اٹھائیں، محنت کریں نئے نئے وچار لائیں جس سے اس سائنسی دور میں بھارت بھی آگے بڑھ سکے. اب تک ہم نے بہت بڑے بڑے کام کئے ہیں زیادہ تر کام جو دوسرے دیشوں میں ہوئے ہیں، وہ کام ہم نے یہاں بھی کئے ہیں لیکن نیا کام یہاں بہت کم ہوا ہے اور وہ بھی ہو سکتا ہے جب یہاں کی نوجوان نسل اس نظریے سے سوچے. جب ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہو انھیں مستقبل کی، اپنے مستقبل کی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کی فکر ہو. ہمارے چاروں طرف بڑے بڑے درخت ہیں انھیں اتنا بڑا ہونے میں سیکڑوں سال لگے ہیں اگر اس زمانے میں ان

درختوں کو لگانے والے سوچتے کہ ان درختوں کو لگانے سے انھیں کیا فائدہ ملے گا۔ تو آج یہ خوبصورت درخت بھارت کے کسی حصہ میں نہیں ہوتے لیکن انھوں نے لگائے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ بھارت کو تھوڑے سے دن جینے والا نہیں ہے۔ بھارت کو تو سینکڑوں سال جینا ہے اس لیے جو کام ہم آج کریں گے وہ اس طرح کا ہونا چاہیئے کو سیکڑوں ہزاروں سال تک ہم بھارت کو مضبوطی دیں۔ یہ ہمارا نصب العین آج ہونا چاہیئے۔ ہم جب لوگوں کو دھیان دلاتے ہیں کہ باہر کے خطرے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہم ڈرتے ہیں، اس لیے نہیں کہ آپ کو ڈرانا چاہتے ہیں لیکن اس لئے کہ اصلیت کیا ہے۔ وہ بھارت کے سب لوگوں کو جاننا چاہیئے۔ ڈرنے کے لیے نہیں، ہمت ہارنے کے لیے نہیں لیکن اس لیے کہ ہمت سے ہم وہ کام اور تیزی سے کریں، ہمت سے وہ اپنا فرض نبھائیں۔

ہر شخص کا فرض

امریکہ کے ایک صدر نے اپنے لوگوں سے کہا تھا کہ یہ مت پوچھو کہ تم کو ملک سے کیا ملے گا لیکن یہ بتاؤ کہ تم اپنے ملک کو کیا دیتے ہو۔ یہی سوال آج ہم بھارت کی جنتا سے کرتے ہیں۔ ہم بھارت کی جنتا سے پوچھتے ہیں کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگنے کی جو عادت پڑ گئی ہے اسے ترک کرنا چاہیئے مجھے معلوم ہے کہ ہمارے دیش میں ابھی بھی بہت غریبی ہے، مجھے معلوم ہے کہ پینے کے پانی کی کمی ہے۔ سوکھا پڑتا ہے اور سمندر سے طوفان آتا ہے۔ بہت سے گھر تباہ ہو جاتے ہیں۔ کاروبار درہم برہم ہو جاتا ہے جانیں جاتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ ان چیزوں پر ہم قابو پا رہے ہیں۔ ہم نے خلا میں اپنا مصنوعی سیارہ جو بھیجا تو کس لیے؟ اس لیے نہیں کہ محض نام بڑا ہو بلکہ اس لیے کہ اس سے جو معلومات حاصل ہوں گی اس سے ہم اپنے کسانوں کی مدد کر سکیں گے۔ جو طوفان آتے ہیں یا بارش نہیں ہوتی اگر اس کی اطلاع پہلے مل جائے تو ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ مصنوعی سیارے کے ذریعہ ہم دور دراز کے علاقوں میں لوگوں کو تعلیم دے سکتے ہیں، جہاں اچھے اسکول نہیں ہیں، جہاں اعلا درجے کے ٹیچر یا کتابیں دستیاب نہیں۔ دور درشن کے قیام سے یہی ہمارا مقصد ہے۔ یہی مقصد ہے مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجنے کا اور سائنسی کام ———— کا جب بھی میں اپنے سائنس داں بھائیوں سے ملتی ہوں تو انھیں ایک ہی پیغام دیتی ہوں کہ ایسا کام کرو کہ جس سے ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے ساتھ ساتھ اگر سائنسی نظریہ کو فروغ نہیں دیں گے اگر ہم توہمات میں پھنسے رہیں گے اگر ہم آپسی جھگڑوں میں الجھے رہیں گے اگر ہم فرقہ پرستی کو برداشت کریں گے اور اس کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر ہم ذات پات کو بڑھنے دیں گے یا علاقے یا زبان کے نام پر جھگڑے کریں گے تو بھارت کی ایکتا بچ نہیں سکتی۔ ایکتا نہیں بچے گی تو آزادی کیسے محفوظ رہ سکے گی۔ اس لیے آزادی ایک بار جیت لی تو یہ مت سمجھئے کہ ہمیشہ کے لیے وہ آزادی قائم رہے گی ہر پل، ہر روز اس کے لیے لڑنا ہے۔ ہر روز اس کے لیے کرنا ہے تاکہ غریب جنتا کو بتا سکیں کہ آزادی کی اصلیت کیا ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ اگر کوئی بھوکا ہے، بے روزگار ہے اور اس کے پاس کپڑا نہیں ہے تو اس کے نزدیک آزادی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

ہماری آزادی تب ہی محفوظ ہوگی جب اپنے عظیم رہناؤں کے یہ خواب پورے کر پائیں گے۔

جمہوریت اور سوشلزم

ہم نے یعنی کانگریس نے آزادی جیتی۔ ہمارے پاس بہت عظیم رہنما تھے۔ اس میں ہندو تو تھے ہی لیکن مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، پارسی اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کے لوگ اس وقت آگے نہیں آئے اور آزادی کی جدوجہد میں قربانیاں نہیں دیں۔ آزادی کے بارے میں انھوں نے کیا خواب دیکھا تھا؟ ان میں سے بہت سے لوگ تھے جن کے پاس سب کچھ تھا اور انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ سب دینے کو تیار ہو گئے۔ اس لیے کہ ملک کی جو بے عزتی ہو رہی تھی، غلام ہونے کی وجہ سے دیس کو جو دکھ تھا اس کو مٹائیں جب ہم آزاد ہوئے تو ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ درحقیقت اصلی کام تو اس وقت شروع ہوا۔ اس وقت کانگریس نے دو کام ہاتھ میں لیے ایک یہ کہ جمہوریت یہاں لائیں کیوں کہ جب تک سب کی آواز سنی نہیں جائے گی ———— تب تک آزادی بھی پوری نہیں ہوگی اور دوسرا سوشلزم کا راستہ اپنایا کیونکہ جب تک اقتصادی برابری نہیں آتی ہے، برابری کے مواقع لوگوں کو نہیں

سکتے ہیں تب تک آزادی بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اگر سماج میں اونچ نیچ بہت ہوگی، امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھے گا تو تناؤ بڑھے گا جھگڑا بڑھے گا۔ اگر سماج میں امن نہیں ہے تو آزادی محفوظ نہیں رہ سکتی، نہ تو ترقیاتی پراجکٹوں پر عمل درآمد ہو سکتا ہے اور نہ ہی ترقی کی جا سکتی ہے اس لیے ابتدا سے ہی ہم نے خود انحصاری کی طرف آگے بڑھنے کو قدم اٹھائے۔ آپ کہیں بھی بھارت میں جائیے آپ دیکھیں گے کہ بھارت کا نقشہ کیسے بدل رہا ہے، لیکن ہم جتنا آگے بڑھتے ہیں ویسے ہی نئے نئے مسئلے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ پرانا مسئلہ غریبی اور اقتصادی پسماندگی کا تو ہے ہی لیکن نئے مسئلے ترقی سے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں۔

متوازن ترقی

بہت سے ملک بہت امیر ہیں لیکن وہ اپنی بے روزگاری کو ختم نہیں کر سکے ہیں۔ مہنگائی کو ہٹا نہیں سکے بلکہ اس میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہم کو بھی ایک راستہ ڈھونڈنا ہے جہاں ہم ان سب سے بچنے کی کوشش کریں کیونکہ ہمارے لیے یہ نئے سوال نہیں ہیں۔ ہمارے یہ پرانے سوال ہیں اور پہلے سے ہی ہم ان کا کچھ حل تلاش کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بے روزگاری کیسے دور ہوگی۔ مہنگائی کیسے دور ہوگی۔ محض جب پیداوار بڑھے گی اور نوکریاں لوگوں کو ملیں گی کام کے مواقع ملیں گے اور ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جب پیداوار بڑھتی ہے اور ہم کامیابی حاصل کرتے ہیں تو اس کے فائدے تمام لوگوں کو پہنچیں۔ تب ہم تعلیم اور صحت کے پروگرام — جتنا تک پہنچا سکیں گے۔ خاص طور پر جو علاقے پچھڑے ہوئے ہیں اور جو طبقے ایسے ہیں جن کے ساتھ صدیوں سے ناانصافی ہوئی ہے۔ سماجی ناانصافی کو ہم دور کریں یہ ہمارا نصب العین ہے اور اس راستے پر ہم چل رہے ہیں پہلے بھی چل رہے تھے اور آج بھی چل رہے ہیں اور ہم ہمت سے چلتے رہیں گے چاہے ہمارے پاس اقتدار ہو یا نہ ہو۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ ریاستوں میں دوسری پارٹیاں برسر اقتدار آئیں۔ کانگریس نے کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ ان کے خلاف کوئی کاوائی [illegible] نہیں کی، کسی پر حملہ نہیں کیا، کوئی تشدد کے واقعات [illegible]۔ [illegible] ان کو ہم نے قبول کیا لیکن اپنا کام ہم آگے [illegible] سال تک اڑیسہ میں شمالی ہند کی دوسری

ریاستوں اور مرکز میں بھی کانگریس مخالف پارٹیوں کی سرکار رہی۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں میری بہنو! بھائیوں! نوجوانو! کہ اس تین سال میں انھوں نے کونسا کام آپ کے لیے کیا۔ روزگار میں کتنا اضافہ کیا۔ کونسا پروگرام کیا جس سے ہمارے کسانوں کو فائدہ پہنچایا پیداوار بڑھی؟ پچھڑے ہوئے علاقوں میں کتنی صنعتیں لگائی گئیں؟ پہلے وہ کہتے تھے کہ اندراجی کو تو کسان کی فکر نہیں ہے محض صنعت کی فکر ہے لیکن کسانوں نے دیکھ لیا کہ تین سال میں کسان کو کچھ نہیں ملا۔ اور کسانوں کو خود ایجی ٹیشن کرنا پڑا اور جتنا کام کسانوں کے لیے ان پچھلے چار برسوں میں ہوا ہے اتنا شاید بھارت کی پوری تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ لیکن کسان کے لیے ہی نہیں، صنعت میں بھی ترقی ہوئی ہے اور آج کل کی دنیا میں جو بھی ہے وہ صنعت کے بغیر زمینی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ بڑی صنعتوں کی، درمیانہ درجے کی صنعتوں کی اور چھوٹی صنعتوں کی ضرورت بڑے کسان کو بھی ہے اور چھوٹے کسان کو بھی۔ شہر اور دیہات کے لوگوں اور عورتوں کو بھی اس کی ضرورت ہے اس لیے ہم صنعت لگاتے ہیں لیکن ہماری صنعتیں چل نہیں سکتیں۔ اگر ہمارے دیہات میں سدھار نہ ہو اور دیہات کے لوگ اوپر نہ اٹھ سکیں، اگر زرعی پیداوار نہیں بڑھتی تو ہماری صنعتیں بھی پھل پھول نہیں سکتیں۔ سب کا انحصار ایک دوسرے پر ہے اور ہمیں سب کو ملا کر چلنا ہے۔ سماج میں توازن پیدا کرنا ہے لیکن یہ سب کام تب ہوں گے جب شانتی ہوگی۔

اپوزیشن پارٹیاں جو ہماری مخالفت کرتی ہیں ایسے ایجی ٹیشنوں کی حمایت کرتی ہیں اور ایسے ایجی ٹیشن خود بھی چلاتی ہیں جس سے ملک کو نقصان ہوتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کا کیا اثر پڑے گا سماج پر اور لوگوں پر کتنا دکھ ہوگا کتنا کشٹ اور ہم وطنوں کو کتنی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کتنے ہی ایسے ایجی ٹیشن چلائے جا چکے ہیں۔ اس سے دیش کی ایکتا کو زبردست ٹھیس پہنچی ہے اور وہ نعرے ہیں، وہ دیش کے اندر کے نعرے نہیں ہیں۔ جو لوگ دیش کے باہر رہتے ہیں انھوں نے وہ غلط نعرے بلند کیے لیکن یہاں جو ایجی ٹیشن ہوا اس میں بہت سے سماج دشمن اور کچھ ملک دشمن لوگ گھس گئے اور ایجی ٹیشن کی آڑ میں انھوں نے کئی غلط کام کیے۔ پنجاب میں کیا

ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ جموں اور کشمیر میں کیا ہو رہا تھا شاید وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کسی بھی جگہ کسی فرد کا سوال نہیں تھا اور نہ کسی ذات کا کوئی سوال تھا نہ کسی مذہب کا سوال تھا، نہ کسی پارٹی کا سوال تھا۔ سوال یہ تھا کہ جو بات ہو رہی ہے وہ ملک کے لیے فائدہ مند ہے یا ملک کے لیے دشواری پیدا کرتی ہے اور آگے کے لیے خطرہ پیدا کر رہی ہے جو پنجاب میں ہوا اس سے بہت سے لوگوں کو دکھ ہوا اور ہم نے جو کیا وہ ناگزیر تھا لیکن کیونکہ دوسروں کو دکھ ہوا اور میں بھی ان کو اپنے ہی بیٹے مانتی ہوں تو مجھے بھی دکھ ہوا لیکن کوئی بھی ملک، کوئی بھی سرکار، ایسا کام برداشت نہیں کر سکتی جس سے ملک میں ذرا بھی کمزوری آئے چاہے کہیں بھی ہو، بھارت کے شہریوں کو سب سے پہلے بھارت کا فائدہ سوچنا ہے، حب الوطنی اور قومیت کا جذبہ اپنانا ہے چاہے کوئی مذہب ہو کوئی فرقہ ہو اس کے اندر کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن لوگ سوچتے ہیں کہ چناؤ میں شاید کچھ ووٹ مل جائیں تو کسی بھی ایجی ٹیشن کو شہ دو۔ یہ ساری جنتا کو سمجھنا ہے کہ اس سے ملک کو خطرہ بڑھے گا۔ ہماری پالیسی تمام ملکوں سے دوستی رکھنے کی ہے لیکن بھارت کے وقار کو چھوڑ کر نہیں، بھارت کی بھلائی کو چھوڑ کر ہم پر بہت بار حملہ ہو چکا ہے، پانچ بار حملہ ہو چکا ہے اس لیے ہمیں ہر حملے کے مقابلہ کے لیے تیار رہنا ہے لیکن ہم نے یہ یقین پہلے بھی لوگوں کو دلایا کہ ہم کبھی حملہ نہیں کریں گے۔ ہماری کوشش تو آخری گھڑی تک رہے گی دوستی کرنے کی۔ ہم تمام ملکوں کے ساتھ دوستی کی پالیسی جاری رکھیں گے۔ ملک کے اندر بھی ہماری یہی پالیسی ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک کے اردگرد مختلف قسموں کے جھگڑے چل رہے ہیں اور دوسری کیا کیا باتیں ہو رہی ہیں آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستانی نژاد تامل لوگوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سری لنکا میں غیر یقینی حالات کے باعث چالیس ہزار سے زیادہ پناہ گزیں تامل ناڈو پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں نئے تناؤں کا سامنا ہے اور ہم بمشکل تمام ان پر قابو رکھے ہوئے ہیں۔

اپوزیشن کا عدم تعاون

پچھلے انتخابات ہم نے جیتے تھے لیکن اپوزیشن پارٹیوں نے عوام کے اس فیصلے کو ایک دن بھی قبول نہیں کیا ہماری جیت کے پہلے ہی دن اپوزیشن کے ایک لیڈر نے کہا تھا کہ اب جمہوریت کے کوئی معنی نہیں رہ گئے، پارلیمنٹ کے کوئی معنی نہیں رہ گئے۔ لہٰذا ہمیں لڑائی کو سڑکوں اور گلیوں تک لے جانا ہوگا۔ پہلے ہی دن سے خواہ پارلیمنٹ کے اندر ہو یا اس کے باہر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی طرح بھی حکومت کو کمزور کریں۔ اس کے کام میں رکاوٹ ڈالیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھارت آگے بڑھا ہے اور ہر سمت میں آگے بڑھا ہے۔ پیداوار میں کھیتی باڑی کے کام میں، صنعت میں سائنس میں ٹیکنالوجی میں ان سب میدانوں میں اتنا آگے بڑھا ہے کہ دوسرے ملکوں کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ چاہے بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہوں، چاہے بڑے بڑے اقتصادی ادارے ہوں سب نے یہ اعتراف کیا کہ بہت مشکل اڑچنوں کے باوجود بھارت نے دنیا کو ایک راستہ دکھایا، قرضہ لیے بغیر اور کسی مصیبت میں پھنسے بغیر اس نے یہ سب کچھ کیا۔ ۱۹۸۰ء سے ہر سال آپ دیکھئے کہ کوئی سال نہیں گزرا ہے جب کوئی بہت بڑا ایسا کام نہ ہوا ہو جس سے دنیا بھر میں بھارت کی عزت میں اضافہ نہ ہوا ہو اور بھارت کے نوجوانوں کو اور دانشوروں کو اپنا نام اور اپنا علم بڑھانے کے نئے مواقع نہیں ملے ہوں۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بھارت اسی راستے پر چلتا رہے اپوزیشن پارٹیاں ایکتا کی باتیں کرتی ہیں۔ جب میں ایکتا کی بات کرتی ہوں کسی کو ہٹانے کے لیے نہیں بلکہ بھارت کو شکتی دینے کے لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے مادرِ وطن کے سب عوام بلا لحاظ مذہب و ملت، زبان، رنگ و نسل ایک ہوں کہ اتحاد اور ایکتا بھارت کو اور زیادہ مضبوط بنائے لیکن جب دیگر ایکتا کی بات کرتے ہیں تو کیا معنی ہیں ان کے ایک ہونے کے اور کس لیے۔ کسی پروگرام کے لیے نہیں، کسی پالیسی کے لیے نہیں محض اس لیے کہ کسی نہ کسی طرح سے وہ برسرِاقتدار آ سکیں۔ کسی کو اقتدار ملے میں اس کے خلاف نہیں ہوں اگر وہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر کوئی خواہش نہ ہو بلکہ ایک نکاتی پروگرام محض یہ ہو کہ کسی نہ کسی طرح سے طاقت ہاتھ لگ جائے تو کیا ایسے لوگ ملک کے مستقبل کو سنوار سکیں گے؟

بے بنیاد الزام کسی نے کہا کہ اندرا گاندھی تو دن میں دو بار پوشاک بدلتی ہیں لیکن پوشاک بدلی جاتی ہے یا نہیں، اس کی کیا اہمیت ہے آپ تو مجھے صبح سے رات تک دیکھتے ہیں کہ کسی دن مجھے پوشاک بدلنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کپڑے بدلنا قابلِ اعتراض بات ہے یا ہر گھڑی پالیسی بدلتے رہنا؟ یہ لوگ اپنی پالیسیاں اس ڈھنگ سے بدلتے رہتے ہیں جیسے کپڑے بدلے جاتے ہیں۔ انھیں اپنے خود غرضانہ مقاصد کی خاطر کسی بھی چیز کو بدلنے میں رتی بھر عار نہیں۔ یہ لوگ اپنے انتخابی نشان اپنے نام، اپنی پارٹی کے جھنڈے تک کا سودا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، یہ لوگ کس حد تک ملک کے اتحاد کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو ان خطرات کے بارے میں علم نہیں ہوتا جو ملک کے سر پر منڈلا رہے ہوں یا جن سے دنیا بھر کو سامنا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہمیں خطرات کی طرف توجہ کیوں دینی چاہیئے؟ اس لیے نہیں کہ ہم ان سے خوف زدہ ہیں بلکہ اس لیے کہ بھارت جیسا ملک ان خطرات کا خاطر خواہ طور پر سامنا کرنے کے لیے مستعد رہے۔ خطرات ملک کے اندر بھی ہیں، سماج کے اندر بھی اور بیرونی بھی۔ بھارت اپنی آواز محض اپنے لیے نہیں اٹھاتا۔ ہماری آواز کانگریس کے لیے نہیں ہے۔ ہم یہاں بھارت کی جنتا کی طرف سے ہند کی نوجوان نسل کی طرف سے جو ہمارے ملک کا مستقبل ہیں آواز اٹھا رہے ہیں۔ اگر یہ نوجوان صحیح سمت میں آگے بڑھتے ہیں اور تعمیری کاموں میں اپنی طاقت کو صرف کرتے ہیں اور تخریبی کارروائیوں میں نہیں الجھتے تو ان کا مستقبل روشن ہے۔ تب یہ نوجوان نہ صرف اپنی ریاست بلکہ پورے ملک کے معمار بن سکتے ہیں لیکن ہم یہاں جو کچھ کہتے ہیں اس کی بھی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ ہماری امداد بند کر دی جاتی ہے لیکن جہاں کہیں بھی ناانصافی ہوگی بھارت سب سے پہلے اس کے خلاف آواز بلند کرے گا کیونکہ اگر ایک جگہ ناانصافی ہوتی ہے۔ اور لوگوں کو دبایا جاتا ہے تو اس سے پوری دنیا متاثر ہوتی ہے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ آزادی ناقابلِ تقسیم ہے اسی طرح ترقی بھی ناقابلِ تقسیم ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک سائنسی ترقی کے باعث امیر بن گئے ہیں۔ اور یہ ملک بہت طاقتور ہیں۔

اور وہ دوسرے ملکوں کو اپنے اثر و رسوخ کے تلے لانا چاہتے ہیں، اپنے نظریات سے دوسروں پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی کمزور ملک کچھ کام کرتا بھی ہے تو یہ بڑی طاقتیں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ترقی پذیر ملکوں نے کچھ نہیں کیا۔

مجھے کچھ مدت کے لیے مجبوراً ایمرجنسی لاگو کرنا پڑی تھی لیکن اس کے لیے آج بھی میری نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ مجھے ڈکٹیٹر ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن یہی لوگ دوسرے ڈکٹیٹرانہ نظاموں کی روپے پیسے، ذرائع اور ہتھیاروں سے مدد کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی نظر میں وہ ڈکٹیٹر شپ نہیں۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ یہ لوگ کیوں نہیں چاہتے کہ بھارت آگے بڑھے ہمیں اپنا خیال خود رکھنا ہوگا۔ اور یہ مجھ اکیلی کی ہی ذمے داری نہیں ہے۔ میں آج ہوں کل نہیں رہوں گی۔ میں کئی بار یہ بات پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ کسی کو کیا معلوم کہ مجھے ختم کرنے کی کتنی بار کوششیں کی جا چکی ہیں مجھے کتنی بار گولی کا نشانہ بنانے کی کوششیں ہو چکی ہیں اور لاٹھیوں سے بھی مجھ پر حملے کیے گئے ہیں ہمیں بھونیشور میں، میں اینٹ لگنے سے زخمی ہوئی تھی۔ القصہ انھوں نے ہر طرح سے مجھ پر حملے کیے ہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں زندہ رہتی ہوں یا نہیں میں نے کافی لمبی عمر گزاری ہے اور اس پر مجھے اگر کسی بات پر ناز ہے تو اس پر کہ میری ساری زندگی خدمت میں گزری ہے۔ صرف اس بات پر ناز ہے اور کسی بھی بات پر نہیں اور جب تک مجھ میں سانس ہے تب تک میری زندگی خدمت کرنے میں گزرے گی اور جب میری جان جائے گی تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ بھارت کو زندہ رکھے گا۔ اور بھارت کو مضبوطی دے گا۔

میں تمنا کرتی ہوں کہ نوجوان اس بات پر آج غور کریں اور ان ذمہ داریوں کو سنبھالیں۔ کسی دوسرے کو اپنا رہنما بنا کر نہیں چلنا ہے رہنما آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آزادی کی لڑائی چل رہی تھی تو کتنی دفعہ سب جیل میں ہوتے تھے لیکن لڑائی رکی نہیں۔ ہر ایک کو سوچنا ہے کہ یہ ہمارا ملک ہے اس کو طاقتور بنانا ہے اس کی یکجہتی کو مضبوط رکھنا ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اندرا گاندھی کانگریس یا کسی دوسرے نیتا کی نہیں ۔ خود انحصاری کی جب ہم بات کرنے میں تو خود انحصاری

(باقی ص ۱۸۳ پر)

عزیز جھانسوی
بساطی بازار
جھانسی

اندرا گاندھی

اس نئی الجھن کو یارو کون سلجھا پائے گا
درد کا سیلاب ہے یہ کس سے روکا جائے گا
اک اندھیرا ہے جو ہر سو چھا گیا ہے ان دنوں
صبح نو کا کون بن کر آج سورج آئے گا

آدمی کے غم کا تجھ کو ہر گھڑی احساس تھا
آدمیت کا بھی تجھ کو درحقیقت پاس تھا
تھی یقیناً نرم و نازک اور مثلِ ماہتاب
ہم سمجھتے ہیں کہ تیرا دل بہت حساس تھا

شکوۂ جور و جفا لب پر کبھی آیا نہیں
دل ترا حالات کی تلخی سے گھبرایا نہیں
ساری دنیا کو دیا امن و اخوت کا پیام
کون ہے اپنا پرایا یہ کبھی سوچا نہیں

تجھ سے سیکھا ہے زمانے نے فراست کا شعور
اور کمزوروں غریبوں سے شجاعت کا شعور
تجھ سے سیکھے سربراہوں نے رموزِ مملکت
تو نے بخشا ہے زمانے کو سیاست کا شعور

ملک سے تجھ کو محبت تھی یقیناً بے مثال
تجھ کو ہر لمحہ رہا اس کی ترقی کا خیال
سرخیٔ خونِ وفا کا یہ کرشمہ دیکھ لے
نام تیرا اندرا اب ہو گیا ہے لازوال

جلیل فتحپوری
۸۸/۸۹ چمن گنج
کانپور

وہ اپنے حسنِ عمل سے ہے آپ پائندہ

جس آفتاب سے ہندوستان روشن تھا
میں سن رہا ہوں کہ وہ آفتاب ڈوب گیا
جو کارنامۂ زریں کا خود ہو مجموعہ
وہ آفتاب کبھی ڈوب ہی نہیں سکتا
یہ جانتا ہوں کہ ہر چیز کا ہے فنا انجام
یہ مانتا ہوں کسی کو یہاں دوام نہیں
وہ شاہ ہو کہ گدا ہو امیر ہو کہ فقیر
کسی طرح بھی کسی کو یہاں قیام نہیں
مگر یہاں ابدی زندگی بھی ملتی ہے
یہ شرط ہے عملِ تابناک کا ہو امیں
نظر سے ہو کے بھی پنہاں وہ زندہ رہتا ہے
خدا گواہ کوئی بھی ہو اس کو موت نہیں
وہ اندرا ابدی آفتاب جس کو کہیں
وہ اپنے حسنِ عمل سے ہے آپ پائندہ
فنا کی گود میں رہتے ہوئے بھی اے دنیا
یہ آفتاب ہمیشہ رہے گا تابندہ
چمک رہا ہے یہاں آج اندرا کا عمل
مرا مزاجِ عقیدت بھی جگمگائے گا
اثر پذیر رہیں گے جلیل سب کے دل
زمانہ حسنِ عقیدت کے گیت گائے گا

حکیم جوہر بہرائچی

مسز اندرا گاندھی کی روح کا اپنی قوم سے خطاب

زمانہ بھر کی بلا سر پہ مول لی میں نے
تمہاری زلفِ پریشاں سنوار دی میں نے
ہزار مجھ پر ستم کے پہاڑ توڑے گئے
کسی کے ساتھ مگر کی نہ دشمنی میں نے
بھنور میں پھنس کے کبھی جا کے بیچ طوفاں میں
تمہیں بتائے اصولِ شناوری میں نے
بگولے اس کے ہیں شاہد پہاڑ بھی ہیں گواہ
کہاں کہاں نہیں برتی ہے دوستی میں نے
تمہاری قدروں میں تزویر کو نہ آنے دیا
دیا نہ درسِ فریبِ عمل کبھی میں نے
تمہیں بتاتی رہی میل جول سے رہنا
کہ اتحاد میں پائی تھی زندگی میں نے
کسی کا دل نہ دکھانا نہ بے رخی کرنا
تمہیں سکھائے یہ اسرارِ دلکشی میں نے
اسی لیے کہ شعورِ عمل سکھا دوں تمہیں
بتائی بات نشیب و فراز کی میں نے
مری ہی کاوشِ پیہم سے ہے وطن آزاد
تمہیں سکھائے تھے اندازِ آگہی میں نے
ہرا بھرا چمن اہلِ چمن مبارک ہو
مرا لہو ہے بنامِ وطن مبارک ہو

عدیلہ عباسی جامی چریاکوٹ
ضلع ترقیاتی دفتر، اعظم گڑھ

آنجہانی اندرا گاندھی کی یاد میں

تیرتے ہیں آنکھ میں آنسو زباں خاموش ہے
سوگ میں اہلِ چمن ہیں، گلستاں خاموش ہے
جیسے بحرِ بے کراں، کوہ گراں خاموش ہے
چھا گئی غم کی گھٹا، ہندوستاں خاموش ہے
مادرِ ہندوستاں کو کس نے گولی مار دی
دیش کا ہر بچہ بوڑھا نوجواں خاموش ہے
ڈوبتی سی لگ رہی ہے آج نبضِ کائنات
سرنگوں ہے آسماں، سارا جہاں خاموش ہے
راستوں کے پیچ و خم میں کھو نہ جائیں منزلیں
بند آنکھیں کرکے میرِ کارواں خاموش ہے
احتراماً جھک گئے ہر دیش کے پرچم تمام
سانحہ گزرا ہے ایسا ہر نشاں خاموش ہے
ایک شعلہ سا اٹھا کتنے نشیمن جل گئے
دیکھ کر بربادیاں برقِ تپاں خاموش ہے
کون ٹکرائے گا طوفاں سے کہاں ہے اندرا
پربتوں کے سلسلوں میں وہ کہاں خاموش ہے
ایکتا، امن و اہنسا جس کا تھا قول و عمل
وہ شفیق و غم گسار و مہرباں خاموش ہے

سیف اللہ خاں سرآتش اٹاوی
ایس۔ این کالج۔ کرہ پر دال خاں
اٹاوہ (یوپی)

انجہانی

اِندرا گاندھی کا پیغام

میں ————
اپنا خونِ جگر لٹا کر،
تمہاری دنیا سے جا رہی ہوں
مگر
سنو: ————
اے وطن کے لوگو
زمین،
تشنہ دہن تھی
میرے لہو سے سیراب ہو گئی ہے۔
ہر ایک بستی،
نگر نگر میں ————
بجھا دو بغض و حسد کے شعلے
چراغِ امن و اماں جلاؤ
ستم کی تاریکیاں مٹاؤ
جو لوگ،
گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں
انھیں/نئی زندگی ملے گی۔
بھلا کے آپس کے بھید بھاؤ
گلے سے مل جاؤ
میرے بچو۔
کہ مضطرب مری آتما کو
اسی طرح/شانتی ملے گی۔

وطن کا ترنگا بلند رکھو
چمن کی عظمت بڑھانے والو
گلوں کی حرمت بڑھانے والو
خزاں سے گلشن بچائے رکھو
روش روش تم سجائے رکھو
بہار بن کر،
میں ————
گلستاں کی فضاؤں میں
جھومتی ملوں گی
مرے لہو کا ہر ایک قطرہ
زمینِ گل پر،
امر رہے گا ————

جاوید اکرم
سنٹرل اسکول ترچم ترونندرم
کیرالا

صبحِ غم

اکتیس اکتوبر انیس سو چوراسی کو
جیسے ہی صبح کے شبنمی لب کھلے
ایک سورج اگا
اور پھر دیکھتے دیکھتے
رات ہونے لگی
صبح پھر اپنی باہوں میں سونے لگی
اپنی قسمت پہ نرگس بھی رونے لگی
خون پھولوں کی آنکھوں سے رسنے لگا
تتلیاں جسم کے زخم گننے لگیں
فاختائیں درختوں سے گرنے لگیں
شہر جنگل میں تبدیل ہونے لگے
منزلیں اپنی باہوں میں سونے لگیں
قافلے اپنی راہوں میں کھونے لگے
آنکھیں پتھرا گئیں ہونٹ سلنے لگے
پھول شعلوں کے دامن میں کھلنے لگے
عمر بھر کے لیے گفتگو کھو گئی
صبحدم دل کی ہر آرزو کھو گئی
صندلی خوشبوئیں حسرتوں کی چتا سے اٹھیں اور فضاؤں کی آنکھوں سے رسنے لگیں
پیڑ، پودے، پرندے ہواؤں کے آنگن میں چپ چاپ دم سادھے بیٹھے رہے۔
چاند سورج ستارے زمیں کی طرح خود بخود غم زدہ ہو گئے
مندروں سے بھجن، مسجدوں سے دعاؤں کی آوازیں آنے لگیں
چرچ میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں
اور پھر
دیکھتے دیکھتے آسماں سے صدائیں اترنے لگیں
آج کی صبح تاریخ کی شام ہے
چاند سورج کا لیکن یہ پیغام ہے
مرنے والے تیری دکھ بھری موت کا
زندگی نام تھا زندگی نام ہے

ڈاکٹر ترلوکی ناتھ خوشو
تلخیص و ترجمہ : موھن لال وشنوی

شریمتی اندرا گاندھی
ہندستانی سائنس کی سرپرست

آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کے لیے ماحولیات کا موضوع بڑی دل چسپی اور اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا انداز فکر نہ صرف نمایاں بلکہ تمام علاقائی و طبقاتی رجحانات سے کہیں بالاتر نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ خود کو ہمالہ کی بیٹی تصور کرتی تھیں اور اس حقیقت کے پیش نظر ان کی یہ وصیت کہ ان کے جسد خاکی کا مسکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمالہ کی برفیلی چوٹیاں اور کوہستانوں کا دامن ہو، ان کے اسی انداز فکر کی نشاندہی کرتی ہے۔ پہاڑوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان کے جغرافیائی یا ارضیاتی وجود ہی کی بات نہیں کرتی تھیں بلکہ قدرت اور حیات و کائنات کا بھی ذکر کرتی تھیں جو ازل سے قائم ہے، متحرک ہے اور نوع انسانی جس کا ایک جزو لازم ہے۔ ان کے خیال میں ماحولیاتی نظام ٹکڑوں یا حصوں میں بٹی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس میں صرف جنگلی جانور جیسے شیر، چیتے، ببر شیر، ہاتھی، چرند اور پرندوں کا ایک بہت بڑا سلسلہ ہے یا صرف ایسے جنگلات جو ہرے بھرے درختوں اور جڑی بوٹیوں سے معمور نظر آتے ہیں، بلکہ ان کا نظریہ ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی وسیع النظری نے انسان کے کلیدی کردار کو بخوبی دیکھا اور پرکھا تھا، بلکہ ملک کے مختلف قبیلوں کے آدی باسیوں کو بھی جو نظام قدرت کے تحت ہمہ وقت یکسوئی کی زندگی گزارتے ہیں اور قدرت کا ایک حصہ بن کر جیتے ہیں اور اس سے اتنا ہی حاصل کرتے ہیں جس کی انھیں ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف شہروں کی زندگی کافی مختلف ہے کیونکہ یہاں کے لوگ نظام قدرت سے ٹکراؤ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عناصر اربع (یعنی آگ، پانی، مٹی، ہوا) نباتات و ذی حیات اور سورج سے ملنے والی روشنی کو بھی انھوں نے نظام زندگی کی ایک اہم کڑی سے تعبیر کیا ہے۔ ان عناصر کے باہمی ربط، باہمی اشتراک و انحصار میں ہی زندگی کی نشو و نما اور مطابقت پذیری کا عمل مضمر ہے اور یہی وہ نظام ہے جو قدرتاً موثر و متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہے۔ متذکرہ عناصر کا باہمی میلان ہماری زندگی اور ماحولیاتی تحفظ کی ضمانت ہے۔ انھوں نے ماحولیاتی تنزلی اور غریبی کے درمیان گہرے روابط کا انکشاف کیا ہے۔ ایک طرف ترقی پذیر ممالک کے ترقیاتی منصوبے اور دوسری طرف ترقی یافتہ ملکوں کی لاپرواہی سے جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ اس سے ماحولیاتی تحفظ کے لیے شدید خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

اسلحہ سازی اور کیمیاوی جنگی ساز و سامان اور نیوکلیائی ہلاکت سے عالمگیر بربادی کے خدشے کو بھی انھوں نے محسوس کیا تھا۔ حقیقتاً ان کی وابستگی عالمی امن اور ماحولیاتی تحفظات سے بھی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ ان میں ماحولیاتی شعور موجود تھا۔

ان کے نظریے کا ایک حساس پہلو یہ بھی تھا کہ وہ پہلے عوام کی غریبی سے بے حد متاثر تھیں، اور انھیں اس بات کا یقین تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہی ایک مثبت و طاقتور ذریعہ ہے۔ جو ہماری سماجی و معاشی ترقی و تبدیلی کے لیے بیحد ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود انھوں نے اور ان کے لائق والدِ محترم نے یہ محسوس کیا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی نوعیت اور اس کے استعمال سے ترقی پذیر ممالک کی غربت اور ترقی یافتہ ملکوں کی کامیابی و ترقی کی حدیں متعین ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کی حیثیت ایک عظیم ماہرِ ماحولیات۔ یا ایک عظیم ماہر ترقیات کی نہیں تھی، مگر ان کی شخصیت میں ان دونوں موضوعات کا صحت مندانہ و عالمانہ امتزاج ہمیشہ رہا ہے۔ ان کا بنیادی نظریہ ماحولیات اور ترقی دونوں پر مبنی تھا۔ انھوں نے اکثر کہا ہے کہ "ترقی ایسی ہو جس میں بربادی نہ ہو۔"

ایک موقع پر ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ "سائنس داں تخلیقی قوت کے حامل ہوتے ہیں اور فنکاروں کی طرح ان کی ہنرمندی کا بھی احترام کیا جانا چاہیے۔" یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ ملک کے کچھ بڑے سائنسی اداروں کی سربراہ تھیں۔ اس کے علاوہ ملک کے پلاننگ کمیشن میں ایک نامور سائنسداں کو ممبر کی حیثیت سے شامل کیا اور کابینہ کے لیے بھی باقاعدہ طور پر ایک "سائنسی مشاورتی کمیٹی" تشکیل دی۔ چنانچہ سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد ان کی جانب رجوع ہوئی۔ یہ بات بعید از قیاس بھی جا سکتی ہے کہ وہ سائنسدانوں کے کام میں کبھی مخل نہیں ہوئیں اور تمام سائنسی ادارے اپنے دائرہ عمل میں اپنی خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ "ایسا نہیں ہے کہ میں ان تمام اداروں کی سربراہ ہونے کے ناطے ایک سائنسداں ہو گئی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ محکمے اور کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں خاص تقویت کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی لیے شاید یہ محسوس کیا گیا کہ اگر ایسے اداروں اور محکموں کی سربراہ وزیراعظم ہوں گی تو ان کی جانب شاید زیادہ توجہ دی جاسکے گی۔"

ہندستان کی وراثت اور اس کی عظمت پر انھیں پورا اعتماد تھا۔ سائنس اور روحانیت کے باہمی امتزاج کے سلسلے میں ان کے کلمات قابلِ ستائش رہے ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر دونوں کا مقصد "سچ کی تلاش" کرنا ہے۔ ہندستان کے اخلاقی و تمدنی ورثہ پر بھی انھیں فخر تھا۔ جو ہمیں ویدوں، مہاتما بدھ، مہاویر، اشوک، گاندھی جی اور جواہر لال جی کے توسط سے حاصل ہوا۔ بہ حیثیت ایک عالمی لیڈر کے ماحولیات کو انھوں نے عالمی نقطۂ نظر سے دیکھا، جس میں پوری دنیا کے لوگ شامل ہیں۔ وہ ماحولیات کی فلاح سائنسی اور تکنیکی طرز پر چاہتی تھیں۔ جو ہمارے ملک کی سماجی اور معاشی زندگی کے مطابق و موافق ہو۔ ان کے اچانک اور غیر فطری سانحۂ ارتحال سے ہندستانی سائنس نے بلاشبہ اپنا سرپرست اور محسن کھو دیا ہے۔

یہ بات انتہائی شرمناک اور افسوسناک ہے کہ ملک میں اس قسم کا جرم سرزد ہو سکتا ہے۔ — چودھری چرن سنگھ

ہرشیے اگروال

ترجمہ:-
رعایت اللہ خان

عام آدمی تک سائنس کی رسائی

اندرا گاندھی کا عظیم کارنامہ

شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے والد محترم کی طرح ہمیشہ سائنس پر زور دیا۔ وہ ملک کی تجربہ گاہوں کے کام میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں ہمیشہ ہی کہتی تھیں کہ ہمیں اپنی ٹکنالوجی میں خود کفیل ہونا چاہیے۔

میں نے انھیں کئی بار سائنسدانوں، سائنسی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بولتے ہوئے سنا۔ ان کے خیالات بڑے سلجھے ہوئے تھے۔ نہرو جی سائنس کے مشاہدہ میں کھو جاتے تھے جب کہ شریمتی اندرا گاندھی دیش کی مٹی کی بات کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ گاندھی وادی سائنسداں ڈاکٹر آتمارام کی ہمنوائی کر رہی ہوں۔ ملک کے سائنسداں اور انجینئر طویل عرصہ سے ایک ہی ٹکنالوجی پالیسی پر اصرار کرتے چلے آرہے تھے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے جنوری ۱۹۸۳ میں ہندوستان کی ٹکنالوجی پالیسی کا اعلان کیا اور یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان اپنی ترقی کس طرح کرنا چاہتا ہے۔ کیسے خود کفیل بننا چاہتا ہے اور کس طرح غیر ملکی ٹکنالوجی کو اپنانا چاہتا ہے۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کتنے پیچیدہ مسئلہ کو کتنے آسان لفظوں میں واضح کر دیا گیا ہے۔ پچیس سال قبل ہندوستان کی سائنسی پالیسی کی تجویز منظور کی گئی تھی لیکن تب سے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ نئی پالیسی میں بتایا گیا کہ کس طرح سائنسی تحقیق کو روبہ عمل لایا جائے۔ اس میں ٹکنالوجی کو سودیشی جامہ پہنانے کی بات کہی گئی اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ قومی مفادات کو مدنظر رکھ کر غیر ملکی شکنجہ سے نجات حاصل کی جائے۔ سائنسی کاموں میں تاخیر یا افسر شاہی اندرا جی کو قطعی پسند نہ تھی۔ اسی لیے ٹکنیکی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر انھوں نے ایک اعلا سطحی کمیٹی کی تشکیل کرائی۔ مختلف وزارتوں، تنظیموں اور صنعتوں کے لیے رہنما اصول وضع کیے گئے۔ انھوں نے آخر تک یہ کوشش کی کہ یہ پالیسی صرف کاغذ پر ہی چپک کر نہ رہ جائے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے ایک بار قومی تجربہ گاہوں کے ڈائرکٹروں کے ایک جلسہ میں ٹکنالوجی کے استعمال کی بات کرتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تجربہ گاہ ہمارے کام کی نہیں ہے اسے بند کر دینا چاہیے۔

یہ اور بات ہے کہ اب تک کوئی بھی تجربہ گاہ بند نہیں ہوئی بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا تھا کہ تجربہ گاہیں تاج محل بن کر رہ گئی ہیں۔ نہرو جی نے ۱۹۵۰ میں ایندھن تحقیق گاہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔ "کہ عمارتوں سے سائنس کی ترقی نہیں ہوتی"۔

شاید اسی لیے اندرا جی بار بار یہ بات کہتی تھیں کہ تجربہ گاہوں کو ایسی تحقیق کی نوعیت پر زور دیتے ہوئے تین باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی آپس میں شرکت و تعاون ہو، تحقیق کو دہرایا نہ جائے اور تحقیقی تنظیموں اور استعمال کرنے والوں میں تال میل پیدا کیا جائے۔

خواہ ہمارے سائنسدانوں نے اندرا جی کے صلاح و مشورہ پر عمل نہ کیا ہو لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ سائنسداں اپنا نقطہ نظر تبدیل کریں وہ دیہی ٹکنیک پر زیادہ توجہ دیں تاکہ مواضعات کی ترقی ہو سکے۔ وہ گھروں کے کام کاج میں عورتوں کی تھکاوٹ کو کم کرانا چاہتی تھیں اسی لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے محکمہ میں

عورتوں کیلئے مفید ایک سائنسی سیل قائم کیا گیا۔

اسٹاک ہوم میں ۱۹۷۲ میں منعقدہ اولین عالمی موحولیاتی کانفرنس میں شریمتی اندرا گاندھی کی تقریر سن کر عالمی رہنما اور سائنسداں دنگ رہ گئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہماری سب سے بڑی برائی غریبی ہے جس کی وجہ سے سب سے زیادہ آلودگی ہوتی ہے۔

اگر آج ہمارے ملک میں ، حیاتیات ، خلاء اور متبادل توانائی کے شعبے ہیں تو یہ سب ان ہی کی دین ہے آج اسی کو حقیقی سائنس قرار دیا جاسکتا ہے جو غریبوں پسماندہ اور پامال طبقوں کو اوپر اٹھا سکتی ہے۔ اسی سال کے آغاز میں شریمتی اندرا گاندھی نے سائنسی محکموں کی پارلیمانی مشاورتی کمیٹی میں کہا تھا کہ قدرتی توازن برقرار رکھنے کے لیے سماجی جنگل کاری پر زیادہ زور دینا ضروری ہے۔ انھوں نے یوکلپٹس کے درخت اگانے کے سلسلہ میں کھیتی کی زمین کو ہڑپ کر لیے جانے کے خطرے کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کے ۱۶ سال کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہندوستان نے دو بڑے سائنسی میدانوں میں زبردست ترقی کی۔ آج خلاء اور ایٹمی توانائی کا شمار اعلا درجہ کی تکنیکی زمرے میں کیا جاتا ہے۔ اسی سال کے شروع میں مشہور امریکی سائنسی جریدہ "سائنس" نے شریمتی اندرا گاندھی کو ہندوستانی سائنس کی مہارانی قرار دیا تھا۔ انھوں نے ہی ۱۹۷۲ میں علاحدہ خلائی محکمہ اور کمیشن قائم کیا تھا۔

جریدہ میں کہا گیا تھا کہ شریمتی اندرا گاندھی کی سائنسی اور ٹکنالوجی پالیسی کا مقصد خود کفالت کا حصول تھا۔ اسی پالیسی کی کچھ کامیابیوں میں ان باتوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً پوکھرن کا پہلا کامیاب ایٹمی دھماکہ، ملکی مصنوعی سیارے کے نظام کی ترقی، مصنوعی سیاروں کا خلا میں چھوڑا جانا، کلپکم میں مکمل ایٹمی بجلی کارخانہ کا چالو ہونا، انٹارکٹکا قطب جنوبی خطہ میں تین ٹیموں کی کامیاب مہم اور وہاں ایک مستقل سائنسی مرکز کا قیام اور ایک سوویٹ خلائی جہاز میں اولین ہندوستانی خلا باز کا ایک ہفتہ کا سفر۔ ملک نے کچھ دولتمند ملکوں کی خلائی اجارہ داری کو توڑ دیا۔

ہے۔ اسی لیے اپریل ۱۹۷۵ میں ایک مصنوعی سیارہ "آریہ بھٹ" بنا کر ٹکنالوجی میں معلومات حاصل کی۔ یہ پراجکٹ صرف ڈھائی سال میں مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد "بھاسکر" ایک اور دو سیارے چھوڑے گئے اور بعد میں انسیٹ کا سلسلہ شروع ہوا جس کے فوائد آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

شریمتی اندرا گاندھی ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ خلائی سفر کے فوائد عام آدمی کو ملنا چاہئیں۔ دیہی علاقوں میں دور درشن پروگرام پہنچنا چاہئیں، موسم کی صحیح پیشین گوئی ہونی چاہیے اور مصنوعی سیارے کے ذریعہ مواصلات کے زمرے میں بھارت کو آگے آنا چاہیے۔ کثیر مقصدی انسیٹ بی نے یہ سب کرکے دکھا دیا۔ سارے ملک کو ایک قومی دور درشن نشریات کے رشتہ میں منسلک کر دیا گیا۔ ملک کے دور دراز اور پہاڑی علاقوں میں ٹیلیفون کے ذریعہ رابطہ ہوگیا ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ خلائی یا ایٹمی زمرے میں بھارت کا مقصد تعمیری ہے اور ان کا استعمال فوجی کاموں کے لیے نہیں کرے گا۔

سائنس کے میدان میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کے لیے قوم ان کی ممنون رہے گی۔ ●●●

ایک اور انٹرویو: (صفحہ ۱۳۶ کا بقیہ)

آپ سیاست سے ریٹائر ہوجائیں گی یا پانچویں مرتبہ وزیر اعظم بننے کے لیے آپ پھر جدوجہد کریں گی؟

مسز گاندھی: دیکھئے میرا خیال ہے کہ میں اس سوال کا جواب نہ دوں — ہاں یا نہیں میں جو کچھ بھی کہوں یہاں دہلی میں اس پر زور دار بحث چھڑ جائے گی۔ اس لئے اس قصے کو یہیں ختم کیجئے۔

اس کے بعد مسز اندرا گاندھی نے شملے میں ایک بنگلے "دی ری ٹریٹ" کا حوالہ دیا اور کہا کہ مجھے وہ گھر بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ شملے میں وائسرئے ہاؤس کے قریب واقع ہے۔ اور یہاں سے پہاڑوں کا بہت اچھا نظارہ ہوتا ہے اس گھر میں بڑی حد تک انگلش اسٹائل ہے مگر بدقسمتی سے وہاں تک اب ایک سڑک تعمیر کرکے اس کا حسن بگاڑ دیا گیا ہے۔ میں آخری بار ۱۹۸۰ء میں وہاں گئی تھی اس کے بعد موقع نہیں ملا۔ آخری بار جب میں وہاں گئی تو اپنی ایک انگلی توڑ بیٹھی تھی۔ ●●●

انجہانی وزیر اعظم

اندرا گاندھی اور سائنس

ڈاکٹر کے بھگتے وتسلا راؤ
بی/1/1۔۱۱۴۴-۲-۲۰۲
نیو ملاکنٹا حیدرآباد
۵۰۰۰۴۴

ہندستان میں آزادی سے بعد سائنس کے میدان میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے اس کا سہرا پنڈت نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کے سر ہے۔ باپ بیٹی دونوں نے سائنسی مزاج کو پروان چڑھانے اور اسے فروغ دینے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ان کا ایقان تھا کہ معاشی پستی کو دور کرنے کے لیے سائنسی ترقی ضروری ہے

پنڈت نہرو کے خواب کی تعبیر گذشتہ تین برسوں میں متاثر کن طور پر سامنے آ گئی ہے کوئلہ، فولاد، تیل اور پٹرول کے ذخیروں میں اضافہ ہوا ہے۔ ایٹم، خلا، نیوکلیائی قوت اور مواصلاتی سیارے کے شعبوں میں تیز رفتاری سے کام جاری ہے تجارت کو فروغ دینے کے لیے بھی متعدد نظام اور آلات تیار کیے گئے ہیں۔

آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی سائنسی امور میں بے حد دلچسپی لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ شانتی سروپ بھٹناگر ایوارڈ تقسیم کرتے ہوئے انعام یافتہ سائنس دانوں سے کہا تھا کہ ہندستان کے اس مشہور سائنسداں نے ساری زندگی ملک کی ترقی میں صرف کر دی روسی کے داغے جانے پر سائنسدانوں کی کارکردگی کو انھوں نے خراج تحسین بھی پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ملک میں سائنس امن عالم دوستی اور انسانیت کے فروغ اور ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے ہی وقف ہے۔ پوکھرن اور سری ہری کوٹہ کی مثالیں بھی انھوں نے اس سلسلے میں پیش کی تھیں۔

اناج کی پیداوار کے سلسلے میں ملک کے خود کفیل ہو جانے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک سائنسی کلچر پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ سائنسدانوں کو پورا تعاون اور امداد دی جائے گی۔

اندرا جی بنفس نفیس سائنسی اجتماعات میں شریک ہوتی تھیں سائنس دانوں کے مفید مشوروں کو قبول کرتی تھیں اور عالمی امور نیز تحقیقاتی کاموں پر ان سے تبادلہ خیال بھی کرتی تھیں۔ نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسداں پروفیسر عبدالسلام سے بھی انھوں نے کافی دیر تک گفتگو کی تھی۔

ماحول کو آلودگی سے بچانے کے سلسلے میں تحقیقی کام انجام دینے کے لیے ایک شعبۂ ماحولیات کا قیام ان کی خصوصی دلچسپی کا نتیجہ تھا اور انھوں نے الکٹرانکس کے لیے ایک وزیر بھی مقرر کیا تھا۔

سائنس کانگریس کے ۷۱ ویں اجلاس کے موقع پر شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ سائنسدانوں کو اپنے اقدامات و عمل سے امن عالم کی حفاظت کرنا ہے کیونکہ نیوکلیائی اسلحہ سے زمین کو ناقابل قیام بنا دینے کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے سائنسدانوں کو ملکی و قومی منصوبہ بندی میں بھی دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ ممتاز سائنسدانوں جیسے پروفیسر ایم۔جی۔کے مینن پروفیسر ستیش دھون کو اعلا اعزازات سے نوازا اور یہ اعلان کیا کہ سائنسدانوں کی مایوسیوں اور دقتوں کو دور کیا جائے گا۔

شریمتی اندرا گاندھی نے قومی سائنس مجلس کی گولڈن جوبلی تقریب کے موقع پر کہا تھا کہ عوام کی ضروریات پوری کرنے اور قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی سائنسدانوں کو تیار کرنا ہے

پہلے ہندستانی خلا باز راکیش شرما کے روسی خلا بازوں کے ساتھ خلائی سفر کو انھوں نے ایک سنسنی خیز اور قابل فخر واقعہ قرار دیا تھا۔

(باقی ۲۱۱ پر)

ڈاکٹر بی۔ ایس۔ وینکٹے ودون

ترجمہ:۔ عالم حسن

اندرا جی اور ہندستانی سائنس

سائنس کی ترقی کی تاریخ میں ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی ترقی میں صرف سائنس دانوں اور مشین کے ماہرین کا ہی نہیں بلکہ سائنس کے سرپرستوں کا بھی بہت زیادہ تعاون ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں سائنس نے پچھلی تین دہائیوں میں جو ترقی کی اس کا سہرا بڑی حد تک جواہر لال نہرو اور ان کے بعد ان کی بیٹی اندرا گاندھی کے سر ہے جنھوں نے سائنس کی بھرپور سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔

اپنے والد ہی کی طرح شریمتی گاندھی نے بھی جوہری توانائی خلا اور الیکٹرانکی جیسے سائنس کے اہم شعبے اپنی نگرانی میں رکھے۔ سائنس سے ان کی زبردست دلچسپی نے ہندستان کو سائنس کے عالمی نقشہ میں مقام دلایا۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کی مدت کار کے دوران ہندستان نے سائنس کے میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کی جس کے ثبوت کے طور پر ملک کے اندر ترقی دی گئی جوہری بھٹیوں کی تعمیر ہمارے اپنے مصنوعی سیاروں کی تعمیر اور ان کا پراجکشن انسیٹ کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر ٹیلی ویژن نشریات، سمندر میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی قطب جنوبی کی جانب سائنسی مہم اور مختلف میدانوں میں سائنس کے سلسلے میں خود کفالت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

جب لوگ ان سے دریافت کرتے تھے کہ نیوکلیائی ٹکنالوجی اور خلائی سائنس کی ہندستان کے لیے کیا افادیت ہے تب وہ بہت موزوں جواب دیا کرتی تھیں۔ لندن میں لائنس پالیسی فاؤنڈیشن میں اپنی تقریر میں انھوں نے کہا تھا۔

" ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ ہندستان اپنے عوام کی واضح فوری ضرورتوں سے بڑے کھیتی اور صفائی وغیرہ کے موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے جوہری توانائی اور خلائی سائنس جیسے ترقی یافتہ سائنسی شعبوں کی فکر کیوں کر رہا ہے؟ ہمیں طعنہ دیا جاتا ہے کہ ہم عوام کو روٹی تو دے نہیں پاتے مگر اڑنا چاہتے ہیں۔

ہمارا سیدھا سا جواب ہے۔ ان ترقی یافتہ میدانوں میں ریسرچ کا کام ہمارے لیے انتہائی عملی افادیت کا حامل ہے بلکہ بہت اہم ہے۔ یہ جھوٹی خود نمائی نہیں ہے۔ ہمارا خلائی سائنس کا کام تعلیم اور نظام ترسیل کے لیے ضروری ہے اور مانسون کے زیادہ بہتر علم کے لیے بھی جو ہماری معیشت کو کنٹرول کرتا ہے۔ معدنیات کی تلاش کے پروگرام کے لیے زمین کے زیادہ بہتر نقشے آسمان سے بنائے جاسکتے ہیں۔ سمندری سائنس کی مدد سے ہم غذائی اشیاء اور معدنیات کا اپنا ذخیرہ بڑھا سکتے ہیں پیٹرولیم کی تلاش کا ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ ہمارے پاس اپنے ہی ماہرین کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ جینیٹکس کے نئے افق سامنے آرہے ہیں۔

خالص ریسرچ کی حیثیت سے شروع کیے گئے کئی تجربات عام بیماریوں کے علاج اور مفید چیزوں کی ایجاد میں معاون ہوئے ہیں اور لاکھوں کروڑوں لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں۔"

سائنس اور دنیا کے بارے میں اندرا گاندھی نے ان خطوط سے بہت کچھ سیکھا جو ان کے والد نے جیل سے ان کے نام لکھے تھے ایسٹرانومی سے انھیں بہت دلچسپی تھی اور اپنے والد کے ساتھ وہ جہاں

بھی جاتی تھیں، وہاں اگر پلینٹ ریم ہوتو اسے دیکھنے ضرور جاتی تھیں۔

ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی کی سماجی اہمیت پر ان کا جو یقین تھا اسی نے ہندستان کو ترقی پذیر ممالک میں اتنا بلند مقام دلایا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ہندستان کو سائنس کے سبھی شعبوں میں خود کفیل ہونا چاہیئے اور وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ ہندستانی سائنس دانوں کو اس بات کا پورا موقع ملے کہ وہ اپنی ذہانت کے سہارے جتنی بھی ترقی کرسکتے ہیں، کریں۔ ہندستان جیسے ترقی پذیر ممالک کے سائینسدانوں کو ٹکنالوجی سے متعلق اہم ریسرچ اور سائنسی معلومات کے اضافے میں تعاون دینے کے مواقع سے محروم نہیں کیا جانا چاہئے۔

سائنس اور مذہب کا اپنے ہی طرز کا ایک امتزاج اندرا جی میں تھا۔ وہ ملک کے مختلف مندروں اور تیرتھوں کے درشن کرنے جاتی تھیں اور گہری مذہبی عقیدت رکھتی تھیں اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس ملک میں سائنس کی ترقی میں بڑا اہم کردار بھی ادا کیا۔ یہ بات اس نظریہ کو غلط ثابت کرتی ہے کہ سائنس اور مذہب یکجا نہیں ہوسکتے۔

اس بات پر انھیں یقین محکم تھا کہ سائنس اور مذہب (اگر توہم پرستی نہیں) ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں اور سائنس و مذہب کا یکجا ہونا دونوں کے لیے مفید ہے۔ انھوں نے ۸۱ء میں عالمی توانائی کانفرنس میں قدیم ہندستانی فلسفہ کی اہمیت اور جدید سائنس کے لیے اس کی افادیت پر بولتے ہوئے کہا تھا۔

"ذہین افراد نے مادہ اور توانائی جاندار اور بے جان سمت اور وقت کی مربوط تشریحات پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مجموعی طور سے جدید سائنس کا زور تخصیص اور تقسیم پر رہا ہے۔ اب سائنس کا رویہ زیادہ نرم ہوگیا ہے۔ اب وہ ان چیزوں کو یکسر مسترد نہیں کر دیتی جنکی تشریح فوری طور سے نہ کی جاسکے۔ وہ سمجھتو ہے کہ ہر جواب ایک نیا سوال پیدا کرتا ہے۔"

عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی عام آدمی کی زندگی کو بہتر بناتی ہے۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کا فائدہ غریبوں اور دبے کچلے لوگوں تک پہنچانے کا خصوصی سماجی بندوبست اگر نہ کیا جائے تو فطری طور سے سائنس صرف انہی لوگوں کی خدمت انجام دے گی جو پہلے سے ہی خوشحال ہیں۔ اندرا گاندھی اس بات کو بھی سمجھتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے کہا تھا۔

"سائنس صرف خوشحال لوگوں کے لیے نہیں ہے اس کی ضرورت انھیں زیادہ ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہندستان سائنس کو پسماندگی سے نجات حاصل کرنے کے ایک وسیلے کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں جو بھی چیز معاون ہوگی اس سے ہم خود کو محروم نہیں رکھیں گے۔ ہمارا نیوکلیائی پروگرام فوجی مقاصد سے نہیں بلکہ ترقی سے متعلق ضروریات کے تحت چلایا جارہا ہے۔ وہ زراعت طب اور توانائی سے متعلق ہماری ضرورتوں کے لیے وقف ہے۔ ہم ایٹمی اسلحہ میں یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ایٹمی اسلحہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔"

اندرا گاندھی ہمیشہ ایٹمی طاقت کے پرامن استعمال کی حامی رہیں ان کی نظر میں سائنس کے دو پہلو تھے۔ ایک سائنس کی دانشورانہ و علمی شان اور دوسرے عوام الناس کو سائنس اور ٹکنالوجی سے پہنچنے والے فائدے اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں انھوں نے ان دونوں پہلوؤں میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ زبردست کوشش کے باوجود سائنس کا فائدہ سماج کے سب سے نچلے طبقے کو نہیں حاصل ہو پا رہا ہے۔ چنانچہ شریمتی گاندھی کو ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ اپنے یہاں ایسا ماحول تیار کریں جس میں سائنس اور ٹکنالوجی کے علمی اور مادی فائدے غریب سے غریب ہندستانی تک پہنچیں۔

راجیو موہن شاداب میرٹھی

خوشبو تری یادوں کی مہکتی ہی رہے گی

ہستی تری ہر حال میں انمول رہی ہے
تصویر نگاہوں میں تری ڈول رہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ تو بول رہی ہے
آواز تری کانوں میں رس گھول رہی ہے

دھرتی تری منت کش احسان رہے گی
جب تک بھی یہ دنیا ہے تری آن رہے گی

ہر حصے میں دنیا کے ترا نام ہے روشن
ہر صبح ہے روشن تری ہر شام ہے روشن
بیشک تو نہیں ہے ترا ہر کام ہے روشن
اے امن کی دیوی ترا پیغام ہے روشن

دنیا کو بھلانا ترا آسان نہ ہوگا
گلشن ترا سینچا ہوا ویران نہ ہوگا

تھا ناز تری ہستی پہ خود گنگ و جمن کو
شاداب کیا اہل سخن اہل چمن کو
کیوں روتا ہوا چھوڑ گئی اہل وطن کو
شاید کہ ضرورت تھی تری نیل گگن کو

خوشبو تری یادوں کی مہکتی ہی رہے گی
سورج کی طرح تو بھی چمکتی ہی رہے گی

کمال سیتاپوری ۱۳۲/۲۳۸- ایم بلاک. قدوائی نگر کانپور

آہ۔ اندراجی

دفورِ جوشش وحشت دکھا دیا کس نے
گھر اپنا اپنے ہی ہاتھوں جلا دیا کس نے

ہوائے جہل کا طوفاں اٹھا دیا کس نے
چراغ فہم و خرد کا بجھا دیا کس نے

جو گل تھا رونقِ فصلِ بہارِ باغِ وطن
اسی کو خاکِ چمن میں ملا دیا کس نے

پیامِ صبحِ طرب کی وہ جگمگاتی کرن
سیاہ غم کی گھٹا میں چھپا دیا کس نے

چراغ جس سے کہ بزمِ نشاط روشن تھی
طلوعِ صبح سے پہلے بجھا دیا کس نے

سفینہ قوم کا پہونچا نہ تھا کنارے تک
کہ بادبانِ اماں ہی جلا دیا کس نے

رفاہِ عام کی تصویر پیکرِ الفت
وہ نقشِ صلح پسندی مٹا دیا کس نے

وہ پاک روح وہ معصوم دل تھا سینے میں
کہ جس کا نور جھلکتا تھا ہر قرینے میں

فلاحِ قوم تھی ہر حال جس کی پیشِ نظر
رہا خیالِ وطن جس کو مرنے جینے میں

ریا و مکر سے تردامنی کبھی نہ ہوئی
نہ داغ ایک بھی تھا اسکے آبگینے میں

ہر ایک مذہب و ملت کی وہ محافظ تھی
ہر اک کی پاکِ محبت تھی اسکے سینے میں

نثار قوم پہ ہو کر دکھا دیا اس نے
کہ رازِ ہستیٔ انساں نہاں ہے جینے میں

جہاں کا دامنِ صبر و قرار چاک کیا
نظامِ عالمِ تسکیں جلا کے خاک کیا

اقبال احمد مسعودی
معرفت۔ اشتراک۔ قاضی پور خورد، گورکھپور

قطعہ

رنگ لائی ہے اخوت دیکھئے
مادرِ مشفق کی شفقت دیکھئے
جان بھی دیدی ہمارے واسطے
اندرا گاندھی کی عظمت دیکھئے

ڈاکٹر کیف رضوی
ڈی اے وی ڈگری کالج لکھنؤ

شیشۂ گل کا قتل ہے

وقت کی درس گاہ تھی   شرح یقیں نگاہ تھی
منزلِ نو کی راہ تھی   عدل کی بھی گواہ تھی
جہد کی آنکھ سو گئی
تلخیٔ غم سمو گئی

محورِ راحتِ امیں   ذہن سیاست یقیں
صحن کی حسرت حسیں   حلقۂ ندرتِ نگیں
سونی ہوئی ہیں جلوتیں
سجنے لگی ہیں خلوتیں

زیست کا اقتباس تھی   امن کا اک لباس تھی
جہدِ عمل کی پیاس تھی   خوب وطن شناس تھی
آرسی رخ اتر گئے
عکس بھی سب بکھر گئے

موتیوں کا حسیں صدف   عزم میں قسمتِ سلف
راہ سے گذری گل بکف   سب کی خوشی میں صف بہ صف
ایک کرن میں تھی امنگ
ڈوب گئے ہیں ہفت رنگ

ٹوٹ گیا ہے جب سبو   خاک میں ہوگا کیا رفو
رک گئی نظرتِ نمو   ساعتیں ہیں لہو لہو
جشن نہیں گل کا قتل ہے
شیشۂ گل کا قتل ہے

اختر شاہجہاں پوری
رنگین چوپال شمسی خاں کابل
شاہجہاں پور

خون کی ہر بوند سے ہوگی وطن کی روشنی

نازشِ گنگ وجمن، فخرِ بہارِ گلستاں
جدوجہدِ زندگی میں کامیاب و کامراں
اب ترے نقشِ قدم ہیں اور اپنا کارواں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

امنِ عالم کا اٹھایا تو نے پرچم مرحبا
جنگ کے زخموں پہ رکھا تو نے مرہم مرحبا
تیری ہستی درحقیقت اک محبت کا جہاں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

سامراجی طاقتوں کے بڑھ رہے ہیں حوصلے
ہو نہ جائے قومی یکجہتی کا دامن تار تار
یک بیک آخر فضا پر چھا گیا کیسا دھواں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

یاد ہے یہ بات سب کو آخری تقریر کی
"خون کی ہر بوند سے ہوگی وطن کی روشنی"
تیری عظمت کو سلام اخترِ جادو بیاں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

عبدالمتین نیاز
موتیا پارک
بھوپال

کویتا کی موت

بہت دن سے اس فکر میں تھا پریشاں
کہ تیرے لیے اک کویتا، لکھوں گا
کویتا، کہ جس میں ترے روپ جھلکیں
تری آرزوؤں کے سب رنگ چھلکیں
بنے تیرے خوابوں کی تصویر جس میں
تری حکمتوں کی ہو تنویر جس میں
کیا ہے جو بھارت کی خاطر وہ سب ہو
سہا ہے جو خدمت کی خاطر وہ سب ہو
ترے کارناموں کے قصّے سنائے
کویتا، تری شخصیت میں سمائے
میں لکھوں کہ تو امن کی روشنی ہے
زمانے میں انسانیت کی ہنسی ہے
ترا جو اثر تینوں دنیاؤں پر ہے
تو دانشوروں کی تجھی پر نظر ہے
صد افسوس لیکن میں کچھ لکھ نہ پایا
لہو تیرا کچھ وحشیوں نے بہایا
بنا زخم ہر لفظ، روئی کویتا
بھر اشکوں میں، میں نے ڈبوئی کویتا
کہ تیرا لہو سب کی آنکھوں سے ٹپکا!
الم کا ہر اک دل میں شعلہ سا لپکا
گئی تو بھی باپو کے نقشِ قدم پر
کہیں شعر کیا اندرا تیرے غم پر
کویتا بھی چپ لفظ بھی بے صدا ہے
سخن غم کے آزار میں مبتلا ہے

محسن باشی بلاروی
روشن منزل مسجد
بلاری، مراد آباد

اندرا گاندھی ہماری تھی

تو وہ خاتون تھی ہمت میں جو مردوں پہ بھاری تھی
وطن کی سالمیت تجھ کو جان و دل سے پیاری تھی
تری فطرت میں شامل کس بلا کی انکساری تھی
زمانہ کہہ رہا ہے اندرا گاندھی ہماری تھی
تجھے اہلِ وطن اس دیش کی ماتا سمجھتے تھے
جو اہلِ فہم ہیں وہ گیان کی داتا سمجھتے تھے
تو شمعِ انجمن تھی انجمن کو ناز تھا تجھ پر
تو فن کی قدرداں تھی اہلِ فن کو ناز تھا تجھ پر
جوان و پیر و طفل و مرد و زن کو ناز تھا تجھ پر
غرض یہ ہے کہ اربابِ وطن کو ناز تھا تجھ پر
ادائے مادرِ گیتی کی شیدائی سی لگتی تھی
محاذِ جنگ پر تو لکشمی بائی سی لگتی تھی
عطا کی روشنی تو نے شبِ غم کی سیاہی کو
دیا ذوقِ عمل دہقان و مزدور و سپاہی کو
ملا تجھ سے نشانِ منزلِ مقصود راہی کو
ہمیشہ یاد ہم رکھیں گے تیری سربراہی کو
ہواؤں کا ہے رخ اب کس طرف پہچان لیتی تھی
قدم اٹھنے سے پہلے سمتِ منزل جان لیتی تھی
ترے دورِ قیادت میں نہ آئے زلزلے کیا کیا
تری محفل میں غیروں نے نہ چھیڑے مسئلے کیا کیا
رواداری سے تو نے کر لئے طے مرحلے کیا کیا
ودیعت تجھ کو قدرت نے کیے تھے حوصلے کیا کیا
رہِ دشوار ترے بے نیازانہ گذرتی تھی
تو بڑھ کر وقت کے ماتھے پہ مہریں ثبت کرتی تھی
سرورِ بادۂ غیرت سے دل سرشار تھا تیرا
وطن کو سرخرو جس نے کیا، ایثار تھا تیرا
مصفا ہر طرح آئینۂ کردار تھا تیرا
تری مقبولیت کا راز سب سے پیار تھا تیرا
خزاں کا کچھ اثر ہوگا نہ اس گلشن کے پھولوں پر
رہیں گے باغباں قائم اگر تیرے اصولوں پر

رشید قریشی
۳-۲ محمد علی لین - امین آباد
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

آرزوئیں زندہ ہیں

پھر کوئی بھول ہو گئی ہم سے
پھر ہمیں محوِ یاس رہنا ہے
پھر یہ محسوس ہو رہا ہے ہمیں
مدتوں پھر اداس رہنا ہے

جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے
رنج ہے، بے بسی ہے، الجھن ہے
رنج ایسا کہ بے قرار ہیں سب
الجھن ایسی کہ جس کا حل ہی نہیں

فاصلوں کے حصار میں گم ہیں
راستوں کے غبار میں گم ہیں
ذہن اور دل کی کشمکش کی قسم
ہم عجب انتشار میں گم ہیں
ہر طرف درد کی سیاہی ہے
اس قدر غم کی بے پناہی ہے
دفعتاً کون کھو گیا یارو
ملک بے روح ہو گیا یارو

●●●

کمال خاشی
کرنیل گنج گھاٹم پور

لہو لہو ہے چمن...

افق پہ چاند کی ہر اک کرن گلابی ہے
اجالے خون کے ہیں انجمن گلابی ہے
شہیدِ ناز ترے مرتبے کا کیا کہنا
تمام جسم معطر کفن گلابی ہے
اڑی ہے گردِ ملال آج سب کے چہرے پر
فضا میں اشکوں کی سارا چمن گلابی ہے
گلاب نہرو کو پیارے تمام عمر رہے
اب اندرا کی چتا پر گگن گلابی ہے
شرارِ خوں سے ہے رنگیں نوا بہاروں کی
لباسِ درد میں روحِ سخن گلابی ہے
دیارِ مرگ میں زندہ رہے گی تا بہ ابد
قبا ہے پھولوں کی جانِ چمن گلابی ہے
بہارِ یادِ شہیدِ وطن شباب پر ہے
لہو لہو ہے چمن اور بن گلابی ہے
اجل کے سائے میں لمحوں نے دی ہو دادِ حیات
لبوں پہ قصۂ دار و رسن گلابی ہے
دکھوں کی رات میں جس نے دیے تھے تحفۂ عزم
وہ آج شمعِ شعلہ بدن گلابی ہے
لویں وفا کے چراغوں کی ہیں شفق افشاں
اندھیری شب میں لبِ سیم تن گلابی ہے
تمام زخموں کی رکھ لی ہے آبرو اس نے
لہو میں ڈوب کے وہ پیرہن گلابی ہے
بجیں دلوں کے شوالے نہ کیوں غموں سے کمال
بقولِ شیخ رخِ برہمن گلابی ہے

منظور الامین
جی-۱۱۱، جامعہ انکلیو
نور نگر روڈ،
جامعہ ملیہ اسلامیہ،
نئی دہلی۔

ایک مہِ تابناک

۱۹ مارچ ۱۹۸۲ء ـــ سہ پہر کا وقت ہے میں لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر اپنی ٹیلی ویژن ٹیم کے ساتھ کھڑا ہوں ایرپورٹ کا یہ حصہ ہر طرف سے کھلا ہوا ہے۔ درجۂ حرارت منفی ۳ ڈگری ہے ہم سے کچھ دوری پر ایک VVIP بھی چشم براہ ہیں، ان کا نام ہے مسز مارگریٹ تھیچر جو انگلستان کی وزیر اعظم ہیں، ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ہندستان سے FESTIVAL OF INDIA کے افتتاح کے لیے لندن پہنچنے والی ہیں، اور وزیر اعظم انگلستان ان کے استقبال کے لیے ایرپورٹ پر بنفس نفیس موجود ہیں۔

میرا ذہن ہندستان کے ماضی کی تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا ہے برطانیہ کے ونسٹن چرچل کے الفاظ مجھے یاد آرہے ہیں جو انھوں نے اس وقت کہے تھے جب ان سے یہ کہا گیا تھا کہ اب جب کہ وہ برطانیہ کے وزیر اعظم ہیں کیوں نہ وہ ہندستان کو آزاد کر دیں، جب کہ اس ملک میں جدوجہد آزادی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ چرچل نے کہا تھا۔

" میں شاہ انگلستان کا وزیر اعظم اس لیے نہیں بنا ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے زوال کے اجلاس کی صدارت کروں"

میں سوچ رہا ہوں!

ایک طرف تو ونسٹن چرچل کا یہ اہانت آمیز رویہ اور دوسری طرف اسی انگلستان ہی کی ایک دوسری وزیر اعظم کا یہ GESTURE کہ پورے آدھ گھنٹے نقطۂ انجماد سے بھی نیچے کے درجۂ حرارت میں وہ بحر شمالی کی یخ بستہ ہواؤں کا مقابلہ کرتی ہوئی لندن کی طیران گاہ پر کھڑی ہیں اس انتظار میں، کہ ہندستان کی وزیر اعظم کا استقبال کریں۔ یہ اعزاز ہمیں کیسے حاصل ہوا؟ اس ایک ہستی کی بدولت جس کا نام تھا مسز اندرا گاندھی۔ یہ اسی ایک شخصیت کا کرشمہ تھا کہ دنیا کے سبھی ملکوں کے سربراہ ان کے آگے سر عقیدت خم کرتے رہے۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت مانتا ہوں کہ مرحومہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو نہ صرف کئی بار میں نے مختلف جگہوں اور موقعوں پر دیکھا ان کی تقریریں سنیں بلکہ ان سے دو تین بار ذاتی طور پر ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ایسا ہی ایک موقعہ یاد آتا ہے

یہ جولائی ۱۹۷۵ء کا واقعہ ہے۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی دنیا کے سب سے بڑے کمیونیکیشن ایکسپریمنٹ یعنی SITE پروگرام کی افتتاحی تقریر ریکارڈ کرنے کے لیے سٹیلائیٹ ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیو واقع وگیان بھون تشریف لائیں، میں اس زمانے میں ڈائرکٹر ٹیلی ویژن (سٹیلائیٹ) کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا، ہم لوگ صبح سے ہی ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے اسٹوڈیو اور ماسٹر کنٹرول روم میں ہر طرف ACTIVITY تھی انھیں صبح ۱۰½ بجے آنا تھا۔ ان VVIP سے متعلق سکیورٹی سٹاف ایک دن پہلے ہمارے اسٹوڈیو میں پوری طرح چیکنگ کر گیا تھا۔ اگلی صبح اس سٹاف کے لوگ پھر آئے انھوں نے اسٹوڈیو اور اطراف و اکناف کی ایک بار پھر مکمل چیکنگ کی۔ اسٹوڈیو کرسیاں میز کیمرے، لائٹس میک اپ کا سامان غرض ہر شے کی مکمل چیکنگ کی۔ اس دن مسز گاندھی بے حد معروف تھیں اور شام سے پہلے نہ آسکیں دن بھر کی مصروفیات کے

بعد جب وہ آئیں تو تھکن کی شکن تک ان کے ماتھے پر نہ تھی کار سے اتر کر تیز تیز قدموں سے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں روشنیاں پہلے سے تیار تھیں ہم نے میک اپ کی درخواست کی قدرے مسکرائیں۔ میک اپ آرٹسٹ نے فوراً ہی ہلکے سے BASE کا استعمال کیا، پیکنگ کی ہم نے درخواست کی کہ تقریر کا تھوڑا سا حصہ وہ پڑھ دیں تا کہ آواز کا لیول دیکھ لیا جائے، کیمرہ مینوں نے کیمرے سنبھالے فلور منیجر نے سگنل دیا انھوں نے دو تین فقرے پڑھے پروڈیوسر نے O K کر دیا پروڈکشن اسسٹنٹ نے کاؤنٹ ڈاؤن کی شروع ناٹر ٹ آن ہوئی اور ریکارڈنگ شروع ہو گئی، تقریر کی زبان مشکل تھی اور وہ زبان نہیں تھی جس کی وہ عادی تھیں اور جو وہ بے تکان لاکھوں کے مجمع میں بولتی رہتی تھیں وہ تقریر پڑھتی رہیں اکثر مقامات پر رکتی رہیں اور الجھی رہیں شاید دماغ پر اگلے APPOINTMENT کا بوجھ بھی تھا جوں توں کر کے انھوں نے تقریر ختم کی اٹھ کھڑی ہوئیں اور تیزی سے چل پڑیں اور باہر نکل آئیں لیکن میرے دماغ پر بوجھ سا ہو گیا BECAUSE I THOUGHT SHE WAS NOT AT HER BEST ON THIS OCCASION

لہٰذا میں نے اپنے چیف سے فوراً ہی کہا کہ وزیر اعظم سے درخواست کرنی چاہیے کہ جانے سے پہلے خواہ پانچ منٹ کے لیے ہی سہی وہ بغیر اسکرپٹ کے ایک تقریر برجستہ ریکارڈ کر دیں کیونکہ پروگرام گاؤں والوں کے لیے ہے لہٰذا اچھا ہو اگر وزیر اعظم اس پروگرام میں گاؤں والوں سے براہ راست تخاطب کریں انھوں نے اسکرپٹ سے جو کچھ پڑھا ہے وہ مجھے مصنوعی اور غیر فطری لگتا ہے اور وہ اسکرین پر بھی اپنے آپ سے الجھتی دکھائی دے رہی ہیں۔ ہمارے چیف میری رائے سے متفق تھے۔ وزیر اعظم سے درخواست کی گئی قدرے تامل کے بعد وہ راضی ہو گئیں اسٹوڈیو واپس آ گئیں اور بجائے ۵ منٹ کے دس منٹ تک برجستہ بولتی رہیں، تقریر ختم ہوئی اب ان کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا، فوراً ہی کہا یہ دوسری تقریر ٹھیک ہے پہلا ریکارڈنگ استعمال نہ کیجئے تناؤ کی فضا دور ہوئی، اور ہم سب نے اطمینان کی سانس لی یہ تھا ایک نامور اور مقتدر ہستی کے اعلیٰ برتاؤ کا ایک نمونہ اور

وہ REGARD جو وہ PROFESSIONALS کو دیا کرتی تھیں اس موقع پر وہ ہم پر ناراض بھی ہو سکتی تھیں ہمیں ڈانٹ بھی سکتی تھیں وہ اس معاملے کو PRESTIGE-POINT بھی بنا سکتی تھیں لیکن ان کی انصاف پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا سچ تو یہ ہے کہ ان کے فیصلے (ARBITRARY) نہیں ہوتے تھے وہ بھی DEMOCRAT تھیں جمہوریت میں ان کا اٹل ایقان تھا دوسرے لفظوں میں وہ سلطانیٔ جمہور کی قائل تھیں۔

اب جب اس کی مقدس خاک کے ذرّے ہمالیہ کی بلندیوں پر بکھر چکے ہیں تو اندرا جی کی ایک تقریر کے فقرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔

"میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اس دھرتی سے قریب پایا ہے جب میں چھوٹی بچی تھی لوگ اکثر چند کی خوب صورتی کی بات کرتے تھے تب میں اپنے آپ سے ایک ہی بات کہتی تھی ہماری اس زمین میں کیا برائی ہے یہ بھی تو بہت خوب صورت ہے"

اور یہ شک نہیں کہ اب ان کی خاک اور ہمالیہ کے تیز رو چشموں سے ہوتی ہوئی اسی خوب صورت زمین تک پہنچ گئی ہوگی وہ زمین جو انھیں بے حد عزیز تھی وہ زمین جس سے اور جس کے رہنے والوں سے وہ بے حد پیار کرتی تھیں۔

پنڈتوں اور اسٹیشن گن کی چند گولیوں نے اس ہستی کے جسمانی وجود کو تو ہم سے جدا کر دیا جس کا نام اندرا گاندھی تھا لیکن یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ اندرا گاندھی تو دراصل ایک عظیم تحریک کا نام ہے وہ تحریک جسے تحریک انسانیت کہہ سکتے ہیں، یہ تو ایک عزم کا نام ہے جسے اتحاد کا بھی کہہ سکتے ہیں اور تعلیمی جنون بھی۔ یہ تو ایک ولولے کا نام ہے جو خلاؤں کی پُراسرار وسعتوں میں لے جاتا ہے اور گنبد افلاک کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ تو ایک تہذیب کا ایک تمدن کا نام ہے جو ہزاروں سال سے ہمارے ملک کو سربلندیاں عطا کرتا آیا ہے اور آنے والی صدیوں تک سرفرازیاں عطا کرتا رہے گا اس موقع پر ایک شعر یاد آ رہا ہے جو مجھے موزوں لگتا ہے ذرا سے تصرف کے ساتھ گویا وہ خود کہہ رہی ہوں

سچ تو یہ ہے کہ یہ بازو ہیں کروڑوں میرے
اور آفاق کی حد تک میرے تن کی حد ہے

✱

تجسّس اعجازی
مظفر عالم پبلک لائبریری
نمبر ۱۲ ناداں محل روڈ لکھنؤ

گلاب کی فتح

سفر چاہے مختصر ہو یا طویل، جب وہ زندگی کے کسی اہم واقعہ سے منسلک ہو جاتا ہے تو اپنی لافانی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ کہنے کے لیے تو زندگی خود ایک مسلسل سفر ہے کامرانیوں سے بھرپور اور ناکامیوں سے لبریز، جن کی یادیں دلنشیں اور باتیں اکثر دل افروز ہوا کرتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت بیشتر نجی اثرات تک محدود ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کوئی ایسا واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے جس کی حیثیت نجی نہیں رہتی۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے درمیانی عرصہ میں کچھ ایسے ہی واقعات سے ہمیں دوچار ہونا پڑا۔ جو انیس برس گزر جانے کے بعد آج بھی حافظے میں بالکل اسی طرح محفوظ ہیں جیسے مشاہدے میں تھے۔

ہم اردو بازار دہلی کے مغربی کنارے پر واقع ہوٹل تاج کے ایک کمرے میں مقیم تھے، سارے دن کی مصروفیات نے تکان کا احساس پیدا کر دیا تھا اس لیے کچھ دیر آرام کر لینے کی خواہش فطری ہی تھی کہ عین اسی وقت کمرے میں چند صحافی دوست جن میں احمد فراز، سلامت علی مہدی بھی شامل تھے، داخل ہوئے اور کچھ ہی لمحوں میں حالات حاضرہ پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قائم جنگی محاذوں نے ان دونوں ملکوں میں آباد انسانوں کے ذہنی سکون اور اقتصادی نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا اور ہر شخص ایک پائیدار معاہدۂ امن کا دل سے متمنی تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں روس کی کوششوں سے پر امن مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تاشقند میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں ہندوستان کی نمائندگی خود وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستان کی نمائندگی وہاں کے صدر حکومت کر رہے تھے۔ اس کانفرنس کی کامیابی سے نہ صرف ہند و پاک بلکہ ایشیا کے امن کا سوال وابستہ تھا۔ دوسری طرف روس کی سیاسی عزت اور وقار کی بات بھی درپیش تھی۔ لیکن دلی کے سیاسی حلقوں میں جو تازہ ترین اطلاعات گشت کر رہی تھیں ان کے مطابق کانفرنس کی کامیابی کے امکانات کم تھے۔ لال بہادر شاستری اپنے نرم اور مفاہمت پسند مزاج کے باوجود کسی ایسی شرط کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو ملک کے وقار کو مجروح کرنے والی ہو۔ چنانچہ دوسرے دن کے سبھی اخباروں میں (دو ایک اخباروں کو چھوڑ کر) کانفرنس کی ناکامی کی اطلاع شائع ہوئی تھی۔ جبکہ اسی رات روسی وزیر اعظم کی کوششوں کی بدولت رات گئے ہند و پاک معاہدۂ امن پر دونوں ملکوں کے نمائندوں کے دستخط بھی ہو گئے تھے۔ اخبارات کی خبروں اور اصل صورتِ حال میں تضاد کا سبب غالباً یہ تھا کہ معاہدۂ امن اور اس کے تفصیلات کی تصدیق حکومت کے دفتر خارجہ سے اس وقت کی گئی جبکہ تازہ اخبارات کی آخری کاپیاں بھی طباعت کے لیے جا چکی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر سوئے تھے پھر بھی سویرے آنکھ کھل گئی جیسے کسی نے جگا دیا ہو، ہوٹل کا ریڈیو بج رہا تھا فضا میں ماتمی دھن

گونج رہی تھی۔ جب یہ گونج ختم ہوئی تو اناؤنسر کی آواز سُنائی
دی کہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا حرکتِ قلب رک جانے
سے تاشقند میں انتقال ہوگیا۔

یہ خبر نیم بیدار ذہن پر بجلی بن کر گری۔ غنودگی اچانک
ختم ہوگئی۔ باہر کا منظر دیکھنے کے لیے کمرے سے نکل کر برآمدے
میں آ کھڑے ہوئے۔ تاج کی بالائی منزل سے جامع مسجد پر
نظر ڈالی تو اس کی سیڑھیوں کو بالکل سنسان دیکھا۔ سامنے
سڑک پر زرد ٹوپیاں پہنے ہاتھ میں ڈنڈے لیے والنیٹرس
کی ایک بڑی تعداد گشت کرتی نظر آئی۔ سڑک کے کناروں
پر دو دو چار چار آدمیوں کی ٹولیاں کھڑی ہوئی تازہ المیے
پر گفتگو کر رہی تھیں۔

سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے جانشین
کی حیثیت سے کانگریس پارٹی اور ہندوستانی عوام دونوں
لال بہادر شاستری کی ذات اور کارکردگی سے بالکل مطمئن
تھے۔ پنڈت جی کے بعد لال بہادر شاستری نے وزارتِ عظمیٰ
کے منصب کی ذمہ داریوں کو جس انداز اور خوش اسلوبی سے
پورا کیا تھا اس نے ہماری جمہوریت کی جڑوں کو پہلے کی نسبت
کچھ اور مضبوط اور گہرا بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو ان کے اچانک
انتقال کی خبر عام ہونے کے باوجود دتی جیسے شہر میں ہیجان، سراسیمگی
اور کشیدگی کی لہروں کا دور دور نام و نشان نہ تھا۔ اداس چہرے
اپنے محبوب رہنما کی نا وقت وفات پر انتہائی رنج و غم میں ڈوبے
دکھائی دے رہے تھے۔

جب کچھ دیر بعد ہم نے پرانی دتی کے محلوں کا جائزہ
لیا تو ہمیں ہر طرف المیہ اثرات کی جھلکیاں نظر آئیں۔ دکانیں،
نجی ادارے، سرکاری دفاتر، اسکول اور کالج بھی بند تھے۔
بازاروں، شاہراہوں، چوراہوں اور گلی کے نکڑوں پر عوام
کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر دل، ہر ذہن، ہر نظر اور ہر زبان
پر صرف ایک سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اب ہماری قیادت
کون کرے گا؟ وزارتِ عظمیٰ کا منصب کون سنبھالے گا؟

عوام ماضی قریب میں ایک سخت دفاعی آزمائش سے
گزر چکے تھے جس کا خاتمہ آنجہانی وزیر اعظم کے تدبر کی بدولت
معاہدۂ امن پر ہوا تھا۔ لیکن موجودہ آزمائش عوام کے لیے
کچھ اس سے بھی زیادہ سخت تھی۔ وہ سامراجی طاقتیں جن کی نگاہوں
میں ہندوستان کی ترقیاں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھیں، وہ ان ترقیوں
کو روکنے اور ہندوستان کے سیکولر مزاج کو بدلنے اور ناوابستگی اور
پرامن بقائے باہم جیسے زریں اصولوں پر وار کرنے کا موقع اپنے
ہاتھوں سے کیسے کھو سکتی تھیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے
اندیشے محبِ وطن ہندوستانیوں کے دلوں میں جنم لے رہے تھے۔
لیکن دقت یہ تھی کہ وطن پرستوں کو براہِ راست وزیر اعظم کے
انتخاب کا حق حاصل نہ تھا۔ یہ کام جمہوری اصولوں کے مطابق
عوام کی منتخب کردہ اور برسرِ اقتدار جماعت کانگریس کو انجام
دینا تھا۔ جس کے صدر شری کامراج تھے۔

وزارتِ عظمیٰ پر اپنا حق جتانے والے کانگریسی لیڈروں
کے درمیان سخت رسہ کشی کا امکان تھا۔ جس کے مضر اثرات مستقبل
قریب میں پارٹی کی قوتِ عمل کو مجروح کر سکتے تھے۔ اس منصب
کے طلب گاروں میں گلزاری لال نندا۔ چوہان۔ ایس کے پاٹل
اور مرارجی ڈیسائی شامل تھے۔

خود پنڈت جواہر لال نہرو کے آخری ایامِ حیات میں
ان کی جانشینی کا سوال زور و شور سے اٹھ چکا تھا۔ اس وقت
لال بہادر شاستری اور مرارجی ڈیسائی کے نام عام کانگریسیوں
کی زبان پر تھے۔ جب بعض اخباری نامہ نگاروں نے اس
سوال کا جواب پنڈت جی سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا۔
انتظار کیجیے وقت خود بتا دے گا کہ جانشین کون ہے؟
متذکرہ زمانے میں شاستری جی اور مرارجی ڈیسائی

دونوں کانگریس کے اسٹیج پر یکساں اہمیت کے حامل کردار
تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شاستری جی کی تصویر زیادہ
واضح اور روشن ہوتی چلی گئی لیکن جب وہی تصویر موت
کی دبیز تاریکیوں میں پردہ پوش ہوئی تو دنیا ایک بار پھر
پنڈت نہرو کے نئے جانشین کو تلاش کرنے نکلی۔

اخباروں کی قیاس آرائیوں کی روشنی میں وزارتِ
عظمیٰ کے طلب گاروں میں مسز اندرا گاندھی کا نام شامل نہیں
تھا۔ وہ منظرِ عام پر ہونے کے باوجود پس منظر میں تھیں۔

وقت بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سوگواری
اور تذبذب کے ماحول میں سارے ہندستان کی نظریں دلّی پر
لگی ہوئی تھیں۔

پنڈت جی کے بعد لال بہادر شاستری کی وزارتِ عظمیٰ
سے وابستگی اس بات کو نمایاں طور پر ثابت کر چکی تھی کہ وزیراعظم
کا عہدہ ہندستان میں خاندانی میراث نہیں بلکہ جمہوری قدروں
کے مطابق اس جوہرِ قابل کا حق ہے جو پنڈت نہرو کے آدرشوں
پر چل کر ملک کو جدید سائنسی ترقیوں سے مالامال کر سکے۔ ملک
کے ستر کروڑ عوام کو تعلیم و روزگار کے یکساں مواقع فراہم کر سکے۔
جو سماجی نابرابری، چھوت چھات، علاقائی تعصب، مذہبی
منافرت، لسانی فسادات اور سیاسی مناقشات کے حامیوں
پر بھرپور ضرب لگا سکے۔

کافی دیر تک پرانی دلّی کے چکر لگانے کے بعد ہم
جامع مسجد کے سامنے والے چائے کے ہوٹل میں بیٹھ گئے۔
ہوٹل کی بھٹیاں خاموش تھیں۔ کاؤنٹر ویران تھا سرو
کرنے والے لڑکے موجود نہیں تھے۔ اس کے باوجود ہوٹل کی تمام
نشستیں آباد تھیں۔ دور کہیں ریڈیو سے ماتمی دھن نشر
ہو رہی تھیں۔

اس گھٹے گھٹے اور یاس انگیز ماحول میں آس کی پہلی کرن
اس وقت پھیلی جب دلّی کے سیاسی حلقوں میں وزیراعظم کے
عہدے کے لیے اندرا گاندھی کا نام ابھرا، یہ نام انیس مہینے
پہلے بھی اس عہدے کے لیے سامنے آسکتا تھا اور جماعت و عوام
کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا تھا لیکن خود مسز اندرا گاندھی نے اس
بات کو ناپسند کیا تھا، وہ اپنے ذاتی ایثار اور اجداد کی قربانیوں
کے صلے میں اقتدار کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنے کے حق میں نہ تھیں۔
اب جب کہ جمہوریت کے درخت کے سائے گھنے اور وسیع ہو چکے
تھے اور غلط فہمیوں کے امکانات معدوم ہو چکے تھے وزارتِ عظمیٰ
کی پیش کش کو قبول کر لینا اقتضائے وقت کے مطابق تھا۔ شری
کامراج کی تجویز کا عوامی سطح پر خیر مقدم کیا گیا لیکن خود کانگریس
کے اندر اس تجویز کی مخالفت بھی کی گئی۔

لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ۵۲۵ ممبروں کو ووٹ کے
ذریعے اپنی پارٹی کا لیڈر منتخب کرنا تھا۔ مرارجی اپنے قدیم ترین
ذاتی تعلقات کی بنا پر فرداً فرداً خصوصی رابطہ قائم کر رہے تھے۔
انھیں اپنی جیت کا پورا یقین تھا۔ لیکن مسز اندرا گاندھی شکست و
فتح سے بے نیاز نہایت پرسکون انداز میں وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔

آخر وہ وقت آگیا جب مسز اندرا گاندھی پارلیمنٹ ہال
کی تالیوں کی گونج میں استقبال کا جواب تبسم اور نمسکار سے
دیتی ہوئی سیدھی مرارجی کے پاس گئیں، اور مصافحہ کیا۔ ان کی
اس ادا میں پنڈت جواہر لال نہرو کی تربیت کا وہ خاص پہلو
نمایاں تھا جسے وہ پارٹی کے اندر اپنے حریفوں کے مقابلے میں
پیش کرتے آئے تھے۔

آخر خفیہ ووٹنگ شروع ہوئی۔ جب یہ مرحلہ ختم ہوا
تو ووٹ شماری کی نوبت آئی اور تقریباً ۴ بجے نتیجے کا باضابطہ
اعلان ہو گیا۔ وہ ۱۸۶ ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو کر پارٹی
لیڈر منتخب ہو گئیں۔

اندرا گاندھی کے انتخاب کی خبر نے پورے ہندستان

(باقی ۱۹۲ پر)

حیات وارثی
جنرل سکریٹری ... انڈیا
ہندی ... دو سنگھ لکھنؤ

خوشبو کا سفر

موتی لال نہرو سے شہریار راجیو گاندھی تک

چلا یا رہ اجالے سمیٹ کر اپنے
طویل راہگذر تھی چراغ کیا کرتا

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایسے خاندان بہت کم گزرے ہیں جنھوں نے تسلسل کے ساتھ تاریخ سازی کے عمل کو جاری رکھا ہو۔ اور جن کے افراد نے یکے بعد دیگرے جغرافیائی حدود کو توڑ کر آفاقی شہرت، عزت، مقبولیت اور عظمت حاصل کی ہو۔

یہ مثالیں ذاتی حکمرانوں کی تاریخ میں تو مل سکتی ہیں لیکن جمہوری طرز حکومت میں یہ اعزاز کم نظیر ہے۔

ہندوستان کی قومی تاریخ میں یہ فخر صرف نہرو خاندان کو حاصل ہے جس نے تحریک آزادی سے حصول آزادی تک اور پھر آزاد ملک کی تعمیر و ترقی، خوشحالی اور فارغ البالی میں سب سے نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے۔

آنجہانی پنڈت موتی لعل نہرو، رہبر ایشیا پنڈت جواہر لعل نہرو، شہید وطن شریمتی اندرا گاندھی، پیکر عزم و عمل سنجے گاندھی سے عزت مآب قائد وطن راجیو گاندھی وزیر اعظم ہند تک خدمت و عظمت کی ایک تابناک اور ہمہ رنگ کہکشاں افق وطن پر بکھری ہوئی ہے۔

پنڈت موتی لعل نہرو نے ملک اور کانگریس کی بے لوث قیادت کر کے آزادی کی شاہراہ کو اپنے عزم اور حوصلے سے اجالا بخشا اور آزادی کے خواب کو حقیقی تعبیر سے آشنا کیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے عظیم والد کی شفقت کے سائے میں آزادی وطن کی جد و جہد میں شمولیت اختیار کی۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی کے ساتھ قدم بہ قدم ساتھ رہ کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وطن عزیز کی آزادی کے لیے آرام و آسائش کی زندگی کو ٹھکرا کر دار و رسن کی راہ اختیار کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو ایک ذات کا نام نہیں بلکہ ایک طرز فکر اور جہد و عمل کی ایک تابندہ تاریخ کا نام ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک بھیانک سلسلہ شروع ہو گیا۔ پورے برصغیر ہند و پاک میں وحشت و بربریت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

نفرت اور کدورت اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا۔ بے دیار لوگوں کے قافلے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر منتقل ہونے لگے۔ تمام روحانی سماجی اور انسانی قدریں پامال ہو گئیں۔

ان مشکل ترین حالات میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو نے حلف لیا۔ اور اپنی فطری شرافت، خاندانی روایت، فکری تدبیر، عملی سرگرمی، ذاتی عظمت کی بنا پر جلد ہی حالات پر قابو حاصل کر لیا۔ وہ اس امتحانی لمحات میں اپنی جان سے بے نیاز ہو کر فسادیوں کے درمیان پہونچ جاتے اور مظلوموں کی داد رسی کرتے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو ہمیشہ معمار وطن کی حیثیت سے یاد کیا

جائیگا۔ انھوں نے ہندوستان کو چند ہی برسوں میں اپنی مضبوط قیادت سے دنیا کے اہم ملکوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

پنڈت جواہرلال نہرو ہندستانی جمہوریت کے بانی اور عالمی امن کے روشن چراغ تھے۔ ان کی خارجہ پالیسی نے ہندستان کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ ان کی بلند شخصیت کے توسط سے ہندستان کو اونچی جگہ حاصل ہوئی۔

پنڈت جواہرلال نہرو عالمی تاریخ کا ایسا باب ہیں جس کے بغیر تاریخ امن انسانیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

صہبا شباب، قوس و قزح روشنی گلاب
ہر شخص تجھ کو ایک نیا نام دے گیا

عظیم باپ کی عظیم ترین بیٹی ہونے کا اعزاز سورگیہ شہید وطن شریمتی اندرا گاندھی سابق وزیر اعظم ہند کو حاصل رہے۔ پریہ درشنی اندرا گاندھی نے اپنے والد پنڈت جواہرلال نہرو کے سائے میں جہاد آزادی میں شمولیت اختیار کی۔ آنند بھون کے عیش و آرام کو تیاگ کر وطن کی آزادی کے لیے مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنے لگیں۔ انھوں نے بچپن ہی سے اپنے آپ کو ملک اور قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس لیے جیون ساتھی بھی ایسا پسند کیا جو آزادی کا ایک نڈر اور جانباز سورما تھا اور دنیا جسے فیروز گاندھی کے نام سے پہچانتی ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی اپنے والد پنڈت جواہرلال نہرو کی تربیت اور شفقت کے سائے میں ملک کی ناقابل فراموش خدمت کے لیے پرورش پا رہی تھیں انھیں تمام بزرگ مجاہدین آزادی اور قائدین حریت کی دعائیں حاصل تھیں۔ مہاتما گاندھی کا آشیرواد ان کے ساتھ تھا۔

ایک زمانے میں یہ سوال عوام و خواص کی زبان پر رہتا تھا کہ نہرو کے بعد کون؟ اس سوال کا جواب عملی شکل میں شریمتی اندرا گاندھی نے دیا ہے۔ وہ ہندستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے ۱۶ سال سرگرم عمل رہی ہیں۔ ملکوں کی تاریخ میں ۱۶ سال لمحات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن شریمتی اندرا گاندھی نے ترقی اور خوشحالی کے اتنے بڑے فاصلے کو اتنی کم مدت میں طے کیا ہے کہ ساری دنیا حیرت زدہ ہے۔ ان کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ صرف اسی پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اور لکھی جا رہی ہیں۔

آج پورے ملک میں معاشی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کی جو خوشبو پھیلی ہوئی ہے اس کا مخزن اور مرکز شریمتی گاندھی ہیں۔ ملک کے پسماندہ اور غریب عوام، کمزور طبقات کے لیے انھوں نے بیس نکاتی پروگرام کے ذریعہ جو کارنامے انجام دیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔

عالمی تجارتی میلہ، ایشیاڈ اور ناوابستہ ممالک کی کانفرنس شریمتی اندرا گاندھی کی تنظیمی صلاحیت کا شاہکار ہیں بین الاقوامی سطح پر انھیں جو اہمیت اور حیثیت حاصل تھی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے وہ ہر مکتبۂ فکر اور ہر سیاسی نقطۂ نظر کے لوگوں میں مقبول تھیں اتنی قد آور خواتین پوری دنیا میں چند تھیں۔

ان کی شخصیت میں اتنی کشش اور ایسی مقناطیسیت تھی کہ جو شخص ایک بار ان سے ملاقات کر لیتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ میں نے اپنی ۳۰ سالہ عوامی اور ادبی زندگی میں ملک کے تمام بڑے سیاست دانوں، قومی رہنماؤں اور دانشوروں سے ملاقات کی ہے لیکن ۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو ۱۔ اکبر روڈ نئی دہلی کی جس ملاقات کا تاثر تاحیات باقی رہے گا وہ مادر وطن شریمتی اندرا گاندھی سے ملاقات ہے انھوں نے مجھے باریابی کا شرف بخشا اور میری کتاب "اجالوں کے سفیر" (تاریخ مجاہدین آزادی) کو قبولیت عطا کی۔ ان کی بزرگانہ اور مشفقانہ مسکراہٹ میرے لاشعور کا سب سے بیش قیمت سرمایہ بن چکی ہے۔

کبھی خیال ترا ہم سفر کبھی یادیں
جب ایک شمع بجھی دوسری جلا دی ہے

شریمتی اندرا گاندھی نے آخری سانس تک وطن اور اہل وطن کی خدمت کی ہے۔ وہ روشنی، خوشبو، عزم، عمل، اتحاد، امن، ترقی، خوشحالی، اور عظمتِ وطن بنکر ہمیشہ ہمارے درمیان موجود رہیں گی ان کے افکار و خیالات ہماری نسلوں کی رہنمائی اور عقدہ کشائی کرتے رہیں گے موت انھیں شکست دینے میں ناکام ہو گئی ہے وہ تعمیر کی روح بنکر رہتی دنیا تک امر رہیں گی۔ وہ بھارت ماں کی بیٹی تھیں اور ہم سب کی ماں

گجھار سے میدان تک ہیں نقش قدم میرے
دریا نے سمندر تک خود راہ نکالی ہے

پیکر عزم و عمل سورگیہ سنجے گاندھی انقلاب اور عمل کے نشان امتیاز تھے۔ انھوں نے نہایت قلیل وقفے اور کم عمری میں ملک گیر شہرت اور اہمیت حاصل کرلی تھی ان کے تعمیری اور انقلابی نظریات نے پورے ملک کے نوجوانوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کی اور انھیں سرگرم کر دیا۔ اگر زندگی نے ان کے ساتھ وفا کی ہوتی وہ ملک و قوم اور نہرو خاندان کا نام اور روشن کرتے۔

اسی غم کے خشک صحرا میں خوشی کے پھول بھی ہیں
جو قدم بڑھا دیا ہے تو قدم بڑھاتے رہیے

قائد نوجوان فخر ہندستان شری راجیو گاندھی وزیر اعظم ہند نے غمناک اور امتحانی لمحات میں ملک کی قیادت سنبھالی ہے۔ ان کے کرب اور دکھ کا اندازہ لگانا دشوار کام ہے لیکن انھوں نے ان مشکل ترین دنوں میں جس بالغ نظری، دور اندیشی، مستقل مزاجی اور روایتی بہادری کا ثبوت پیش کیا ہے اور حالات پر جتنی جلدی قابو حاصل کیا ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وزیر اعظم کا عہدہ بر وقت اور صحیح قائد کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان کے بے لچک رویے نے شر پسندوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں ملک ڈگمگا کر پھر منزل کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔

عزت مآب راجیو گاندھی وزیر اعظم ہند کا یہ کارنامہ یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے اپنی جرأت اور صلاحیت سے ملک کو تباہی سے نہ صرف بچایا بلکہ تعمیر و ترقی کی صحیح سمت پر آگے بڑھایا۔

شری راجیو گاندھی، رہنمائے ہندستان شہید وطن شریمتی اندرا گاندھی کی روایات کے امین اور وارث ہیں انھوں نے مادر وطن سے بہت کچھ سیکھا ہے، تربیت حاصل کی ہے اس لیے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ملک شریمتی گاندھی کے اصولوں کو رہنما بنا کر ترقی اور تعمیر کی راہوں پر اور تیزی سے آگے بڑھے گا اور ترقی پذیر ملکوں کی صف سے نکل کر ترقی یافتہ ملکوں میں نمایاں حیثیت حاصل کرے گا۔

جو شخص چاہے کہ منزل کو اپنی جادہ کرے
قیام تھوڑا کرے اور سفر زیادہ کرے

اندرا جی کی آخری تقریر: صفحہ ۱۶۱ کا بقیہ

تو چاہیئے لیکن دل کی خود انحصاری بھی چاہیئے۔ ہم خود سوچیں کہ ہم میں یہ کام کرنے کی طاقت ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ بھارت کی جنتا میں یہ طاقت ہے۔ بہت بڑی بڑی تہذیبیں ہوئی ہیں جو سب فنا ہو گئی ہیں لیکن ہماری تہذیب اب بھی زندہ ہے۔ جیسا کہ اردو کے مشہور شاعر اقبال نے کہا تھا کہ ابھی ہمارا نام و نشان ہے اور ہماری قدیم تہذیب رواں دواں ہے تو کوئی نہ کوئی طاقت ہے۔ ہم میں کہ یہ تہذیب چل رہی ہے۔ خرابیوں سے لڑنا ہے اور یہ لڑائی ہمت اور قوت ارادی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

بھارت ماتا کی سجے

آخر میں ایک بار پھر میں دہرانا چاہوں گی کہ سب سے پہلے ملک کی ایکتا اور یکجہتی کو ہمیں قائم رکھنا ہے۔ دوسری سب باتیں اس کے بعد آتی ہیں۔ آج کے سوالوں اور آج کے مسئلوں کا سامنا کرنا ہے لیکن اس ڈھنگ سے کہ ہم اور زیادہ مضبوط بنیں اور ہماری طاقت بڑھے اس ڈھنگ سے نہیں کہ فوری طور پر تو کچھ حاصل ہو جائے لیکن کل اور پرسوں ہم کمزور ہو جائیں۔ آپ نے میری اتنی ساری باتیں شانتی اور سکون کے ساتھ سنیں ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور مستقبل کے لیے اپنی نیک خواہشات ظاہر کرتی ہوں۔

★

سیّد اختر الاسلام
۱۵۰۔ شاہ نعتھن میرٹھ

سرخ چنار

کہتے ہیں ۳۱ اکتوبر کو جامِ شہادت نوش کرنے سے قبل اندرا گاندھی صاحبہ اچانک سری نگر (کشمیر) کے لئے روانہ ہو گئی تھیں۔ یہ سفر پہلے سے بالکل متعین نہ تھا اس لئے ہر ایک کو تعجب تھا کہ مادام نے کیوں ایسا کیا۔ استقبال کو آئے ہوئے خال خال حاضرین سے مادام نے صرف اتنا بتایا "مجھے چنار بہت اچھے لگتے ہیں۔ موسم خزاں میں چنار نیا لباس زیب تن کر لیتا ہے، بس اسی لئے میں یہاں آئی ہوں۔" اگلے دن بھوبنیشور میں بھی مادام نے یہی بات دوہرائی تھی۔ مادام اندرا گاندھی اور چنار میں زبر دست مماثلت ہے۔ مادام کی زندگی کھلی کتاب ہے۔ چنار کے بارے میں شاید یہ معلومات شافی و کافی رہے جس کو دیکھنے کے لیے مادام نے آخری سفر کیا تھا۔

موسم گرما میں چنار ہرا بھرا رہتا ہے۔ اس کی پتیاں انسانی انگلیوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ آخر ستمبر میں یہ رنگ بدلنا شروع کر دیتا ہے۔ تب اس کی پتیاں سنہری ہو جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے سنہراپن قرمزی ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد چنار کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے بیر بہوٹی جیسا شعلہ بار۔ تب دور سے دیکھنے پر احساس ہوتا ہے گویا پیڑ آتش زدہ ہو رہا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ جاڑا آنے والا ہے۔

چنار قریب قریب سو برس پرانا ہو کر اپنا وجود تحلیل کرتا ہے۔ اس وقت اس کا تنا اندر سے اتنا زیادہ کھوکھلا ہو جاتا ہے کہ بچے اس میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ بسا اوقات قانون سے فرار لوگ اس میں خود کو مخفی کر دیتے ہیں علاوہ ازیں محبت کے مارے دو دل تو اسے اپنا مامن سمجھتے ہیں۔

ایّامِ خزاں میں لوگ یاگ کانگ وو ڈلر میں جمع ہو کر زعفران نما خوشبو کا رس پان کرتے ہیں۔ اس کے لئے چودھویں رات کی چاندنی سب سے بہتر خیال کی جاتی ہے۔ لیکن خزاں کا چنار بھی چاند سے کم اہمیت والا نہیں ہوتا۔

موسم سرما میں چنار اپنی پتیوں کا لباس اتار کر برہنہ ہو جاتا ہے اور برف پوش ہو کر اپنی برہنگی کو چھپا لیتا ہے۔ خشک پتیاں دھیرے دھیرے نیچے گرتی رہتی ہیں۔ ہوائیں وہ نہیں تیر سکتیں اور ایک جگہ ڈھیر ہوتی رہتی ہیں اپنے بھاری پن کے سبب تیز ہوا بھی انھیں متحرک نہیں کر پاتی۔ تب چنار کے نیچے وہ پتیاں ایک خوبصورت اور دبیز قالین کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن پر چہل قدمی کرنے سے ہر قدم پر مترنم موسیقی عود کرتی ہے ان آوازوں سے ایک خواب آور ماحول پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ قالین تہہ کر دئے جاتے ہیں یعنی خشک پتیاں مقدس آگ کا مقدر ہو جاتی ہیں جب یخ بستہ ماحول میں حدت پیدا کرنے کے لئے کانگڑی روشن ہو جاتی ہے اور اس میں کوئلے کی جگہ چنار کی پتیاں ایندھن بنائی جاتی ہیں۔ چنار اس وقت برف کا لباس اوڑھے اس کیفیت پر خاموش ٹھٹھرا رہتا ہے۔ اس وقت ماحول میں عجیب رنگا رنگی اور لیموں، شفتالو، چیری کی خوشبوئیں دماغ کو معطر کئے رہتی ہیں۔ پھر موسم ایک کروٹ بدلتا ہے۔ برف غائب ہو جاتی ہے۔

(باقی [illegible] پر)

اقبال ماہر
۲۳۰ - نخاس کہنہ
الہ آباد

روشنی جاتی رہی

چاند کی ضو شمع کی تابندگی جاتی رہی — تیرگی چاروں طرف ہے روشنی جاتی رہی
باغباں کے غم میں پھولوں کی ہنسی جاتی رہی — جو تھی سرگرمِ عمل وہ زندگی جاتی رہی

قاتلِ عورت درندہ ہے بڑا بیدرد ہے
بزدلی کے آئینہ پر ابھی کی گرد ہے

اندرا گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں — معترف ہے جس کی عقل و فہم کا سارا جہاں
ہر جگہ ممتاز تھی جس کی حیاتِ کامراں — خون سے لکھی گئی ہے آج اس کی داستاں

بام و در ناشاد ہیں ساری فضا غمناک ہے
اک صدائے درد زیرِ گنبدِ افلاک ہے

غنچہ و گل سرنگوں ہیں باغباں باقی نہیں — واقفِ منزل وہ میرِ کارواں باقی نہیں
وہ نگہبانِ وطن وہ پاسباں باقی نہیں — وہ منارِ عظمتِ ہندوستاں باقی نہیں

چشمِ مضطر کو ہے معمارِ وطن کی جستجو
اک غزالِ وادیِ گنگ و جمن کی جستجو

صفحۂ تاریخ کی وہ داستانِ بے مثال — پیکرِ عزم و شجاعت پرچمِ اوج و کمال
دیدۂ بینا تھے آگاہِ رموزِ ماہ و سال — اسکا ہر کارِ نمایاں آج بھی ہے لازوال

کون ہوگا مفلس و نادار پر اب مہرباں
ملک میں اب کون ہوگا ضامنِ امن و اماں

زخم خوردہ زندگی ہے چارہ گر کوئی نہیں — کارواں بھٹکا ہوا ہے راہبر کوئی نہیں
رہگزر سنسان ہے محوِ سفر کوئی نہیں — آنکھ والے ہیں مگر اہلِ نظر کوئی نہیں

زندہ و تابندہ ہے یہ داستانِ اندرا
جاوداں ہے جاوداں نام و نشانِ اندرا

فکر تمہ ہمایونی
۵-۶-۳۳۱ نامپلی
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

ہائے کیسے کہوں

علم و مذہب ہیں سرچشمۂ آگہی
اندھے ذہنوں کو دیتے ہیں یہ روشنی
ہائے کیسے لکھوں
منہ سے اب خوں ٹپکتا ہے ہر سانس پر
لوگ جھوٹی انا
مذہب و ذات و قوم و زباں کے لیے
روشنی پر سیاہ نفرتوں کی ردا
تان کر خوں خرابے میں مصروف ہیں
ہائے کیسے لکھوں
غمزدہ ہے مرا پیارا ہندوستاں،
بہہ رہا ہے لہو ماں کا ہر موڑ پر
اندھے ذہنوں نے اس کا بھی خوں کر دیا
روشنی گھپ اندھیروں میں پھر چھپ گئی
آہ اٹھتی ہے اندر سے
ہائے کیسے لکھوں
ساری دنیا میں ماتم بپا ہے یہی
وہ کہ جس نے دیا اعتماد و یقیں
ہند کے رہنے والوں کو ہر گام پر
آج اس پہ ہی گولی چلائی گئی
خوں کی اک اور ندیا بہائی گئی
ہائے کیسے لکھوں
یہ بھی تاریخ ہے
اسی گوتم کی دھرتی پہ پچھلے دنوں
پیارے باپو پہ گولی چلی تھی کہ وہ
جو کہ پیارے غریبوں کے غمخوار تھے
کیونکہ وہ سب ہی عزت کے حق دار تھے
یہ بھی تاریخ ہے
روشنی کالی چادر میں چھپتی نہیں
روشنی پیار کی
روشنی جو کہ باپو نے پھیلائی تھی۔ آگے بڑھتی رہی۔
ساری دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کیا۔
ساری دنیا کی نظروں کو چندھیا دیا
اندرا جی خود اک روشنی ہو گئیں
ان کا ہر ہر عمل۔ ان کا ہر اک قدم
ملک کی سربلندی کا غماز ہے
ہائے کیسے لکھوں
اسی گوتم کی دھرتی پہ اک بار پھر
نفرتوں کے اندھیروں نے یلغار کی
آج ہے چار سو شور یہ ماتم بپا
لوگ روتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ چیخ کر
کیسے آگے بڑھیں۔ روشنی چاہیے۔ روشنی چاہیے
یہ بھی تاریخ ہے
روشنی کالی چادر میں چھپتی نہیں
ایک پل میں اندھیرا یہ چھٹ جائے گا
رائیگاں ماں کا یہ خوں نہیں جائے گا
خون کی بوند سے
ایک سورج نیا پھر نکل آئے گا
میرا ہندوستاں جگمگا جائے گا

وفا سیتاپوری
پھوبز میڈیکل اسٹور
محلہ کوٹ پرانا سیتاپور

آنجہانی اندرا گاندھی

اندرا جی ملک کی تھیں ایک ایسی پاسباں
سربلندی پر نظر آنے لگا ہندوستاں

ان کی حکمت سے جھکا ہے سامراجی آسماں
ان کی ہی تدبیر سے اونچا ہوا قومی نشاں

ان کے جانے سے کہیں اب لطف مے باقی نہیں
یوں تو میخانہ میں سب کچھ ہے مگر ساقی نہیں

دلیش کی آغوش میں قائم رہے ایسا نظام
ظلم و نفرت کا ہمیشہ کے لیے ہو اختتام

کیجیے مل جل کے اس کا دہر میں اونچا مقام
ساری دنیا میں وفا روشن رہے بھارت کا نام

انجم صدیقی بہرائچی
آزاد انٹر کالج
بہرائچ

آدرش مر سکتا نہیں

آفریں صد آفریں اے اندرا اے نیک نام
تیری پوری زندگی جہد و عمل کا ہے پیام
قتل تیرا ہے غم و اندوہ کا وہ سانحہ
جس سے ساری قوم ہو کر رہ گئی بے آسرا
موت پر تیری ہے ہر اہلِ وطن کی آنکھ نم
قلب میں سارے جہاں کے تیری رحلت کا ہے غم
قتل یہ پیشانیٔ ہندوستاں پر داغ ہے
تیرے اٹھ جانے سے ویراں اس وطن کا باغ ہے
جان دے کر ملک کی خاطر یہ ثابت کر دیا
جان سے بڑھ کر تجھے پیاری تھی قومی ایکتا
جسم مر سکتا ہے پر آدرش مر سکتا نہیں
فرد مر سکتا ہے بھارت ورش مر سکتا نہیں
سیکڑوں مردانِ آہن تیری ہمت پر نثار
سیم تن کے ساتھ میدانِ عمل کی شہ سوار
اے سراپا شانتی اے امن کی پیغامبر
اے مجسم عقل و دانش، نکتہ رس، بالغ نظر

تو نہیں تو ماہ و انجم بھی ہیں کتنے سوگوار
ہند کے گلشن سے رخصت ہو گئی جیسے بہار

اندرا گاندھی سے

میری چند یادگار ملاقاتیں

احمد سعید ملیح آبادی
ایڈیٹر روزنامہ آزاد ہند کلکتہ

نہرو خاندان سے میرے خاندان کے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ میرے سگے چچا عبدالوحید خاں (مرحوم)، محمد زبیر خاں اور عبدالسمیع خاں آزاد (مرحوم) جواہرلال نہرو کے ساتھ نینی جیل میں قید کاٹ رہے تھے وہیں یہ واقعہ پیش آیا کہ انگریز جیلر نے جواہرلال جی سے بدتمیزی کی اور میرے چچا محمد زبیر خاں نے جو بہت قوی ہیکل انسان تھے اب ضعیف اور کمزور ہو گئے ہیں، جیلر کو اٹھا کر دے مارا اور اس کے سینے پر چڑھ کر ایک ہی گھونسا مارا جس سے اس کی ہڈی پسلی برابر ہو گئی۔ اس کے بعد سزا سخت کر دی گئی اور دوسرے چچا عبدالسمیع خاں آزاد کو کال کوٹھری کی سزا دی گئی۔ میرے عزیز جوش ملیح آبادی کے بھی جواہرلال نہرو سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

ملیح آباد کے آم

وزیراعظم بننے کے بعد بھی جواہرلال کو آموں کی مخصوص قسمیں میرے چچا صاحبان دلی بھیجا کرتے تھے اور کبھی کبھار ان سے مل بھی لیتے تھے ایک مرتبہ چچا آم لے کر خود تین مورتی پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ گئے۔ جواہرلال جی اوپر منزل میں رہتے تھے۔ اپنے دوست خاں صاحبان کی آمد کی خبر سنی تو جلدی سے نیچے اتر آئے یہاں ملیح آباد کے کئی ٹوکرے آم جو نادر اقسام کے تھے، رکھے ہوئے تھے، جواہرلال جی اتنے بہت سے آم دیکھ کر خوش تو ہوئے مگر جب ان سے یہ کہا گیا کہ آپ پہچانتے تو ہیں نہیں بغیر سمجھے بوجھے آم کھانے لگیں گے اور پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون سی قسم کے آم کھا رہے ہیں لہٰذا ہر قسم کے آم پر اس کا نام لکھ دیں۔ جواہرلال جی کے لیے اپنی بے حد مصروفیت میں یہ کام ممکن نہیں تھا انھوں نے اپنی مدد کے لیے اندرا گاندھی کو بلایا جواہرلال جی تو چند منٹ بعد دفتر کے لیے روانہ ہو گئے اور اندرا جی کئی گھنٹے تک سیکڑوں آموں میں سے ان کی اقسام چھانٹ کر سب کے نام لکھتی رہیں۔ تہذیب اخلاق، شرافت اور مروت نہرو خاندان کی میراث ہے۔ اندرا جی کو ان دنوں کوئی ایسی خاص مصروفیت نہیں تھی پھر بھی مہمانوں کی خاطر ان کا کافی دیر تک اس "فضول سے کام" میں مصروف رہنا ان کی خاندانی شرافت اور تہذیب کا مظہر تھا۔

سنہ ۱۹۶۴ء کا فسادِ کلکتہ

خاندانی تعلقات کے اس پس منظر میں اندرا گاندھی سے مجھے متعدد بار ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا اور ان کے ساتھ ہمیشہ ہی انس کا ایک رشتہ قائم رہا۔ ایک واقعہ جنوری ۱۹۶۴ء کا یاد آرہا ہے۔ کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ شہر کے مسلمان سمٹ کر زکریا اسٹریٹ کے علاقے میں جمع ہو رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ شاید اب کلکتہ میں مسلمان رہ نہیں سکیں گے۔ ہر طرف خوف و دہشت تباہی اور ہلاکت کا بازار گرم تھا۔ میں کلکتہ خلافت کمیٹی میں بیٹھا ہوا تھا بہت لوگ تھے نازک حالات کی وجہ سے حد سے سوا ذہنی دباؤ تھا۔ ملا جان محمد صاحب مرحوم نے مجھ سے کہا کہ پنڈت جواہرلال نہرو کے گھر ٹیلی فون کرو۔ نہرو جی دل کا دورہ پڑنے سے بہت بیمار تھے۔ میں نے ٹیلی فون کیا تو اندرا جی نے بات کی میں نے انھیں کلکتے کے فسادات کی تفصیل اور حالات سے آگاہ کر کے درخواست کی کہ جواہرلال جی سے کہہ کر کلکتہ میں جلد از جلد فوج بھجوائیے اور شہر کو فوج کے حوالے کر دیجئے۔ تب ہی بچنے کی کوئی صورت ہے۔ اندرا جی نے کہا کہ میں پنڈت جی سے بات کر کے تھوڑی دیر میں آپ کو بتا سکوں گی اپنا فون نمبر لکھا دیجئے۔ چند منٹ بعد ان کا ٹیلی فون خلافت

—— کمیٹی کے دفتر میں آیا اور کہا کہ وزیر داخلہ گلزاری لال نندا آج کلکتہ پہنچ رہے ہیں اور ان سے پہلے فوجی دستے ہوائی جہازوں سے بھیجے جارہے ہیں اور کمانڈر انچیف جنرل چودھری بھی آرہے ہیں۔ فوج آئی اور اس نے شہر کو اپنے کنٹرول میں لے کر امن قائم کر دیا۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ پی سی سین کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو انھوں نے فروری ۱۹۶۴ء میں مجھے ڈیفنس آف انڈیا رولز میں گرفتار کر کے دم دم جیل میں بند کر دیا جہاں اور بھی مسلمان قید و نظر بند تھے۔ کئی مہینے کی نظر بندی کے بعد آخر حافظ محمد ابراہیم صاحب گورنر پنجاب کے لکھنے پر رہائی ملی جنھوں نے پی سی سین کو شکایتاً لکھا تھا کہ تم نے میرے بھتیجے کو کس قصور میں نظر بند کر رکھا ہے۔

مسلمانوں کے لیے ریزرویشن

اندرا گاندھی سے ایک تفصیلی اور یادگار ملاقات مارچ ۱۹۷۶ء میں راج بھون کلکتہ میں ہوئی جہاں ڈاکٹر زین العابدین اس وقت وزیر چھوٹی صنعت کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے پاس گیا اور انھیں میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک ختم کرنے کے لیے انھیں ریزرویشن دیا جائے۔ مسز گاندھی کو میمورنڈم انگریزی میں دیا گیا تھا جسے اردو میں میں نے لکھا تھا اور ڈاکٹر مقبول احمد نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر مقبول صاحب بھی وفد میں موجود تھے۔ زین العابدین نے انگریزی زبان میں میمورنڈم کی وضاحت شروع کی تو وزیر اعظم نے کہا کہ آپ تو وزیر ہیں ان لوگوں کو بولنے دیں۔ اس کے بعد میمورنڈم کی وکالت کا فریضہ مجھے سونپا گیا اور میں نے اردو میں وزیر اعظم کو سب باتیں سمجھائیں۔ وہ کافی متاثر ہوئیں اور ریزرویشن کی ضرورت سے اتفاق کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا ہوگی۔

آداب عرض

گفتگو سے پہلے ایک واقعہ ہو چکا تھا۔ وفد کے اراکین کا استقبال کرنے وزیر اعظم صاحبہ کمرے سے باہر تشریف لائی تھیں۔ اور لوگ اندر چلے گئے تو مجھ سے کہنے لگیں۔ اندر آیئے۔ میں نے کہا، ابھی آتا ہوں زین العابدین صاحب آجائیں۔ وہ اسی بیچ گورنر ڈیاس سے باتیں کرنے لگے تھے۔ مسز گاندھی ہمارے انتظار میں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ زین العابدین صاحب فوراً ہی آگئے اور ہم وسیع کمرے میں داخل ہوئے۔ وزیر اعظم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمستے کیا۔ میں نے اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھا کر کہا "آداب عرض!" مسز گاندھی نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لیے اور پھر ایک ہاتھ پیشانی تک لے جا کے لکھنوی انداز سے آداب کیا۔ ہماری گفتگو کوئی ۴۵ ـ ۵۰ منٹ رہی۔ جب اٹھ کر ہم لوگ چلنے لگے تو انھیں یہ یاد رہا کہ یہ مسلم وفد ہے لہٰذا انھوں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بجائے ایک ایک کو فرداً فرداً جھک کر آداب کیا اور ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آئیں۔ یہ ایمرجنسی کے دن تھے اور اندرا گاندھی کو "آدم خور شیرنی" سمجھ کر ان سے ڈرا جاتا تھا اور ان کے سامنے بات کرتے ہوئے لوگ تھراتے تھے۔ اصل میں یہ لوگوں کے اپنے دل کا چور ہوتا تھا جو انھیں زبان بندی پر مجبور کرتا تھا ورنہ مسز گاندھی کو میں نے ہمیشہ ہی متحمل مزاج اور خوش اخلاق پایا۔

آخری ملاقات

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے میری آخری ملاقات جنوری ۱۹۸۴ء میں ان کے دفتر ساؤتھ بلاک نئی دہلی میں ہوئی جب انھوں نے چند اردو ایڈیٹروں کو ملک بھر سے غیر رسمی بات چیت کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ ملاقات دو گھنٹے سے زائد تھی۔ اس میں مسز گاندھی سے میں نے کہا تھا کہ وہ قانون کے مطابق حکومت نہیں چلا رہی ہیں اس لیے شر پسندوں اور فتنہ پردازوں کو تحریر و تقریر کے ذریعہ فرقہ پرستی پھیلانے اور فسادات کرانے کی چھوٹ مل گئی ہے۔ اگر انھوں نے سختی سے ایسی تخریبی اور تشدد پسند طاقتوں کو نہ دبایا تو ملک میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ باتیں جو کافی تیکھی تھیں سن کر ان کے چہرے پر ذرا بھی ناگواری ظاہر نہیں ہوئی۔ انھوں نے نرمی سے پوچھا "بتایئے کہ پھر میں کیا کروں" میں نے انھیں اپنے خیال سے آگاہ کیا اور وزیر اعظم نے نوٹ لیے اس پر اخبار "پرتاپ" کے ایڈیٹر نے مجھ سے کچھ تکرار کرنے کی کوشش کی اور وزیر اعظم کو للکارا۔ دہلی سے واپس آکر میں نے اپنی کہی ہوئی باتیں لکھ کر بھی وزیر اعظم کے پاس بھیج دیں۔ قومی یک جہتی کونسل کی میٹنگ میں جو ۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو ہوئی مسز گاندھی نے اشتعال انگیزی اور فرقہ پرستی پھیلانے والی تحریروں اور تقریروں پر سخت قانونی کارروائی کرنے کی تجویز خود ہی کانفرنس میں پیش کی تھی۔

ماہ رمضان المبارک میں وہ ہمیشہ ہی افطار پارٹی دیتی تھیں اور ازراہ عنایت مجھے بھی مدعو کرنا نہیں بھولتی تھیں مگر میں کبھی ان کی افطار پارٹی میں شریک نہ ہو سکا۔ عید کے موقع پر انھوں نے مجھے ذاتی طور پر ایک اچھا سا خط عید مبارک کے لیے لکھا تھا۔ سعودی عرب کے دورے میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں مگر دیر سے اطلاع کرنے کی وجہ سے پروگرام میں وہ مجھے شامل نہ کر سکیں۔

مسلمانوں سے ہمدردی

مسز اندرا گاندھی تمام ہندستانیوں سے بلاتفریق مذہب وملت ہمدردی اور محبت رکھتی تھیں۔ اس کی ایک مثال ابھی حال میں سامنے آئی ہے۔

تقریباً دو ڈھائی ماہ قبل ایک عمر رسیدہ شخص محمد سلیم انصاری دفتر میں آکر مجھ سے ملا اور اس نے بتایا کہ وہ اڑیسہ کے ایک پیپر مل میں کام کرتا تھا۔ کام ختم ہو گیا تو وہ اپنے بقایاجات وصول کرنے وہاں گیا۔ اس نے دیکھا کہ مل کے گودام میں قرآن مجید کے اوراق ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں جو سنگاپور سے کلکتہ گودی میں ردی کاغذ کی گانٹھوں میں لائے گئے تھے۔ محمد سلیم انصاری کو اس سے بہت دکھ ہوا اور اس نے دفتر "آزاد ہند" میں آکر اپنی شکایت درج کرائی جو اس سلسلے کی خبر میں چھاپی گئی۔

محمد سلیم انصاری نے مجھ سے خواہش کی کہ اسے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے گھر کا پتہ لکھوا دوں تو وہ کسی سرکاری پیپر مل میں اپنے کام کے لیے وزیر اعظم کو خط لکھے گا۔ میں نے منع کیا کہ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا مگر وہ شخص مصر رہا تو میں نے اسے بتایا کہ وزیر اعظم کے گھر کا پتہ موجود ہے نوٹ کر لو۔ پتہ لے کر وہ آدمی چلا گیا اور میں یہ بات بھول بھی گیا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۴ کو وہ مجھ سے پھر آکر ملا۔ وہ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ناگالینڈ پیپر مل میں اسے کام ملنے کے لیے ٹسٹ دینے کو بلایا گیا ہے۔ ۱۵ دن ٹسٹ چلے گا۔ کامیاب رہا تو نوکری مل جائے گی۔ ورنہ واپس کیا جائے گا۔ ان ۱۵ دنوں کے لیے یومیہ اجرت دی جائے گی۔ اور ناگالینڈ میں موکاک چنگ تک آمد و رفت کا سکنڈ کلاس کرایہ ملے گا۔ اسے اکتوبر کے دوسرے ہفتے تک وہاں پہنچنے کی ہدایت تھی اور وہ مجھ سے ۱۲ اکتوبر کی شام میں ملا۔ پوچھا اب تک گئے کیوں نہیں تو محمد سلیم انصاری نے بتایا کہ جوان لڑکی سخت بیمار تھی جسے آر جی کار اسپتال میں بھرتی کیا وہ دو دن بعد چھٹی پا کر گھر آجائے گی تب جائے گا۔ پھر اس نے اپنی پریشانی بیان کی کہ بے روزگاری اور علالت کے سبب اس کے پاس زادِ راہ نہیں ہے۔ میں نے ایک سوشل ادارے والوں سے کہہ کر اسے دو سو روپے دلوا دیے جو وہ بطور قرض چاہتا تھا مگر اسے بتا دیا گیا کہ یہ قرض نہیں ہے۔

محمد سلیم انصاری نے مجھے ہندستان پیپر کارپوریشن لمیٹڈ کے منیجر کو آرڈینیشن مسٹر ڈاس کے مشرا کا خط دکھایا جس میں اسے ناگالینڈ پیپر مل میں حاضر ہونے کی ہدایت تھی۔ انصاری نے بتایا کہ کلکتہ میں اسے ہندستان پیپر کارپوریشن میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا تب اسے پتہ چلا کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اسے کام دینے کے لیے لکھا تھا۔ پتہ اس طرح چلا کہ انٹرویو لینے والوں نے انصاری سے سوال کیا کہ تمہارا اندرا گاندھی سے کیا تعلق ہے؟ اس نے جواب دیا کچھ بھی تعلق نہیں ہے وہ دیش کی نیتا ہیں میں نے انھیں اپنی مصیبت لکھی تھی شاید انھوں نے آپ کو لکھا ہوگا۔"

غریب انصاری کا خط پڑھنے اور اس پر آرڈر کرنے کا وقت مسز گاندھی نے نکال لیا اور اب اس کے برسرروزگار ہو جانے کی امید ہے یہ مسز گاندھی کی انسان دوستی کی اعلا مثال ہے۔

انصاری سے میں نے کہا کہ اس میں مسز گاندھی کی ذاتی شرافت اور بغیر امتیاز دیش واسیوں سے ان کی محبت اور تعلق کا پہلو تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم اڑیسہ کے پیپر مل کے قرآن مجید کی بے حرمتی دیکھ کر تڑپ اٹھے اور وہاں سے ایک فرمہ دکھانے کو اٹھا لائے شاید اللہ کو تمہاری یہ ادا بھا گئی اور تمہاری بات ملک کی وزیر اعظم تک جا پہنچی اور تمہاری نوکری کے لیے انھوں نے شخصی طور پر دلچسپی لی۔ یہ من جانب اللہ ہے کہ وزیر اعظم نے ہر روز کے ہزاروں خطوں میں تمہارا خط نظرانداز نہ ہونے دیا اور اللہ نے تمہاری طرف ان کا دھیان راغب کر دیا۔

مرنے والی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اب وہ نہیں رہی ہیں تو بہت یاد آئیں گی اور ان کی کمی ہر وقت محسوس ہوگی۔

> اگرچہ سیاسی طور پر ہمارے درمیان اختلاف تھے لیکن میں نے انھیں ہمیشہ ماں کی طرح سمجھا۔ مجھے ان کی موت سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ

جوہر امیٹھوی
میواداد منزل مولوی گنج
لکھنؤ

محبوب رہنما سے ایک یادگار ملاقات

آنجہانی اندرا گاندھی "اجالوں کے سفیر" دیکھتے ہوئے۔

۶ جولائی ۱۹۸۳ء کا دن میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش دن ہے۔ ہوا یوں کہ میرے عزیز دوست اور ملک کے مشہور معروف شاعر حضرت حیات وارثی کی ایک کتاب تاریخ مجاہدین آزادی "اجالوں کے سفیر" ملک کی ہر دلعزیز رہنما محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کو سویرے آٹھ بجے انکی قیام گاہ دہلی میں پیش ہونا تھی۔ لکھنؤ سے اراکین آل انڈیا ہندی اردو سنگم کا ایک وفد جس میں ڈاکٹر عمار رضوی سابق وزیر تعلیم قومی یکجہتی اترپردیش جنید صدیقی، عارف نجمی، محمد اسلم صدیقی، شریمتی کیلاش پتی ایم، پی، شوکت ملیح آبادی شامل تھے حیات صاحب کے ہمراہ دہلی روانہ ہوا۔ بیگم محسنہ قدوائی صاحبہ وزیر صحت حکومت ہند کی قیام گاہ پر ملاقات کی تفصیلات کا خاکہ بنایا گیا اور وہیں سے ٹیلی فون کے ذریعہ چودھری رام سیوک ایم، پی ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی ممبر پارلمنٹ اور دوسرے معزز حضرات کو مطلع کیا گیا۔ اس سلسلے میں محسنہ صاحبہ کے پرائیویٹ سکریٹری جناب انوار حسین صاحب نے خصوصی تعاون دیا۔ کچھ ممبران یوپی اسمبلی کو ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے بھی مدعو کر لیا تھا اس طرح ۶ جولائی ۱۹۸۳ء کو سویرے وزیر اعظم ہند کے دفتر ۱۔ اکبر روڈ پر سنگم کا ایک باوقار وفد اپنی ہر دل عزیز رہنما سے ملاقات کا اشتیاق لئے ہوئے پہنچا۔

حفاظتی اور انتظامی امور سے گذرتے ہوئے ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم اپنی محبوب رہنما کو قریب سے دیکھ سکتے تھے ان سے براہ راست کچھ کہہ سکتے تھے۔ ملاقات سے کچھ قبل ان کے خصوصی معاون نے ہم لوگوں کو مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا۔ اخبارات کے نمائندے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لوگ اس ملاقات کو عکس بند کرنے کے لئے موجود تھے۔

ایک نیوز ایجنسی کے نمائندے نے حیات وارثی صاحب کی کتاب سے متعلق تفصیل دریافت کی تو ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے حیات وارثی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالی۔

اتنے میں ہم لوگوں نے دیکھا کہ باہر لان پر شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند لوگوں سے ملاقات کر رہی ہیں اور گلدستے کی شکل میں خراج محبت اور ہدیۂ عقیدت حاصل کر رہی ہیں اسی دن شریمتی نلنی پاٹل ایم، پی کی قیادت میں مہاراشٹر سے خواتین کا ایک بڑا وفد آیا تھا محترمہ وزیر اعظم اس وفد سے نہایت گرم جوشی سے ملاقات کر رہی تھیں بھارت رتن کے درشن کرنے اور ان سے اپنے مسائل بیان

کرنے کے لیے ہر روز پورے ملک سے لوگ آتے تھے اور اپنی محبوب رہنما کے چند کلمات سے ان کو وہ مسرت اور اطمینان ملتا تھا کہ سارے دکھ بھول جاتے تھے۔

شریمتی گاندھی باہر لان پر ملاقات کر کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ لمحہ جس میں پہلی بار ان پر نگاہ پڑی ایک ناقابل بیان لمحہ ہے۔ جن کو ایک طویل مدت سے دور سے دیکھتا تھا تقریباً سنتا تھا آج بالکل سامنے پا کر حیرت و مسرت کے عالم میں گم ہو گیا۔

ان کی ذاتی عظمت اور مقناطیسی کشش نے ماحول کو ایک دم طلسماتی بنا دیا تھا کہ ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے حیات وارثی صاحب کے بھرپور تعارف کے بعد ہم لوگوں کو بھی عزت مآب وزیر اعظم سے متعارف کرایا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے سب کا سلام مسکراہٹ اور شفقت کے ساتھ قبول کیا۔

ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے "اجالوں کے سفیر" کا انتساب پڑھ کر محترمہ کو سنایا اور جب وہ اس جملے پر پہونچے کہ "اور جن کی قیادت میں ملک تختۂ دار سے سایۂ بہار تک آیا۔" تو اندرا جی نے مسکراتے ہوئے حیات صاحب سے کہا شکریہ!

ان کا مدھم اور شیریں لہجہ، پر وقار اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دور اندیشی اور ذہانت سے جگمگاتی آنکھیں، شفقت اور اپنائیت سے معمور گفتگو کچھ دیر کے بعد یہ احساس ختم ہو گیا کہ ہم لوگ وزیر اعظم سے گفتگو ہیں بلکہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہم خاندان کے ایک بزرگ سربراہ، علم و ادب کی ایک سرپرست سے ہم کلام ہیں۔ انھوں نے "اجالوں کے سفیر" کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ایسی کتابوں کی اس وقت بہت ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے مجاہدین آزادی کے کارناموں اور قربانیوں سے واقف ہو سکیں

انھیں "اجالوں کے سفیر" کا ہندی روپ بھی دکھایا گیا۔ اندرا جی نے ہندی مسودے کو دیکھ کر اس کی بہت تعریف کی تو جنید صدیقی صاحب نے کہا کہ ہم لوگوں کے پاس اس کو شائع کرنے کے وسائل نہیں ہیں تو ڈاکٹر عمار رضوی صاحب اس وقت کے وزیر تعلیم دیکھبتی نے فرمایا کہ یہ انتظام میں کر دوں گا۔

تقریباً ۱۵ منٹ تک ہم لوگ ان سے محو گفتگو رہے ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں کوئی عجلت نہیں ہے ان کی عظیم ترین مصروفیات میں سے جو وقت ہم لوگوں کو عنایت ہوا تھا وہ ہمارے وفد کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ جب ملاقات ختم ہونے لگی تو حیات وارثی صاحب نے ان سے درخواست کی کہ ایک مزید گروپ بھی ہو جائے تو نوازش ہوگی عزت مآب اندرا جی نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ آپ لوگ باہر چلیں میں آرہی ہوں وہ باہر تشریف لائیں اور ایک گروپ اور لیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے آداب کہا اور تہذیب و روایات کے ان گنت چراغ روشن ہو گئے۔ اس ملاقات میں خصوصی تعاون مسٹر آر کے دھون نے دیا، ٹیلی ویژن نے نیشنل پروگرام میں ٹیلی کاسٹ کیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے خبروں میں نشر کیا اخبارات نے خبریں شائع کیں اس طرح ہم لوگ ملک کی ہر دل عزیز رہنما، قائد ایشیا محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کی ملاقات کا نہ مٹنے والا نقش لے کر واپس آئے۔

مگر آج اسی محبوب رہنما کو "شہید وطن" کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ انھوں نے اپنے کردار و عمل سے وہ بلند مقام اور وہ عظمتِ دوام حاصل کر لی ہے جو لازوال ہے۔

گلاب کے فتح : صفحہ ۱۸۰ کا بقیہ

میں سکون و مسرت کی لہر دوڑا دی۔ دلی کے ان بازاروں میں جہاں گذشتہ دو دن سے اداسی اور سوگواری کے ساتھ فکر و تذبذب کی پرچھائیاں حرکت کرتی نظر آرہی تھیں ان کی جگہ خوشی کے ترانوں نے لے لی۔ جگہ جگہ مٹھائیاں تقسیم ہونے لگیں۔ ہر چہرہ جوشِ انبساط سے کھل اٹھا۔

۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو جب مسز اندرا گاندھی اپنی کوٹھی جانے کے لیے مرکزی ہال سے باہر نکلیں تو ان کی سفید ساری پر لپٹی ہوئی بادامی شال پر لگا ہوا سرخ گلاب مسکرا رہا تھا۔ اس کی رعنائیاں کچھ اور بڑھ گئیں تھیں۔

●●●

یوگیندر پال صابر
محلہ کھڑانہ شکوہ آباد، مین پوری
(یوپی)

اے جانِ وطن، اے شانِ وطن

جہاں کو آج تمھاری بہت ضرورت ہے
یہ کیا سُنا ہے کہ فردوس کی مکیں ہو تم
مجھی سے جنگ کیے جا رہا ہے دل میرا
اسے یقیں ہی نہیں ہے کہ اب نہیں ہو تم

تمھارے غم نے ہمیں کیا سے کیا بنا ڈالا
حواس و ہوش سے بیگانے ہو گئے ہم لوگ
تمھیں پسند نہیں تھا جنونِ عشق مگر
تمھارے ہجر میں دیوانے ہو گئے ہم لوگ

سپرد جن کے حفاظت تھی وہ بنے قاتل
پھر ایک بار جدا دل سے اعتبار ہوا
تمھیں شہید تمھارے محافظوں نے کیا
یقیں کا دامنِ بے داغ تار تار ہوا

کیا ہے قتل تمھیں جس نے وہ درندہ ہے
ہے داغ عالمِ انساں پہ زندگی اس کی
کنول کے پھول پہ بندوق ارے معاذاللہ
ہمیشہ یاد رہے گی یہ بزدلی اُس کی

تمھیں کسی بھی بشر سے نہیں ہے اب خطرہ
نہ کوئی دوست تمھارا ہے اب نہ دشمن ہے
تم آسماں ہو زمیں تم کو کیا ستائے گی
تم ابرِ رحمتِ حق ہو زمین گلشن ہے

ساجد خیرآبادی
۲۶ ایچ او سی ایف
اسٹیٹ شاہجہانپور

خوشبو کا پیام

وہ اک کلی جو گلستاں میں مسکرائی تھی
صفت عجیب ہی قدرت سے اس نے پائی تھی
کہ جیسے چاند نگر سے اتر کے آئی تھی

وہی کلی جو گلستاں کی زیب و زینت تھی
ہزار بادِ مخالف میں بھی سلامت تھی
بہت لطیف گلستاں میں جس کی نکہت تھی

جواں ہوئی تو نیا اس پہ اک نکھار آیا
کلی کو جس نے بھی دیکھا اسے ہی پیار آیا
غرض چمن میں عجب دورِ پُر بہار آیا

کسی نے اس کو سیاست کا آفتاب کہا
کسی نے مادرِ گیتی کا ماہ تاب کہا
کسی نے گلشنِ نہرو کا اک گلاب کہا

چمن میں ایسے عناصر بھی تھے مگر موجود
دماغ جن کے پراگندہ عقل تھی محدود
نہ ہو سکا انھیں برداشت اس کلی کا وجود

مزاج وقت نے بدلا چلی جو بادِ سموم
تو کچھ خونیں ہر اک دل کو کر گئے مغموم
ہوئی وہ جانِ گلستاں حیات سے محروم

ہوا یہاں فضا میں بکھر گئی خوشبو
اداس چھوڑ کے سب کو گزر گئی خوشبو
پیام دے کے یہ ہم کو مگر گئی خوشبو

کلی سے درس لو گلشن کو اپنے مہکاؤ
مصیبتوں میں بھی ہنستے رہو نہ گھبراؤ
وطن پہ جان دو، خوشبو بنو، بکھر جاؤ

شائستہ رحمانی،
زیڈ ۴/۲۰۸ ڈاکٹر جی۔ کے روڈ
کلکتہ ۴۴

روشنی کی موت

مدتوں روئیں گے اب اہلِ وطن
مدتوں سونی رہے گی انجمن
کس طرح سے ظلمتوں میں گم ہوئی ہے
روشنی کی وہ کرن
کہ اب اہلِ نظر کرتے ہیں ماتم
بے کیفی کی رات لیے
سارا ہند ہے سونا سونا
تھی وقارِ قوم وہ
کتنا عالی مرتبہ
شخصیت کتنی عظیم
بے مروت موت، یہ بے چارگی
اس کے قبضے سے کوئی کیا چھین لائے زندگی
موت نے چھینا
اے ہم سے لعل زر راہزن
شخصیت جس کی بذاتِ خود بنی تھی انجمن

اسلام کیفی
خلاص محلہ۔ مدھوپور
بہار

اندرا جی کی نذر

سو گئی انسانیت کی راز دار
تھرتھرا کر رہ گئے سازِ دل کے تار
کیوں نہ دل کو کیجئے اب بیقرار
اب کہاں صحنِ چمن میں ہے بہار
راہ میں گم ہو نہ جائے کارواں
نامکمل رہ نہ جائے داستاں
اڑ رہے ہیں ہر طرف گرد و غبار
اب کہاں صحنِ چمن میں ہے بہار
شامِ زنداں بن گئی شامِ اودھ
ٹوٹ کر بکھرا ہے پھر جامِ اودھ
کس قدر غم میں ہیں یہ لیل و نہار
اب کہاں صحنِ چمن میں ہے بہار
ہو گئی ویران دِلّی کی گلی
غم میں ہے کشمیر کے دل کی کلی
رو رہا ہے پھوٹ کر ہر جانثار
اب کہاں صحنِ چمن میں ہے بہار
اب کہاں صبحِ بنارس ہے حسین
ڈھونڈتی ہے تجھ کو کاشی کی زمیں
شامِ بنگالہ ہوئی تجھ پہ نثار
اب کہاں صحنِ چمن میں ہے بہار

ڈاکٹر عثمان صدیقی بسوانی
ہدایت منزل، بسواں۔ سیتاپور (یوپی)

بجھ گیا وہ بھی دِیا!

بڑھ گئی، بڑھ گئی اب تیرگیٔ شامِ جفا
چھا گئی، چھا گئی ہر چار طرف غم کی گھٹا
گوشہ گوشہ پہ اندھیرے کا پڑا ہے سایا
آفتاب آ کے لبِ بام کوئی ڈوب گیا
اپنی منزل پہ مسافر نہ ابھی تھا پہونچا
بڑھ کے رہزن نے سرِ راہ اسے لوٹ لیا
آج ہر آنکھ سے عثمان ہے آنسو ٹپکا
"مادرِ ہند" کا بھی قلب و جگر چاک ہُوا
ناز تھا جس پہ سوا!
بجھ گیا وہ بھی دِیا!

ہم ابھی خوابِ گراں سے بھی نہ اٹھ پائے تھے
اپنی منزل پہ نہ افسوس ابھی آئے تھے
ننگِ اسلاف یہی لوگ تو کہلائے ہیں
آستینوں میں جو خنجر کو چھپا لائے ہیں
اک ستارہ جو ضیا بارِ وطن ہوتا تھا
شام ہی سے تو سرِ راہ وہ تارا ڈوبا!
ناز تھا جس پہ سوا!
بجھ گیا وہ بھی دِیا!

اے ریاکار ترا مکر و دغا لعنت ہے
جو وفادار ہوا اُس پر یہ جفا لعنت ہے
اپنے ہی رستے میں رہبر کو لٹا لعنت ہے
اندرا گاندھی کو بھی قتل کیا لعنت ہے
اندرا گاندھی جو تھی پیکرِ صد حسن وفا
کیا قاتل نے وطن کو یہ دیا داغِ جفا
ناز تھا جس پہ سوا!
بجھ گیا وہ بھی دِیا!

انوار احمد حافظ بنارسی
بی ۱۰/۹۰ شیشان بازار
وارانسی (یوپی)

آہ اندرا جی

اہلِ گلشن کا دل پارہ پارہ ہوا حادثہ ایسا اک رونما ہو گیا
باغباں اپنے خوں میں نہانے لگا دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا

لَو چراغوں کی بھی تھر تھرانے لگی غم سے پروانوں کی جان جانے لگی
شمع رو رو کے آنسو بہانے لگی ایسا دل سوز یہ سانحہ ہو گیا

آج ماضی کی تاریخ دہرا گئی سب کو مقتول گاندھی کی یاد آ گئی
اندرا جی کے سینے پہ گولی لگی زخم مالو کے دل کا ہرا ہو گیا

ظالموں نے تو چھلنی بدن کر دیا ہائے ہائے تجھے بے وطن کر دیا
تو نے نذرِ وطن جان و تن کر دیا نام تیرا امر اندرا ہو گیا

ہے غضب آہ ہوئے چمن لٹ گئی زینتِ تاجِ گنگ و جمن لٹ گئی
عظمتِ سرزمینِ وطن لٹ گئی راجدھانی میں خونِ وفا ہو گیا

لٹ گیا لٹ گیا دل کا چین و سکوں لوٹ کر رہ گیا مشرقوں کا فسوں
سن کے ہر آنکھ رونے لگی اشکِ خوں گھر مسرت کا ماتم کدہ ہو گیا

حافظا آنکھیں ہالہ کی بھر آگئیں حسرتیں ہند کی غم سے تھرا گئیں
بجھ گئی شمع تاریکیاں چھا گئیں، حادثہ یہ عجب رونما ہو گیا

علی سردار جعفری

قافلے

جس طرح ہر لمحے اور ہر جگہ اندرا گاندھی کا نام آئے گا اسی طرح بعض ایسی باتیں بھی بار بار دہرائی جائیں گی جن کا دوہرایا جانا ضروری ہے، اور میں بھی بعض ایسی باتیں کہونگا جو میں اس سے پہلے ٹیلی ویژن اور فلم ڈویژن پر کہہ چکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اب اندرا کا نام شکتی، شانتی اور قربانی ان تین لفظوں کا ہم معنی ہو گیا ہے، انھوں نے اپنی جان جس بہادری سے دی ہے اور جس مقصد کیلئے دی ہے وہ اتنا بڑا مقصد ہے جس کو ہم صرف ہندوستانیوں کا نہیں بلکہ سارے عالم انسانیت کا مقصد کہہ سکتے ہیں، ان کو برابر اس بات کا خطرہ تھا اور اندیشہ تھا کہ ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائیگا۔ لیکن انھوں نے کبھی کسی خوف کا اظہار نہیں کیا اور کبھی انھوں نے اس خیال کو ظاہر نہیں کیا کہ وہ موت سے ڈرتی ہیں ان کے سامنے ایک نصب العین تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے، ہندوستان نے جو اپنی آزادی حاصل کی ہے وہ آزادی برقرار رہے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کا امن برقرار رہے اور ساری دنیا میں آزادی کی روشنی پھیلے لیکن ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں دو طرح کی قوتیں ہوتی ہیں تاریکی کی قوتیں اور روشنی کی قوتیں اور ان کی کشمکش اور جدوجہد ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ اور یہ جدوجہد ہمارے یہاں آج بھی جاری ہے مجھے یقین ہے کہ فتح روشنی کی ہوگی شکست اندھیرے کی ہوگی فتح محبت کی ہوگی شکست نفرت کی ہوگی، لیکن کشمکش جاری ہے اور کبھی کبھی وہ بڑا بھیانک روپ اختیار کر لیتی ہے، اور ان میں سے اس وقت سب سے زیادہ بھیانک روپ میں جو چیز ظاہر ہوئی ہے وہ اندرا گاندھی کا قتل ہے۔

میں اس قتل کو شہادت بھی کہتا ہوں اس لیے کہ جب جان کسی اعلیٰ مقصد کے لیے دی جاتی ہے تو وہ شہادت ہوتی ہے اور کسی عام طور سے جان جاتی ہے تو ہم اس کو قتل کہتے ہیں، اندرا گاندھی کے سامنے جیسا میں نے شروع میں کہا تھا ایک نصب العین تھا اور انھوں نے اس کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی ہمیں یہ اطلاع بھی ہے کہ ہندوستان کے خلاف دنیا کے بعض حصوں میں اس لیے سازشیں ہیں کہ یہ بہت بڑا ملک ہے اور یہ ملک امن عالم کا علم بردار ہے۔ اس وقت NON-ALIGNED MOVEMENT (NAM) کا ہندوستان مرکز ہے اور جیسا کسی نے کہا غالباً پیاکے صدر نے NON-ALIGNED MOVEMENT جو ہے وہ ایک طریقہ سے یتیم ہو گیا۔ اندرا گاندھی کی اس شہادت کے بعد، اور یہ تحریک جو ہے یہ تحریک ساری انسانیت کی سربلندی کی ضامن ہے، اس لیے جب ہم آج اپنا خراج محبت اور خراج عقیدت اندرا گاندھی کو پیش کر رہے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا عہد بھی کرنا پڑے گا کہ ہم کسی نظریہ کے ہوں کسی خیال کے ہوں کسی مذہب کے ہوں کسی ملت کے ہوں ہم تشدد سے پرہیز کریں گے اور ہندوستان کے ہر رہنے والے کو اپنا بھائی سمجھیں گے ہندوستان کے ہر رہنے والے کو اس زمین پر وہی حق حاصل ہے جو ہندوؤں کو حاصل ہے جو مسلمانوں کو حاصل ہے، جو سکھوں کو حاصل ہے۔ جو عیسائیوں کو حاصل ہے ہر ایک کو یہ حق حاصل رہے گا۔ اور وقتی دیوانگی جو ہے وہ ختم ہوگی۔

ہمیں ہر ایک سے یہ کہنا ہے کہ اندرا گاندھی کے نام کو سربلند رکھنے کے لیے اور اپنی عقیدت کو ظاہر کرنے کے لیے اس وقت ہندوستان

میں امن کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے اور فسادات سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔

میں چند باتیں اندرا گاندھی کے بارے میں ایسی کہوں گا جو بہت ذاتی ہیں کہ میں پہلی بار ان سے کب ملا کیسے ملا، پہلی بار میں ان سے اس وقت ملا جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور وہ انگلستان سے واپس آئی تھیں تو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کسی جلسہ میں وہ آگئی تھیں اس وقت وہ بھی طالب علم تھیں اور کبھی کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ وہ ہندوستان کی وزیر اعظم ہوں گی اور اتنی بڑی وزیر اعظم ہوں گی کہ جن کا درجہ ساری دنیا کے بلند ترین اور عظیم ترین رہنماؤں میں ہوگا اس کے بعد میری ملاقات ان سے اس وقت ہوئی جب وہ شاستری جی کی کیبنٹ میں منسٹر بنیں براڈکاسٹنگ اور انفارمیشن کی۔ نہیں اس سے پہلے بھی ایک ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال سے چند ماہ پہلے تین مورتی نواس میں پنڈت جی کی تفریح کے لیے ایک مشاعرہ انہیں کی مرضی کے مطابق اور انہیں کی خواہش کے مطابق ہوا تھا، مجھے ابھی تک یاد ہے کہ مسز گاندھی آخری صف میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں، اور سامنے کی صف میں پنڈت جی تھے، شاستری جی تھے، ہمارے فراق گورکھپوری تھے ہم لوگ تھے کچھ شعراء تھے سامنے ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا اور ہمیں بتایا گیا تھا کہ پنڈت جی کی طبیعت اچھی نہیں ہے، آپ لوگ تھوڑا تھوڑا سا کلام سنائیں تاکہ ذرا سا ان کا دل خوش ہو اور اس کے بعد یہ محفل برخاست ہو جائے لیکن بار بار مسز گاندھی پنڈت جی کے پاس آکر کچھ کہتی تھیں اور پنڈت جی خاموشی سے کچھ جواب دیدیتے تھے، اور یہ مشاعرہ کئی گھنٹے جاری رہا! اس کے بعد میری ملاقات اس وقت ان سے ہوئی جب وہ ہماری گورنمنٹ میں آئیں اور ہندوستان کی وزیر بنیں منسٹری آف انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ میں اور ایک مشاورتی کمیٹی کے جلسہ میں ان سے ملاقات ہوئی اور اس وقت ان کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا میں اپنے بارے میں یقین سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں بالکل یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کتنی بڑی شخصیت ہے یہ ایک بیج ہے جس کے اندر ایک بہت بڑا تناور درخت چھپا ہوا ہے۔

اور شاستری جی کے انتقال کے بعد جس وقت وہ وزیر اعظم بنیں معلوم نہیں کتنے لوگوں کا خیال ان کے بارے میں کیا کیا تھا کون لوگ سمجھتے تھے کہ یہ اس ملک کو سنبھال سکیں گی یا نہیں سنبھال سکیں گی لیکن انھوں نے جس طریقہ سے اس ملک کو سنبھالا اور اتنے بڑے ملک کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے وہ ایک اتنا بڑا کارنامہ ہے جو ان کو ہمیشہ زندہ جاوید بنا دے گا۔

اس سے پہلے ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے نام کے ساتھ ایک تیسرا نام اندرا گاندھی کا بھی شامل ہو جائے گا۔ لیکن اب یقیناً یہ تیسرا نام ہے جو اس میں شامل ہو گیا ہے ہندوستان کے اس عہد کی عظیم ترین شخصیتوں میں اس کے بعد ان سے ایک ایسی ملاقات ہوئی جو اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس کا رشتہ اردو کے مسئلہ سے ہے۔ میں پنڈت آنند نرائن ملا کے ساتھ ان کے پاس ۱۹۷۴ء میں گیا تھا اور اس وقت ہم اردو کے معاملات پر ان سے بات کر رہے تھے تو انھوں نے ساری ہمدردیاں اردو کے بارے میں دکھائیں، ساری باتیں کہیں اور یہ بھی کہا کہ میں تو خود اردو بولتی ہوں میرے گھر میں بھی اردو بولی جاتی ہے۔ اردو بڑی خوبصورت زبان ہے۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن حالات کا بھی انھوں نے ذکر کیا اور ہمیں ان حالات کی پیچیدگی کا اندازہ ہے جو ہمارے ملک میں تقسیم کے بعد پیدا ہوئے۔ اور ابھی ابھی سوویت یونین سے ایک اسکالر آئی تھی اس نے مجھے بہت دلچسپ واقعہ سنایا شریمتی گاندھی سے ملنے کا اور غالباً میں پہلی بار اس واقعہ کو بیان کر رہا ہوں کہ جب وہ ان سے ملنے کے لیے گئی اس کا نام "اناسووروا" ہے جو اردو پر ریسرچ کر رہی ہے اور بہت اچھی اردو بولتی ہے تو شریمتی گاندھی اس سے انگریزی میں باتیں کر رہی تھیں، لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ "اناسووروا" اردو کی طالب علم ہے اور اردو میں تحقیق کرنے آئی ہے تو شریمتی گاندھی نے انگریزی بولنا بند کر دی اور اس سے ہنس کر کہا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا میں تو اردو بول لیتی ہوں اور اردو سمجھتی بھی ہوں اور اردو تو ہماری زبان ہے اور اس سے آخر وقت تک وہ بیٹھ کر اردو میں باتیں کرتی رہیں۔

میں شریمتی گاندھی کے پاس ایک بار گیا اس خیال سے جس کے بارے میں سب لوگ مشکوک تھے کہ علامہ اقبال کا سو سالہ جشن منایا جائے۔ جشن ہم نے ۱۹۷۷ء میں منایا یہ بات ۱۹۷۶ء یا ۱۹۷۵ء کی ہے علی گڑھ کے سیمینار سے میں آیا اور میں نے مسز گاندھی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میں ان کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ ہم لوگ علامہ اقبال کا صد سالہ جشن منانا چاہتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کو ترانۂ ہندی دیا ہے تو انھوں نے بغیر ذرا سا وقت لیے کہا کہ بہت اچھا خیال ہے ضرور جشن منایئے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے پاس یہ درخواست لیکر آیا ہوں کہ آپ اس کی سرپرستی قبول کر لیجئے تو ہنس کر کہنے لگیں کہ تمہیں سرپرستی کے چکر میں اور جھگڑے میں مجھے نہ ڈالیے لیکن حکومت پوری امداد کرے گی اور آپ جشن کی تیاریاں کیجئے "

ڈاکٹر نور الحسن اس وقت وزیر تعلیم تھے، اور وزارت تعلیم کے ذریعہ وہ ساری امداد ملی اور یہ کہ جو میں اس کا سیکریٹری تھا اور اب بھی ہوں مجھے کسی قسم کی کسی موقع پر کوئی دشواری نہیں ہوئی اور ہندوستان نے نہایت شاندار بین اقوامی سیمینار اقبال پر کیا نومبر ۱۹۷۷ء میں اور یہ سیمینار پاکستان کے اقبال سیمینار سے پہلے ہوا تھا اور یہ بہت بڑا سیمینار تھا لیکن یہ سیمینار جس وقت ہوا ہے اس وقت اندرا گاندھی کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور جنتا پارٹی کی حکومت تھی لیکن جنتا پارٹی کی اس حکومت کے زمانے میں ہم نے جس روپیہ سے یہ سیمینار کیا وہ روپیہ تھا جس کی گرانٹ ہم کو شریمتی اندرا گاندھی کے زمانے میں ملی تھی، ڈاکٹر نور الحسن کی وزارت سے ملی تھی اور یہ شاندار جشن ہو گیا ایک فلم بھی بنی اس کی بھی منظوری اسی زمانے میں ہوئی تھی اور وہ فلم اقبال پر ہندوستان و پاکستان میں سب سے اچھی فلم ہے اور اس کا پہلا پرنٹ جنرل ضیاء الحق صاحب کو ہندوستان کی حکومت کی جانب سے پیش بھی کیا گیا تھا، جو وہاں موجود ہے اور اس کے بعد جب ان کی حکومت واپس آگئی اتفاق ہے یہ کہ اقبال کی COMMEMORATIVE والیوم جو اس سیمینار کے معاملات پر مشتمل ہے اس کے جشن اجراء کی بات تھی تو میں نے شریمتی گاندھی کو خط لکھا کہ میری خواہش یہ ہے اور ہماری پوری کمیٹی کی خواہش ہے کہ آپ اس کتاب کا اجراء فرما دیں تو اس کا جواب میرے پاس آیا غالباً دھون صاحب نے جواب دیا تھا کہ فلاں تاریخ کو صبح کے وقت اسی گھر میں ۱۲ اکبر روڈ، نمبر ۱ صفدر جنگ پر ہے شریمتی گاندھی اس کا اجراء کریں گی میں یہاں سے دہلی گیا اور میں دھون صاحب سے ملا میں ان کو ایک کتاب پیش کی اور میں نے ایک کتاب شریمتی گاندھی کے پاس بھی بھیجی اور میں نے ان سے کہا کہ صاحب اس قسم کا اجراء جو ہے میں نہیں چاہتا میں اس سے بڑا چاہتا ہوں انھوں نے پوچھا کیا ہے؟ تو میں نے ان سے کہا دیکھئے یہ ہم ایک بڑے ہال میں کریں گے جس میں ہم پاکستان کے سفیر کو بھی مدعو کریں گے سوویت سفیر کو بھی مدعو کریں گے اور ہزار دو ہزار آدمیوں کو بھی مدعو کریں گے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کا اجراء وہاں ہو تو انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں تو ہم کو شریمتی گاندھی سے پوچھنا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ پوچھ لیجئے گا پوچھ کر مجھے بتا دیجئے گا لیکن دوسرے دن صبح جو عام وقت ہے ان سے ملنے کا لوگوں کا میں صبح ۸ بجے وہاں چلا گیا اور جب وہ شریمتی گاندھی آئیں تو مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں کہ کیا بات ہے، تو میں نے کہا کہ آپ نے اس کے اجراء کا جو وقت دیا ہے وہ ہمارے لیے مناسب نہیں ہے تو وہ کہنے لگیں کون سا وقت چاہیئے، میں نے ان سے کہا کہ مجھ کو تو ایک گھنٹہ چاہیئے اور وہ بھی یہاں اکبر روڈ پر نہیں بلکہ ہال میں بڑے ہال میں چاہیے تو وہ کہنے لگیں کہ کتنا وقت لگے گا میں نے کہا وقت تو مجھے ایک گھنٹہ چاہیئے، آپ آدھا گھنٹہ دیدیں تو وہ بھی بہت ہے۔ تو کہنے لگیں کہ آپ اتنا بڑا کیوں کرنا چاہتے ہیں میں نے کہا کہ میں اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جشن کی جتنی بھی تقریبات ہوئی ہیں سب نہایت شاندار تقریبات تھیں اور اتفاق ہے جس جشن کو آپ نے جس کی ابتدا کی تھی اس کی انتہا اگر آپ کے ہاتھ سے ہو تو بہت اچھی بات ہے اور وہ بھی اتنا ہی شاندار ہونا چاہیئے تو ہنس پڑیں اور کہنے لگیں کہ اچھا فلاں تاریخ میں آپ کو دیتی ہوں' اور اس کے دوسرے دن میرے پاس کس کا ٹیلیفون آیا مجھ کو یاد نہیں انھوں نے کہا کہ ابھی میری شریمتی گاندھی سے ملاقات نہیں ہو سکی ہے، تو میں نے ان سے کہا کہ میں کل گیٹ کریش کر چکا ہوں اور میں ان سے وقت لے آیا ہوں' یہ وقت ہے اور چنانچہ وہ اس جشن میں آئیں اور انھوں نے نہایت

(باقی ص ۲۱۹ پر)

محمد رضا انصاری
چیرمین اترپردیش اردو اکاڈمی

دل نشیں یادیں

ایک اخباری رپورٹر کو ممتاز شخصیتوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے مواقع ملا ہی کرتے ہیں، میں بھی ایک اردو روزنامہ کا اسٹاف رپورٹر تھا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملنے کے ایسے بہت سے مواقع ملے لیکن ان کا ذکر نہیں کرنا ہے بلکہ ان یادوں کو دہرانا ہے جو ہمیشہ یاد رہیں گی۔

جب پنڈت جواہرلال نہرو کی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو وفات ہوئی تو خاندانی مراسم کے پیش نظر میں مسز گاندھی کے پاس اوّلین فرصت میں بذاتِ خود تعزیت کے لیے جانا چاہتا تھا مگر فرائضِ منصبی نے ان دنوں موقع نہیں دیا، ایک مہینے کے بعد، ۴ جون کو بغرض تعزیت مسز گاندھی کے پاس جانے کا وقت نکالا اور احتیاطاً ان کے پرسنل سکریٹری کو اس سلسلے میں خط بھی لکھ دیا۔

دلّی روانہ ہونے سے پانچ چھ روز قبل یہ خبر پڑھی کہ مسز گاندھی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے اور انھیں ڈاکٹروں نے ایک ہفتے کا مکمل آرام بتایا ہے، یہ خیال کرکے کہ دلّی پہنچنے کے بعد دو ایک روز "ہفتہ" گزر جانے کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے دلّی روانہ ہوگیا۔

ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہونے میں میرا پہلا نمبر رہا۔ مسز گاندھی بھی اپنے گھرانے سے ہمارے خاندانی مراسم کے بارے میں جانتی تھیں۔ میرے دادا میاں مولانا محمد سلامت اللہ فرنگی محلی مرحوم ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہرلال نہرو کے ساتھ مقید رہے تھے اس کے بعد بھی موتی لال جی اور جواہرلال جی کا آنا جانا رہا تھا۔

مسز گاندھی سے ملاقات تین مورتی ہاؤس میں ہوئی تعزیت کے کلمات پر مسز گاندھی کے دو ایک آنسو نکل پڑے، یوں وہ ہر طرح اپنے کو سنبھالے رہیں اور خاموش بھی۔ اس اثنا میں شری گیندا سنگھ (سابق ریاستی وزیر، جو اس وقت حزب مخالف میں تھے) اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تعزیت کے لیے آگئے۔ دلّی میں میرے اخبار نویس احباب اس ملاقات کے بعد مسز گاندھی کے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے اس لیے کہ یہ "ایک ہفتہ" کے وقفے کے بعد پہلی تھی، اپنے اخبار نویس ساتھی شری گریش ماتھر سے میں نے خواہش کی کہ اخباروں میں اس نجی ملاقات کا حوالہ نہ آئے۔ ان کے کہنے سے میری خواہش دوستوں نے پوری کر دی، ورنہ "مسز گاندھی کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ملاقات" کی سرخی سے خبر تیار ہو چکی تھی۔

شاستری وزارت میں مسز گاندھی وزیر اطلاعات و نشریات بنیں، اس کے بعد ہی ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ ہوئی، اکتوبر کو جب جنگ ختم چکی تھی ایک ضرورت سے دلّی جانا ہوا اور اپنی ایک کتاب (اردو میں) مسز گاندھی کو پیش کرنے ان کی سرکاری قیام گاہ پر وقت لے کر گیا، اور لوگ بھی موجود تھے، دوران جنگ میں انھوں نے پچھب (کشمیر) کے علاقے میں تقریر کرتے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں ایک بات کہی تھی۔ الفاظ اس وقت یاد تھے مفہوم یہ تھا کہ اس جنگ کی وجہ سے ہندستانی مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے اعتماد اور بھائی بہن خو سرحد کے

اس طرف ہیں ان سے کٹ گئے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم بھائی بہن اور رشتہ دار بن کر ان کو اس کمی کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کی اس تقریر کا حوالہ دے کر میں نے ان سے کہا کہ " اس وقت اس طرح کی تسلی کی ضرورت بھی ہے اور آپ ہی کو اس کا احساس ہوا" میری اردو کتاب ہاتھ میں لیے تھیں اس کی طرف متوجہ ہو کر انھوں نے کہا:

" میں نے جیل میں اردو پڑھی تھی جو استانی اردو پڑھاتی تھی وہ جیل کی نوکر تھی اس کا کام تھا اُن پڑھ قیدی عورتوں کے نام اردو میں آنے والے خطوں کو پڑھ کر سنانا اور ان کے بتائے ہوئے جوابات اردو میں لکھنا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ " اردو استانی" خود ہی اردو نہیں جانتی تھی۔ مگر نوکر تھی اردو کے لیے۔ اس لئے مجھے اردو نہ آسکی، اردو میں دستخط کر لینے کے علاوہ "۔

۱۹۶۹ء کے درمیانی مدت کے الیکشن میں لکھنؤ کے مغربی حلقہ کی اسمبلی نشست کے لیے کانگرس نے مجھے نامزد کیا۔ اس وقت وزیر اعلیٰ سی۔ بی گپتا تھے اور وزیر اعظم مسز گاندھی، وہ پارٹی کے کام سے لکھنؤ آئیں۔ گپتا جی نے ڈنر پر ان کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور لکھنؤ کے شہری حلقہ ہائے انتخاب سے نامزد اشخاص کو بھی، سات آٹھ مہمان اور تھے، جن میں پنڈت اوما شنکر دکشت (موجودہ گورنر مغربی بنگال) بھی شامل تھے۔ کوئی سیاسی یا تنظیمی گفتگو نہیں ہو رہی تھی مگر میں نے مسز گاندھی جی سے کہا کہ " مغربی حلقۂ انتخاب کے لیے مجھے نامزد کیا گیا ہے جہاں سے سید علی ظہیر الیکشن لڑتے تھے"۔

انھوں نے کہا: اچھی سیٹ ہے یہ، پریشان نہ ہونا چاہیے"

اس کے بعد جب وہ یو۔ پی کے انتخابی دورے پر آئیں تو لکھنؤ شہر میں ان کی بس ایک پبلک تقریر صدر حلقۂ انتخاب میں رکھی گئی تھی، میں نے کوئی پیروی نہیں کی مگر نہ معلوم کیسے مغربی حلقے میں بھی مسز گاندھی کی پبلک تقریر کا انتظام ہوا۔ ان کے پاس وقت کم تھا وہ لکھنؤ سے دوسرے دن صبح موٹر کے ذریعہ ہردوئی روڈ سے کاکوری سندیلہ اور اس کے آگے جانے والی تھیں، صبح ۹ بجے ان کی دوسری پبلک تقریر کو نیشور کے چوراہے پر ہوئی جو مغربی حلقۂ انتخاب میں ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ میرے بال بچوں سے بھی ملیں جو جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

۱۹۸۰ء میں جب وہ وزیر اعظم نہیں تھیں مگر ابھی وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ۱۲ صفدر جنگ روڈ سے منتقل نہیں ہوئی تھیں ان کے پاس جانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی، ۹ بجے صبح ۱۲ صفدر جنگ روڈ پہنچا، دیکھا کہ مردوں اور عورتوں کے جتھے پارٹی کے جھنڈے لیے جوق در جوق ان کے پاس اظہار وفاداری کے لیے آرہے ہیں، الگ ملاقات کا موقع نہیں تھا، وہیں شری رام چندر ویکل (سابق وزیر اتر پردیش) مل گئے، وہ مجھے لکھنؤ سے جانتے تھے، مسز گاندھی نے ایک شامیانے کے نیچے مجمع کو خطاب کیا، ان کی اس مختصر تقریر میں شکست سے پیدا ہونے والی پریشانی کا دُور دُور پتہ نہ تھا، حوصلہ افزا باتیں، عزم و یقین کے ساتھ ان کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

تقریر کے بعد وہ پورٹیکو میں آکر کچھ دیر ٹھہریں، وہاں جا کر میں نے صاحب سلامت کی زیادہ کچھ کہنا اس وقت مشکل نظر آرہا تھا۔

ان سے آخری ملاقات ۲ مارچ ۱۹۸۴ء کو ۸ ½ بجے صبح ہوئی۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے، جو ان سے لکھنؤ میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام مجوزہ " آل انڈیا اردو اکاڈمیز کانفرنس" کے افتتاح کے لیے تاریخ طے کرنے دلی گیا تھا۔ مقررہ وقت پر وفد کے اراکین ۱ صفدر جنگ روڈ پر پہنچ گئے تھوڑی دیر حفاظتی عملے کے دفتر میں بیٹھ کر اطلاع ملی کہ ۱ اکبر روڈ میں ملاقات ہوگی۔ ۱ اکبر روڈ، ۱ صفدر جنگ روڈ سے ملحق ہے۔

ملاقات پندرہ منٹ رہی۔ دوسرے اراکین وفد بیگم حامدہ حبیب اللہ (صدر اتر پردیش اردو اکاڈمی) شری رام لعل

(وائس چیرمین) جناب صباح الدین عمر اور سید اطہر نبی (ممبران مجلس انتظامیہ) تھے۔

اردو کے موضوع پر مختصر گفتگو کے بعد مسز گاندھی نے پنجاب اور ریاست جموں و کشمیر کے متعلق گفتگو شروع کر دی، قوم دشمن اور غیر ملکی عناصر کی خطرناک سرگرمیوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ حالات بہت تشویشناک ہو چکے ہیں، پنجاب کی ہندو آبادی اب دیہات چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہی ہے یہ بہت خطرناک صورتِ حال ہے کشمیر میں قوم دشمن اور غیر ملکی عناصر ہمیشہ کچھ نہ کچھ رہے لیکن شیخ عبداللہ کے زمانے میں وہ سر نہیں اٹھا سکے تھے۔

پھر حالات کی خطرناکی کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا اور انھوں نے فرقہ وارانہ جارحیت کی حالیہ سنگینی کو "قتلِ عام" کے اندیشے تک پہنچتے بتایا اور کہا "خیر، اس کا پہلا شکار تو میں خود ہوں گی" اور یہ جملہ ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے پر خوف و ہراس کی ادنیٰ سی بھی جھلک نہ تھی۔ ۳۱ اکتوبر کو وہ کچھ پیش آ گیا، ملک و قوم کی خاطر جس کا سامنا کرنے میں انھیں ذرا بھی پس و پیش کبھی نہ تھا۔

محبت سرفروشی، جاں سپاری
محبت میں خیالِ پیش و پس کیا

اندرا گاندھی اور سائنس: ۱۶۹ کا بقیہ

بھاری وزن والے سیاروں کو ۱۹۸۸ تک خلا میں بھیج دینے کا نقشہ بھی انکے سامنے تھا۔

ہندستان کی ترقی کے لیے پنڈت نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے گرانقدر اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں برحال ہی میں شریمتی اندرا گاندھی کی فکر نے جو نقشہ اور منصوبہ بنایا تھا وہ ہمارا اثاثہ ہے۔

اس نازک گھڑی میں ہم سب کو قومی استحکام کے لیے کام کرنا ہے قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہے سائنسی مزاج سے بھی ملک میں اتحاد کی لہر پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ عوام کے مفاد میں بھی سائنس کا استعمال ضروری ہے سائنسدانوں کو اس سمت منہمک رہنا چاہیے خواہ وہ کسی خطہ کے ہوں ملک کی فلاح کے لیے سرگرم عمل رہنا ہی شریمتی اندرا گاندھی کے تئیں سچا خراجِ عقیدت ہوگا۔

سرخ چنار: صفحہ ۱۸۲ کا بقیہ

چنار پر تب قدرت مہربان ہوتی ہے۔ اس میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ پتیاں باہر منھ نکالنے لگتی ہیں ان میں سے کچھ نرم و نازک پتیاں زمین پر گرتی رہتی ہیں جنھیں چھوٹی بچیاں اکر چنتی ہیں۔ ان سے مالا بناکر بالوں میں لگاتی ہیں گلے میں ڈالتی ہیں اور کانوں میں آویزوں کی طرح پہنتی ہیں۔

مگر یہ سب کچھ موسمِ بہار میں ہوتا ہے خزاں میں نہیں۔ اور چنار کا مقدر خزاں ہے جس کے لئے مارک ٹوین نے کہا تھا — جنت میں صرف ایک موسم رہتا ہے اور وہ ہے خزاں۔

کاش مارک ٹوین نے چنار دیکھا ہوتا۔ ایسا ہی چنار اندرا گاندھی تھیں جو ۳۱ اکتوبر کو اس دنیا کو خیرباد کہہ گئیں۔ گولیوں نے انھیں سرخ لباس پہنا دیا تھا۔ چنار بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

سنیل شاستری
وزیر برقیات اترپردیش

ترجمہ: سہیل احمد

یادوں کا ورثہ

تحریک آزادی کے زمانے سے ہی نہرو خاندان سے شاستری خاندان کے بڑے گہرے اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد آنجہانی لال بہادر شاستری جی جب مرکز میں ریلوے وزیر تھے اور اس وقت میں کافی چھوٹا تھا، وقتاً فوقتاً وزیر اعظم شری نہرو سے ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ تین مورتی ہاؤس جایا کرتے تھے اس وقت میں بھی چاچا نہرو کو دیکھنے کی خواہش کو دبا نہ پاتا تھا اور بابو جی کے ساتھ جانے کی ضد کرتا تھا۔ جس میں کبھی کامیاب ہو جاتا اور کبھی ناکام۔ اس طرح انھیں دیکھنے کی خواہش ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ وہاں اندرا جی کے درشن بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ان سے متعلق میری یہی پہلی یاد ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کچھ اور حادثات رونما ہوئے جن کے باعث میں ان سے کچھ اور زیادہ اپنائیت اور قربت محسوس کرنے لگا۔ ایسا ہی ایک حادثہ تھا بابو جی (میرے والد) کو دل کا دورہ پڑنے کا۔ بابو جی اس وقت ریلوے کے وزیر تھے اور الہ آباد حلقہ کا دورہ کر رہے تھے کہ اچانک انھیں دل کا دورہ پڑ گیا اور ان کو الہ آباد کے اسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع وزیر اعظم کی رہائش گاہ پہنچی اور آنجہانی پنڈت نہرو جی نے خود اندرا جی کو ہم لوگوں کے مکان اور موتی لال نہرو پلیس پر بابو جی کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع دینے کے لیے بھیجا تھا۔

اندرا جی بہت صبح ہی ہمارے گھر آ گئی تھیں۔ میری ماں تو دورے کے وقت بابو جی کے ساتھ ہی تھیں۔ بس گھر میں میں اور دوسرے بھائی بہن موجود تھے۔ جن میں سے کچھ تو بہت چھوٹے تھے۔ اندرا جی سے بتا جی کا حال سن کر ہم لوگوں کے تو ہوش اڑ گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

میری دونوں بڑی بہنیں کسُم دیدی اور سُمن دیدی تو سسک سسک کر رونے لگیں اور ہم بچوں کے بھی آنسو بہنے لگے۔ اندرا جی نے ہم لوگوں کو ڈھارس بندھائی اور چپ کرایا اور وہیں سے پرائم منسٹر ہاؤس فون کر کے نہرو جی سے کچھ مشورہ کیا اور ہمیں بتایا کہ ایک خصوصی جہاز کا بندوبست ہو گیا ہے اور اسی وقت ہم سب لوگ الہ آباد جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس طرح ہم لوگ بابو جی کے پاس پہنچ سکے۔ یہ تھا ان کے ہمدردانہ مزاج کا ایک رخ اور اس بات کی مثال کہ وہ کس طرح دوسروں کا خیال رکھتی تھیں۔

یہ تو تھا میرے بچپن کا ایک واقعہ۔ اس کے بعد میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا وقتاً فوقتاً عام اور خاص حالات میں ان سے ملنے کے متعدد مواقع حاصل ہوتے رہے اور ہر ملاقات کے بعد میرے دل میں یہ جذبہ گھر کرتا گیا کہ بابو جی کے ساتھ ساتھ میری محافظ، رہنما اور خیر خواہ اندرا جی بھی ہیں۔

مجھے ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا وہ منحوس دن بھی یاد آ رہا ہے جب نہرو جی ہم سب سے جدا ہوئے تھے۔ یہ خبر سن کر شاستری خاندان ساکت و حیران رہ گیا تھا اور ہم لوگ بھاگم بھاگ

آنجہانی نہرو جی کے آخری درشن کے لیے پہنچے تھے میں اس وقت بھی بچہ ہی تھا اور اپنی عقل کے مطابق اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنے غمگین احساسات کا اظہار اندرا جی سے کیا تھا۔ اس حادثہ سے ہم لوگ اتنا زیادہ متاثر ہوئے تھے کہ تین دن تک ہمارے گھر میں کھانا نہیں بنا تھا۔ سوگ ختم ہونے تک ہم لوگ مسلسل ان کے گھر جاتے رہے تھے۔

بعد میں بابو جی وزیراعظم ہوئے تو بڑی منت سماجت سے انھوں نے اندرا جی کو اپنی وزارت میں شامل کیا۔ بدقسمتی سے زمانہ کے ہاتھوں نے ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو بابو جی کو ہم سے چھین لیا ۱۱ جنوری کی صبح سب سے پہلے تعزیت کے لیے آنے والوں میں اندرا جی تھیں۔ ہم لوگوں کو تو ہوش ہی نہیں تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو رہا ہے؟ اندرا جی نے نہ صرف ہم لوگوں کو دلاسہ دیا بلکہ آخری رسوم ادا کرنے سے متعلق بندوبست میں بھی بڑی مدد کی۔

بابو جی کی آخری رسوم کی ادائیگی کے مقام کا انتخاب بھی انھوں نے ہی کیا تھا اور کہا تھا کہ شاستری جی زندگی بھر نہرو جی کے بہت قریب رہے۔ اسلیے انھیں اب موت کے بعد بھی ان کے قریب ہی جگہ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ شانتی بن کے قریب ہی ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں اور اس کا نام وجے گھاٹ رکھا گیا۔

بابو جی کی آخری رسومات کی ادائیگی سے لیکر شانتی یگیہ ہونے تک خاندان کے ایک فرد کی طرح انھوں نے سارے بندوبست کرائے اور ہمیں برابر تسلی دیتی رہیں۔ اس وقت ہم سب لوگ اس بات پر متفق اور ایک رائے ہو کر سوچتے رہے کہ اندرا جی ہماری وزیراعظم کی حیثیت سے اس ملک کی باگ ڈور سنبھالیں۔

عوام کے ساتھ ساتھ ہم سب کی بھی یہ خواہش پوری ہوئی اور ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو اندرا جی کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ذریعہ لیڈر منتخب ہوئیں اور انھوں نے وزیراعظم کے عہدہ کا حلف لیا وزیراعظم بنتے پر وہ اسی دن اماں (شریمتی للیتا شاستری) کے پاس وزیراعظم کے بطور آشیرواد لینے آئی تھیں۔ اماں نے ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے ہمیشہ کامیاب و کامران رہنے کا آشیرواد دیا تھا

اس کے بعد دو تین سال تک میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے میں لگا رہا اور پھر آیا ۱۹۶۹ء کا تاریخی سال جب صدر کی حیثیت سے شری وی۔ وی گری کو منتخب کیے جانے کے سوال پر کانگریس کی تقسیم ہوئی۔ میں اس وقت ۲۰ سال کا ایک نوجوان تھا اور سیاست میں نہ ہوتے ہوئے بھی محسوس کر رہا تھا کہ ملک کی سیاسی فضا میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور ملک کو اندرا جی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سیاست کے میدان میں کسی طرح کا دخل نہ ہونے کے باوجود ایک فرض شناس شہری کی حیثیت سے میں یہ زور دیتا رہا کہ اندرا جی کی حمایت کی جائے۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء کے تاریخی انتخابات آئے جس میں اندرا جی نے مقبولیت کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ کر حیران کن کامیابی حاصل کی تھی۔ اس سے قبل میں ان سے ملا تھا اور الیکشن پبلسٹی کے چند پوسٹر انھیں دکھائے جنھیں میں نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ اندرا جی نے وہ پوسٹر دیکھ کر خود پاس کیے تھے! اسی دوران میری ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میرا حوصلہ دیکھ کر ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا "تمہاری عمر کیا ہے" یہ ان کا پہلا اشارہ تھا سرگرم سیاست میں مجھے داخلہ دلانے کا۔ میری عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔ اس کے بعد میں ان کے خیالات اور پالیسی پر غور کرتا رہا اور ان کی پبلسٹی کرتا رہا۔ اسی وقت میں نے ایک سوونیر "امپیکٹ آف سوشیو اکنامکس ان چینج آف انڈیا" کے نام سے شائع کیا اور انھیں ان کی یوم پیدائش کے موقع پر پیش کیا۔

سال ۷۶-۱۹۷۵ء میں میں ان سے پھر ملا تھا اور اپنے دل کی بات ان سے کہی تھی کہ آپ کی رہنمائی اور قیادت میں ملک کی ترقی کے لیے کچھ کام کرنا چاہتا ہوں اس وقت انتخابات نزدیک تھے اور مجھے بھی لوک سبھا کی سیٹ دینے پر غور کیا جا رہا تھا لیکن سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے وہ نہ ہو سکا۔

اسی سال اندرا جی اقتدار سے ہٹ گئی تھیں لیکن میں دلی کے قیام کے دوران ان سے برابر ملتا رہتا تھا۔ کچھ دنوں

(باقی ص ۲۴۵ پر)

شہناز حسین

ترجمہ:۔ عبدالحسیب صدیقی

اندرا گاندھی ـــ چندیادیں

یکم نومبر ۱۹۸۴ء کو میں "تین مورتی بھون" ایک ایسے عظیم انسان کو خراج عقیدت پیش کرنے گئی جس کی موت نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا دماغ ماؤف تھا اور احساسات اس الم ناک واقعہ پر سرد ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ جو لوگ ان سے محبت اور ان سے عقیدت رکھتے تھے وہ ان کے بغیر کیسے زندہ رہ سکیں گے۔

اسی مکان میں محترمہ اندرا گاندھی نے اپنی زندگی کے سولہ خوشگوار سال گزارے تھے جو پنڈت جواہرلال نہرو کی سرکاری قیام گاہ تھی۔ یہیں مجھے پہلی بار نہرو خاندان سے متعارف کرایا گیا تھا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد چیف جسٹس بیگ کو پنڈت جواہرلال نہرو نے تین مورتی بھون میں قیام کے لیے مدعو کیا تھا۔ جب ہم بذریعہ کار وہاں پہنچے تو پنڈت نہرو زینے پر کھڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس تھے اور ان کا من پسند گلاب کا پھول ان کے سینے پر لگا تھا۔ پنڈت نہرو کی محبت بھری مسکراہٹ نے میرے والد کا خیر مقدم کیا۔

جب میرے والد نے کہا کہ ہمیں اسٹیشن سے لانے کے لیے انھیں کار بھیجنے کی زحمت نہیں کرنا چاہیئے تھی تو انھوں نے جواب دیا۔ "جب میں اپنے پتا جی کے ساتھ حیدرآباد گیا تو میں آپ کے والد کا مہمان تھا۔ ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ دہلی آئیں اور میرے یہاں قیام نہ کریں۔" اسے اردو میں "وضعداری" کہتے ہیں۔ وہ ناقابل فراموش تہذیب کے مالک تھے اور تیس سال کا پرانا قرضہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

پنڈت نہرو کی یادداشت بہت تیز تھی۔ انھوں نے حیدرآباد میں اپنے قیام کی باتیں تفصیل سے بیان کیں اور ہمیں بتایا کہ وہ خاطر مدارات کے کتنے ممنون تھے۔ انھوں نے کہا "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پتا جی ایک انقلابی تھے۔ جب وہ اور میں حیدرآباد پہنچے تو آپ کے والد چیف جسٹس مرزا یار جنگ اور مسز سروجنی نائیڈو ہمارا خیر مقدم کرنے کے لیے وہاں موجود تھیں۔ ہمیں آپ کے مہمان کی حیثیت سے آپ کے گھر لے جایا گیا۔"

"جب برطانی ریزیڈنٹ گورنر نے سنا کہ آپ کے والد ہمارے میزبان ہیں تو اس نے نظام کو لکھا کہ چیف جسٹس کو اپنا استعفیٰ پیش کر دینا چاہیئے کیونکہ وہ انقلابیوں کو اپنے مکان پر رکھ رہے ہیں۔ نظام نے آپ کے والد سے صورت حال کی وضاحت کرنے کے لیے کہا۔ جس پر انھوں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ ریزیڈنٹ گورنر کے اعتراض پر نظام نے کہا وہ استعفیٰ منظور نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عمر کی حد کا اطلاق چیف جسٹس مرزا یار جنگ پر نہیں ہوگا اور وہ اس وقت تک چیف جسٹس رہیں گے جب تک وہ خود مستعفی ہونا پسند نہ کریں۔ آپ کے والد وہاں اٹھائیس برس تک رہے۔ ہم جب کبھی حیدرآباد گئے انھوں نے برطانی حکمراں کے اعتراض

سکے باوجود خندہ پیشانی سے ہمارا پُر تپاک استقبال کیا۔

پنڈت جی نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ کانگریس اجلاس کا بھی ذکر کیا جہاں میرے دادا اسکریٹری تھے اور میرے والد صدر۔ مہاتما گاندھی کے کمسن خدمت گار تھے۔ مہاتما گاندھی، سر سریندر ناتھ بنرجی، امبیکا چرن مجمدار اور سروجنی نائیڈو بھی وہاں موجود تھے۔ انھیں یاد تھا کہ مرزا یار جنگ نے اجلاس میں تقریر کی تھی۔

"کیا تم یہ تصور بھی کر سکتی ہو کہ میں یہ سب بھول جاؤں گا؟" پنڈت جی نے کہا۔ تب ہمیں ان کے حکم پر ماؤنٹ بیٹن سوٹ (کمرہ) میں ٹھہرا دیا گیا۔ مجھے سنجے اور راجیو کے بارے میں اچھی طرح یاد ہے وہ بہت چھوٹے تھے۔ وہاں "بلبل" نام کا ایک گھوڑا تھا۔ جب پنڈت جی کو معلوم ہوا کہ مجھے شہسواری کا شوق ہے تو انھوں نے بلبل کو بلوایا۔ راجیو اور سنجے نے بھی گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے اصرار کیا لیکن پنڈت جی نے کہا: "بیٹا وہ مہمان ہے۔ پہلے اسے سواری کرنے دو" اور وہ دونو راضی ہو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ انھوں نے میرا تعارف اپنے داماد فیروز گاندھی سے کرایا۔ انھوں نے کہا: "میرے مقابلے میں اندرا تمھاری بہتر دیکھ بھال کرتی لیکن وہ شہر سے باہر ہے اور سماجی کام میں مصروف ہے۔ آج شام کو وہ واپس آجائے گی۔"

اپنے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ فیروز گاندھی اپنا کافی وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارتے۔ اس سلسلے میں اکثر مجھے کھڑکی کے باہر ایک جانا پہچانا منظر دیکھنے کو ملا۔ انتہائی سفید لباس میں ملبوس باپ کو اپنے بچوں کے ساتھ میں نے کھیلتا ہوا پایا۔ جب بچے گھوڑے پر سوار ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کو مضبوطی سے پکڑے رہتے۔ مجھے یاد ہے کہ فیروز گاندھی ایک دوربین انسان تھے۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر مسکراتے رہتے۔ وہ بہت کچھ راجیو سے ملتے جلتے تھے جیسے کہ راجیو آج نظر آتے ہیں۔

جس دن ہم رخصت ہو رہے تھے اس دن میں نے پہلی بار اندرا گاندھی کو دیکھا نارنجی بارڈر کی سفید ساڑی میں ملبوس تھیں۔ انھوں نے چند لمحے میری مدارات کی اس کے بعد ہم لوگ ہوائی اڈے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب پنڈت نہرو نے اندرا گاندھی کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

برسوں بعد ہم لوگ ایران سے ہندوستان آگئے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میں اس عرصہ میں مختلف بیرونی ممالک سے، جہاں میں رہی، انھیں برابر خط لکھتی رہی اور مجھے ہمیشہ اپنے خطوں کا جواب ملتا رہا اگرچہ اکثر بہت تاخیر سے۔ میں نے انھیں ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں نئی دہلی میں تقرری کی درخواست کی گئی تھی۔ بہت جلد مجھے تار کے ذریعہ جواب موصول ہو گیا اور میرے لیے وقت مقرر کر دیا گیا۔ اپنی آمد پر میں ان سے ملنے گئی۔ وہ اسی وقت بنگلور سے لوٹی تھیں۔ اپنی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود انھوں نے میرے ساتھ تقریباً نصف گھنٹہ گزارا۔ مشہور "اندرا مسکراہٹ" ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ میں مبہوت رہ گئی کہ کس طرح میری موجودگی نے انیس سال پہلے کے حقائق برق رفتاری سے تازہ کر دیے۔ وہ بھی بنگلور اجلاس کے بعد، جس کے نتیجہ میں بینکوں کو قومیانہ عمل میں آیا۔

۱۹۷۱ء میں اس ملاقات کے بعد میں ان سے اکثر و بیشتر ملی، عظیم سیاستداں اندرا گاندھی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے ساری دنیا نے ان کی مدح سرائی کی ہے ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے آنے والے سو سے زائد ملکوں کے وزرائے اعظم اور صدور نے عالمی سطح پر ان کے مرتبے اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

اندرا گاندھی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے جس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب وہ برسر اقتدار تھیں یا جب وہ اقتدار سے محروم ہو گئی تھیں اور پھر برسر اقتدار آگئیں تھیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ واقعی وہ کیا تھیں۔ ایک بار میں نے ان سے کہا تھا: "مسز گاندھی آپ ایک شریف انسان ہیں مگر اتنی محتاط اور پروقار ہیں لیکن کیا کبھی کوئی جان سکے گا کہ واقعی آپ کیا ہیں" وہ مسکرائیں اور کہا کہ "جو لوگ جاننا چاہتے ہیں وہ خود جاننے کی کوشش کریں گے۔"

مجھے یاد ہے کہ میں ایک دن اُن سے ملنے ۱۲ ولنگڈن کریسنٹ گئی۔ انھوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم کتنا خوبصورت سبز لباس پہنے ہوئے ہو۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ جنتا پارٹی کو اقتدار سے محروم کرنے سے قبل الیکشن میں غیر معمولی طور پر مصروف تھیں۔ ایسے موقعوں پر بھی وہ رنگوں کا ادراک کر سکتی تھیں۔

میں نے دوبارہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر ملاقات کی۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کیا لیکن شادی سے کچھ پہلے ہی انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھوں نے رسمی طور پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنے کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی لیکن ولنگڈن کریسنٹ سے ایک پیغام آیا کہ وہ جیل سے ایسا کرنے سے مجبور ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی گرفتاری کے احکامات میں ایک خامی تھی اور انھوں نے دفعتاً اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میں ان کی حیران کن آمد کو نہیں بھول سکتی۔

جس لمحہ ان کی کار پہنچی اور وہ اس سے اتریں تو وہاں موجود مجمع انھیں حیرت سے تکتا ہی رہ گیا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے تک رکیں۔ محترمہ اندرا گاندھی میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

ایک بار میں ان سے اپنی کتاب پر "پیش لفظ" لکھوانے کے لیے ۱۔ اکبر روڈ گئی۔ زبردست بھیڑ تھی اور ان سے ملاقات کرنے کے لیے وقت بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ میں مجمع میں ہی کھڑی تھی جب وہ جانے لگیں۔ انھوں نے بھیڑ میں مجھے پہچان لیا۔ انھوں نے مجھے اشارہ سے بلایا۔ میں ان کی طرف لپکی۔ انھوں نے کہا "تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔۔ گھر کیوں نہیں آئیں؟" میں نے انھیں بتایا۔۔ "میں جلدی میں تھی، اس کے علاوہ جب بھی میں آتی ہوں میری خوب تلاشی لی جاتی ہے جیسے میں کوئی مشتبہ شخصیت ہوں"۔ وہ مسکرائیں اور کہا "نہیں مشتبہ تو نہیں لگتی ہو، میرا خیال ہے کہ تم۔۔" وہ ذرا ٹھہریں، مسکرائیں اور کہا "ہاں۔۔ میرا خیال ہے تم کچھ الگ نظر آتی ہو۔" پھر کہنے لگیں "میرے ساتھ گھر چلو، میں میز کے شیشے کے نیچے تمھارا نام لکھوا دوں گی تاکہ جب بھی تم آؤ تو ان لوگوں سے کہہ دینا کہ تمھارا نام دیکھ لیں۔"

وہ ۱۔ اکبر روڈ سے ۱۔ صفدر جنگ روڈ کی طرف بڑھیں۔ وہ اتنی تیز چل رہی تھیں کہ میرا ان کے ساتھ چل پانا مشکل ہو رہا تھا۔

اچانک انھوں نے پوچھا "تمھارا گلا کیسا ہے۔ بمبئی کے ڈاکٹروں نے کیا کہا؟" اس کے ساتھ ہی وہ ایک غیر ملکی مہمان سے ملنے کے لیے بڑھ رہی تھیں۔ وہ آدھے گھنٹے بعد واپس آئیں اور پوچھا کیا تم نے چائے پی لی ہے اور دوبارہ چل پڑیں۔ یہ ان کی خاصیت تھی کہ ملکی اور بین الاقوامی مسائل میں الجھی رہنے کے باوجود وہ نسبتاً کم اہم باتوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتی تھیں، یہ خوبی کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے اہم پروگراموں میں مشغول ہونے کے بعد بھی انھیں میری صحت کے متعلق یہ بات یاد تھی۔ میں نے بتایا کہ ڈاکٹر نے مجھے بیرون ملک علاج کے لیے جانے اور بات کم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ مسکرائیں اور کہا "مجھے تو نہیں لگتا کہ تم اس مشورہ پر عمل کر سکو گی۔" مجھے حیرت تھی کہ وہ ذرا ذرا سی باتوں کو کیسے یاد رکھتی ہیں۔ مہینوں بعد جب میں ان سے ملی تو انھوں نے دریافت کیا "لندن کے ڈاکٹروں نے کیا کہا؟" ان کا حافظہ حیرت انگیز تھا۔ ایک بار میں نے کہا "کیا آپ کو اپنے خاندان کے لیے بھی وقت مل پاتا ہے؟ اور انھوں نے جواب دیا "ہاں، میں ہمیشہ ان کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔"

ایک بار میں نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ملکی واقعات سے کس طرح باخبر رکھتی ہیں "میرے ذرائع ہیں جو مجھے حقائق سے باخبر رکھتے ہیں۔ میں ہر اس بات پر یقین نہیں کر لیتی ہوں جو میں سنتی یا پڑھتی ہوں۔" کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اتنی مشغول عورت اشا ئل بھی یاد رکھ سکتی ہے۔ ایک بار میں ان کے یہاں گئی۔ مسز فخرالدین علی احمد بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مسز گاندھی ایک تبتی پوشاک پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور کہا "یہ تیسرا رنگ بھی اسی ڈیزائن میں ہے۔" میں دراصل کروشیا کی دو ڈیزائنیں اس سے پہلے پہن چکی تھی جنھیں میں نے روم سے خریدا تھا۔ یقین نہیں آتا کہ اتنی مشغول ہستی اتنی معمولی معمولی سی باتوں کو دھیان میں رکھتی ہوگی۔

ایک میٹنگ کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مجھے جانے کے

ساتھ کیپسول لینا ہے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کہا "ارے تم نے چائے تو لی لی لیکن دوا نہیں لی!" چنانچہ انھوں نے دوبارہ چائے منگوائی۔

ایک بار وہ کہیں جانے والی تھیں کہ اچانک انھوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ میں گئی تو کہنے لگیں کہ بچے کاربٹ پارک جا رہے ہیں چنانچہ میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی وہ پوتے پوتیوں کے ساتھ کافی وقت گزارتی تھیں۔

ایک بار میں گلے کی تکلیف کی وجہ سے پریشان تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں پریشانیوں کو اپنے آپ پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیئے اور انھوں نے اس بات پر ہمیشہ عمل بھی کیا۔

نومبر ۱۹۸۳ء میں جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ اسی وقت وہ دولت مشترکہ کے ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا افتتاح کر رہی تھیں۔ میں نے انھیں ایک نوٹ لکھا — "جس شخص کی میں معتقد تھی، اس کا انتقال ہو گیا" انتہائی مشغولیت کے باوجود انھوں نے مجھے لکھا "خدا کی مصلحت کے آگے کس کا بس چلتا ہے" حال ہی میں اشوکا میں عیدملن پارٹی میں میں تقریباً ڈھائی گھنٹے ان کے ساتھ رہی۔ مجھے اسی دن لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ اپنا وہ آخری ڈنر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے ڈنر پارٹی میں پہنچے۔ وہ گیارہ بجے تک وہاں رہیں۔ یہ وہی دن تھا جب انڈین ایرلائنس کا طیارہ اغوا کر کے دوبئی لے جایا گیا تھا۔ وہ سارا دن بھاگ دوڑ میں رہیں لیکن بالکل تر و تازہ نظر آ رہی تھیں۔ ہم ان کی مرغوب غذا سے لے کر بار برا کارٹ لینڈ تک ہر موضوع پر بات کرتے رہے۔ "کیا تم نے کارٹ لینڈ کا نام نہیں سنا، جس کی وجہ سے گلابی رنگ کو شہرت حاصل ہوئی" انھوں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ انھیں میرے ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ میں اکثر انھیں لطیفے سنایا کرتی تھی اور وہ خوب ہنستی تھیں۔ ایک بار میں نے انھیں ایک لطیفہ سنایا کہ ایک شخص کسی ماہر نفسیات کے پاس گیا اور کہا "میں احساس کمتری کا شکار ہوں۔ اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں" ڈاکٹر نے بخوبی معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ "تم احساس سے تو عاری ہو تمھاری پریشانی صرف تمھاری کمتری ہے" اس چٹکلے سے وہ خوب محظوظ ہوئیں.... انھوں نے کہا "اب میں ہنسوں یا کھاؤں" میں نے کہا ..." ہنسیئے کیونکہ ہنسی میں کیلوری نہیں ہوتی بلکہ کیلوری ضائع ہی ہوتی ہے۔ اس بات پر وہ اور بھی ہنسیں۔ ان میں بذلہ سنجی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ پنڈت جی کی طرح انھیں بھی بچوں سے پیار تھا۔

میں نے اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے پوچھا "میں آپ کے لیے کیا لاؤں کیونکہ میں آج ہی جدّہ ہوتے ہوئے لندن جا رہی ہوں" "اچھا، جب تم جدّہ جا رہی ہو تو میرے لیے تسبیح لے آنا" وہ اس کے لیے کئی بار کہہ چکی تھیں۔ وہ اگرچہ مذہبی خیالات کی تھیں تاہم تنگ نظر نہیں تھیں۔ وہ سبھی مذاہب کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتی تھیں۔ ایک بار میں نے انھیں نئے سال کا کارڈ بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر ان کے پاس ہزاروں کارڈ آئے ہوں گے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کارڈوں کی تحریروں پر انھوں نے نظر ضرور ڈالی تھی۔ انھوں نے میرے کارڈ کی بڑی تعریف کی۔ اس میں لکھا تھا:

.... اگر ہمیں ساتھ ساتھ مرنا نہیں بلکہ ساتھ ساتھ زندہ رہنا ہے تو ہم میں اتنی رواداری تو ہونا ہی چاہیے جو اس سیارہ پر انسانی زندگی کی بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔

——— برٹرینڈ رسل

حُسین امین
قومی آواز لکھنؤ

اندرا گاندھی

......کچھ یادیں
......کچھ باتیں

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

اور یہ حقیقت مسز اندرا گاندھی پر اپنی تمام معنویت کے ساتھ صادق آئی جن کی اچانک المناک موت کے سانحے پر ساری دنیا عملاً رو پڑی اور ۱۴۴ ملکوں کے رہنما مدبّر اور سیاست داں مسز اندرا گاندھی کی آخری رسوم میں شرکت اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہندستان پہنچے۔

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے راقم السطور کو مسز اندرا گاندھی کو ان کے مختلف موڈ میں دیکھنے کا موقع کئی بار ملا۔ ان سے پہلی ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا تھا جب وہ صرف مسز اندرا گاندھی تھیں۔ تاریخی تین مورتی بھون میں جہاں ان کے جسد خاکی کو سوگواروں کے آخری دیدار کے لیے رکھا گیا تھا۔ رشتے میں اپنے والد ماجد اور حیثیت میں اقوام عالم کی جلیل القدر شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ رہتی تھیں اور ان کے مہمانوں کی میزبانی فرماتی تھیں۔ اور پھر اس وقت سے لے کر ۳۰ راکتوبر ۱۹۸۴ء تک جب وہ آخری بار لکھنؤ آئی تھیں ان کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ اس میں ایک وہ دور بھی شامل ہے جب وہ اقتدار اور پارلیمنٹ دونوں سے باہر تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اندرا پریہ درشنی اسم بامسمیٰ تھیں۔ ان کی شخصیت کے جادو نے بلا لحاظ مذہب و ملت اور سیاست ہر شخص کو متاثر کیا۔ بے شک وہ ہندستان کی وزیر اعظم رہیں جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور ملک کی جد و جہد آزادی میں کلیدی رول ادا کرنے والے نہرو خاندان کی دختر تھیں لیکن یہ باتیں ان کی شہرت کا باعث تھیں مقبولیت کا نہیں۔ وہ اس وقت بھی پسندیدہ اور مقبول عام شخصیت تھیں جب برسر اقتدار نہیں تھیں۔ دراصل خود ان کے اندر چھپے ہوئے جوہر تھے جن کی بدولت وہ ایک مدبر اور سیاست داں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئیں خود اپنے ملک کو اقوام عالم میں باوقار بنایا، تیسری دنیا کے ملکوں کی آواز بنیں اور بڑی طاقتوں کو اپنی طاقت کا احساس دلایا۔

مسز اندرا گاندھی کو ایک جامع اور کامل شخصیت کی مالک کہہ دینا کافی نہ ہوگا — حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کو غیر معمولی یا سائنسی اصطلاح میں فنامنل درجہ حاصل تھا۔

دنیا بھر میں مسز گاندھی کا ایک دبدبہ سا تھا۔ روس اور امریکا، فرانس اور برطانیہ اگرچہ وہ بڑی طاقتیں ہیں جن کے سامنے چھوٹے اور ترقی پذیر ملک زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرتے لیکن مسز اندرا گاندھی جب ان بڑے ملکوں کے دورے پر جاتی تھیں تو ان ملکوں کے سربراہ بہت سوچ سمجھ کر لب کشا ہوتے تھے اور پریس کانفرنسوں میں کسی اخباری نمائندے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہندستان کی شان میں گستاخانہ لہجہ اختیار کرے۔

مسز گاندھی نازک سی تھیں جمالیاتی حسن رکھتی تھیں ان میں بے ساختگی اور برجستگی تھی، مسحور کن مسکراہٹ سے مخاطب کو دیکھتی تھیں، لباس کے انتخاب میں اپنی پسند رکھتی تھیں ہوائی اڈے پر ہوں چاہے دیہات، شہر یا کسی ادارے میں ہوں۔ اپنے مخاطب

سے وہ ہمیشہ نرم لہجے میں بات کرتی تھیں۔ کسی جلسے میں جب جاتی تھیں تو ڈائس پر دوڑ کر چڑھتی تھیں۔

غریبوں، کسانوں یا طلبا کے درمیان ہوں، سیاست دانوں یا پارٹی ورکروں یا عام جلسوں سے مخاطب ہوں یا اخباری نمائندوں کے سوالوں کی بوچھار کا سامنا کر رہی ہوں، ان کے چہرے سے ذہانت کی شعائیں پھوٹا کرتی تھیں، توازن برقرار رہتا تھا، شیریں اور سریلی آواز میں اعتماد اور برجستگی رہتی تھی۔ ہر سطح کے لوگوں سے بخوبی بات کر سکتی تھیں۔ اپنے مخاطب کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پہچان کر بات کرتی تھیں۔ تھکان کے باوجود ہمیشہ بشاش نظر آتی تھیں اور اکثر حیرت انگیز یادداشت کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

مسز اندرا گاندھی ہمیشہ باخبر رہتی تھیں۔ یعنی ان کو یہ تک معلوم تھا کہ ہندستانی فلموں میں عورتوں کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی ہے۔ ان کے مذاق میں بلا کی شائستگی تھی۔

مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کا پہلا موقع اس وقت ملا تھا جب میں اور میرے دوست سید سبط رضی دسمبر ۱۹۶۱ء میں اس لیے دہلی گئے تھے کہ پنڈت جی سے درخواست کریں گے کہ جنوری ۱۹۶۲ء کے بالکل شروع جب لکھنؤ میں جو اتفاق سے ان کا آخری دورہ لکھنؤ ثابت ہوا تھا تو بچوں کی جمع کردہ وہ رقم قبول کریں جو چینی جارحیت کے خلاف جمع کی گئی تھی۔ پنڈت جی نے تو معذوری ظاہر کر دی تھی کیونکہ ان کا پروگرام بہت مصروف تھا لیکن مسز اندرا گاندھی سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی طرف سے بچوں کی تھیلی قبول کر لیں۔ چنانچہ تین مورتی بھون کے اس ریسپشن ہال میں جہاں ان کا جسد خاکی رکھا گیا تھا جب اندرا جی سے ہماری ملاقات ہوئی تو انھوں نے سولن (شملہ) جانے کا پروگرام ملتوی کر کے لکھنؤ آ کر تھیلی قبول کرنا منظور کر لیا۔ اس روز اندرا جی نے اپنے پُرمذاق ہونے کا بھرپور اور بڑے دلچسپ انداز میں ایک ثبوت دیا اور اس بات کا بھی ثبوت دیا کہ وہ ہر کام کی جزئیات میں بھی دلچسپی لیتی ہیں۔

ہوا یہ کہ ان کو سولن لے جانے کے لیے جو صاحبان آئے تھے وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز اندرا گاندھی جب ہال میں آئیں اور ہم سے مخاطب ہوئیں تو ہم سب کھڑے ہو گئے۔ اندرا جی کے بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایک نازک سی شیشے کی میز کو کھینچ لیا اور بیٹھنے ہی والی تھیں کہ سولن والے صاحبان میں سے ایک صاحب جو خاصے بھاری بھرکم تھے اپنی جگہ مسز گاندھی کو پیش کرتے ہوئے شیشے کی میز پر بیٹھنے کے لیے لپکے۔ لیکن اندرا جی نے بڑے ڈرامائی انداز میں میز پکڑ لی اور کہا "ارے ارے یہ نہ کیجیے گا آپ اپنی ہی جگہ پر بیٹھیں۔ اس میز پر بیٹھیے گا تو یہ خود بیٹھ جائے گی۔ میں ہی اس پر بیٹھ جاتی ہوں!"——

اندرا جی نے لکھنؤ آنے کی دعوت قبول کرنے کے بعد پروگرام کی تفصیلات پر تبادلہ خیال کیا اور اپنے سکریٹری سے کہہ کر لکھنؤ میں انتظامات کے لیے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس کے ذمہ داروں کے نام ایک خط بھی دلوا دیا۔

اس وقت جب اندرا جی اقتدار میں نہیں تھیں ان کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اور اس وقت یہ بھی عام طور پر محسوس کیا گیا کہ مسز گاندھی کا ظاہر اور باطن دونوں یکساں ہیں۔ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے وہ ایک انداز رکھتی ہیں۔ اندرا جی کو اس زمانے میں جب ایک بار "پریس سے ملیے" پروگرام کے تحت پریس کلب مدعو کیا گیا تو اہتمام میں نسبتاً نفاست کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ جس وقت اندرا جی وہاں پہنچیں تو ان کی شخصیت چھا گئی۔ اخباری نمائندوں سے ان کے سوال پہلے سے لے کر ٹائپ کروا کر اندرا جی کو پیش کر دیے گئے تھے۔ اور پھر جس رپورٹر نے پہلا سوال کیا تو وہ بہت طویل تھا اور کئی معاملے ایک ہی سوال میں آ گئے تھے۔ مسز اندرا گاندھی نے ایک پر مذاق مسکراہٹ کے ساتھ وہ سوال سنا اور پھر متعلقہ تحریری سوال ایک ہاتھ میں باقی سوالوں کے پرچے دوسرے ہاتھ میں لے کر کہا کہ یہی سوال اتنا مکمل ہے کہ اب میرے خیال سے دوسرے سوالوں کو پوچھنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

ہر مجمع میں مسز اندرا گاندھی کسی نہ کسی کو پہچان کر اگر دور ہوتی تھیں تو مسکرا کر سلام دعا کر لیتی تھیں۔ وہ اپنی یادداشت کے اکثر حیرت انگیز مظاہرے کرتی تھیں۔ ایک بار امو سی ہوائی اڈے پر پریس کانفرنس میں ایک مشہور صحافی بالکل پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے ان کا نام لے کر آگے آ کر بیٹھنے کو کہا۔ ہم سب کو حیرت اس بات پر خاص طور سے تھی کہ مسز گاندھی نے جو اگرچہ عجلت میں تھیں چشم زدن میں یہ دیکھ لیا کہ کون کہاں بیٹھا ہے۔ اس طرح ایک بار جب وہ وزیر اعظم نہیں تھیں ہوائی اڈے پر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی تھیں۔ ان سے ملنے کے لیے اخباری نمائندے بڑی تعداد میں پہنچ گئے تھے حالانکہ تیز بارش ہو رہی تھی۔ شرابور اخباری نمائندوں کو مسز گاندھی نے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا اور جب جانے لگیں تو کہنے لگیں کہ آپ لوگ کپڑوں کو خشک کرنے کے بعد جائیے گا اور اسی زمانے کی بات ہے۔ مسز گاندھی اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں رائے بریلی گئی ہوئی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس میں کچھ غیر ملکی اخباری نمائندے موجود تھے۔ راقم السطور بھی اس وقت پہنچا تھا۔ مسز گاندھی جس وقت ایک کمرے میں ناشتہ کر رہی تھیں ان کے ایک سکریٹری نے باہر آ کر ہم لوگوں سے کہا کہ میڈم یاد کر رہی ہیں۔ ہم لوگ اندر گئے تو اندرا جی نے انگریزی میں کہا کہ آپ لوگ بھی بریک فاسٹ میں شامل ہو جائیے۔ اس روز سخت سردی اور بارش نے موسم بہت خراب کر دیا تھا۔ لیکن مسز اندرا گاندھی نے دیہاتوں کے دورے کا پروگرام ملتوی نہیں کیا وہ شام سے لے کر گئی رات تک کیچڑ، پانی، اندھیرے کی پرواہ کے بغیر دورہ کرتی رہیں اور ان کے لیے دیہاتوں میں مرد اور عورتوں کے زبردست اجتماع ہاتھوں میں لالٹین لیے اور چھتری لگائے ہر جگہ منتظر نظر آئے۔ رائے بریلی سے ان کو بڑی محبت تھی۔ ان کا اس علاقے سے جذباتی لگاؤ تھا۔ وہاں وہ بچپن سے جاتی رہی تھیں۔

اس شہر میں ان کی وقت کی پابندی کی ایک مثال اس وقت دیکھنے میں آئی جب وہ کچھ ماہ قبل وہاں ٹیلی فون ایکسچینج کے کراس بار یونٹ کا افتتاح کرنے گئیں۔ پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی چنانچہ اس وقت جب دوسرے لوگ تقریریں کر رہے تھے۔ مسز گاندھی اٹھ کر ان لوگوں کی طرف چلی گئیں جو جلسے کے بعد ان کو کچھ عرضداشتیں دینے کے لیے کھڑے تھے۔ تقریب کے دوران ہی ان لوگوں سے ملاقات کر کے مسز گاندھی نے گویا وقت کا میک اپ کر لیا اور اس طرح دوسرے پروگرام میں تاخیر نہیں ہوئی۔ مسز گاندھی وقت کی پابندی تیز رفتاری اور حرکت پہ یقین رکھتی تھیں۔

اندرا جی کو ہندستان کی تہذیب سے گہرا لگاؤ تھا اور اس ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کے لیے انھیں مستقل فکر تھی — بعض وقت وہ ملک کی تاریخ، تاریخی عمارتیں اور تاریخی شخصیتوں کے بارے میں بے حد نازک جذبات کا اظہار کرتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کتنی حساس تھیں۔ آگرہ میں "ملیح گل"

کی سو سالہ یادگاری تقریب کے موقع پر جس کا افتتاح انھوں نے قصبہ بود بیکری میں کیا تھا، جب یہ کہا کہ "مجھے اور میرے والد کو یہ جگہ ہمیشہ بہت پسند رہی۔ کیونکہ یہاں آ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کل تک یہ ایک آباد شہر تھا اور اچانک لوگ اسے ویران کر کے چلے گئے ہوں" تو اس موقع پر سبھی نے کچھ اس انداز سے اپنے گرد دیکھا جیسے وہ بھی یہی محسوس کر رہے تھے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کی سہانی شام کو جھانسی میں "رانی جھانسی سمارک" میں مسز اندرا گاندھی نے جن کا یوم پیدائش بھی وہی ہے جو رانی لکشمی بائی کا تھا یعنی ۱۹ نومبر ملک تہذیب اور نوجوانوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ویرتا تیاگ اور دیش پریم کی مثال قائم کر کے اپنے سے پہلے کے لوگوں کو عقیدت کا خراج پیش کرنا چاہیے۔ وقت آیا ہے کہ اپنی آنکھیں پھر کھولیں رانی لکشمی بائی اور دوسروں کی طرح پرانے آدرشوں کو سامنے رکھ کر سماج کو جدید بنائیں۔ سب مذہب کے لوگ بھارت کی طاقت بنیں۔ حال اور مستقبل کے سوالوں پر سنجیدگی سے غور کریں۔ یہ ملک بلیدان اور اونچے آدرش کا ہے۔ روایات سے قوت حاصل کر کے مستقبل کی طرف بڑھنا ہے اور نوجوانوں کو آگے آکر اپنا راستہ بنانا ہے۔"

مسز اندرا گاندھی جو کہتی تھیں اس پر عمل کرتی تھیں میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اندرا جی کی بات سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی اور اسی لیے وہ عوام میں اسی طرح مقبول ہوئیں جس طرح مہاتما گاندھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد پنڈت نہرو اور مولانا محمد علی مقبول ہوئے۔ ایسا کیوں تھا، اس احساس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اس وقت سے جب مسز گاندھی کی موت کے ایک کے بعد ٹی وی پر ان کے بارے میں اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے اردو کے ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ مسز اندرا گاندھی کی شستہ زبان تھی جو ان کو عوام کے قریب رکھتی تھی۔ وہ ایسی زبان بولتی تھیں جو عام فہم ہوتی تھی اور ملک کے کونے کونے میں سمجھی جاتی تھی۔ اس میں ہندی اور اردو کا امتزاج ہوتا تھا، بہترین تلفظ ہوتا تھا حد یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے بارے میں بھی وہ عام جلسوں میں ایسے لہجے میں بولتی تھیں کہ مشکل سائنسی اصطلاحیں بھی لوگوں کو سمجھا دیتی تھیں ملک کی مختلف ریاستوں میں بولی جانے والی زبان کے الفاظ جملے بھی استعمال کرتی تھیں۔ انگریزی روانی سے بولتی تھیں اور فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھیں۔

قافلے یادوں کے : صفحہ ۱۹۸ کا بقیہ

شاندار طریقہ سے اس کتاب کا افتتاح کیا اور اس میں ہمارے سوویت یونین کے بھی سفیر شریک تھے اور پاکستان کے سفیر بھی شریک تھے اور وہاں بھی اردو کی بات نکلی اس لیے میں نے اس قصہ کو اتنی تفصیل سے بتایا اور اس لیے بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کے سلسلہ کی بات ہے جن کو غلطی سے ہندوستان کا نہ معلوم کیا سمجھا جاتا ہے حالانکہ ان کا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" C O N S T I T U E N T اسمبلی میں بھی گایا گیا جس وقت کہ ہندوستان آزاد ہوا ہے، اور جب راکیش وہاں پر تھا خلا میں، اور شریمتی گاندھی سے بات ہوئی تو اس نے وہاں سے بھی کہا:

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

تو اس اعتبار سے میں نے بات کی کہ میں بیٹھا ہوا تھا پاکستان کے سفیر کے قریب، ان کے بعد شریمتی گاندھی تھیں تو جب شریمتی گاندھی آئیں تقریر کرنے کے لیے تو ذرا سی رکیں اور رک کے مجھ سے کہا کہ میں اردو میں تقریر کروں گی، تو میں نے کہا کہ اردو تو آپ کی زبان ہے اور مادری زبان ہے آپ کی۔ ضرور تقریر کیجیے' نہایت خوبصورت اردو میں انھوں نے تقریر کی پاکستان کے سفیر نے مجھ سے مسکرا کے کہا کہ آپ لوگ بڑی بے تکلفی سے اپنے پرائم منسٹر سے بات کر لیتے ہیں"۔ میں نے ان سے اسی طرح مسکرا کر کہا "ہمارا جمہوری ملک ہے" اور اس لیے آج جب ہم اندرا گاندھی کو اس طرح سے محبت سے یاد کر رہے ہیں تو اس کی جمہوریت کو برقرار رکھنا اندرا گاندھی کے لیے ہمارا سب بڑا خراج محبت اور عقیدت ہوگا۔

★

عظمتِ ہندوستاں تھی اندرا گاندھی کی ذات

شاداں بدایونی
ایڈیٹر: ہاری آواز
بدایوں۔

امنِ عالم کا نشاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
نازشِ ہندوستاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
عمر بھر روشن کیے اُس نے محبت کے چراغ
پیکرِ امن واماں تھی اندرا گاندھی کی ذات
جس طرف ہو کر گزر جاتی تھی کھِل اُٹھتے تھے پھول
اک بہارِ جاوداں تھی اندرا گاندھی کی ذات
پیار کے مرہم سے بھر دیتی تھی جو ہر زخم کو
وہ مسیحائے زماں تھی اندرا گاندھی کی ذات
روشنی کا جن کی راہوں میں نہ تھا کوئی گزر
ان کی منزل کا نشاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
گوشۂ دل میں نہاں تھا اُس کے دردِ کائنات
اس زمیں پر آسماں تھی اندرا گاندھی کی ذات
اُس کی خوشبو قریہ قریہ اس کا جادو شہر شہر
گلستاں در گلستاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
زندگی کا کوئی لمحہ فکر سے خالی نہ تھا
مبتلائے امتحاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
فیض سے اس کے زمانہ ہو رہا تھا مستفیض
ایک بحرِ بیکراں تھی اندرا گاندھی کی ذات
اپنے خوں سے جس کو سینچا تھا جواہر لال نے
اُس چمن کی پاسباں تھی اندرا گاندھی کی ذات
منزلیں خود بڑھ کے آجاتی تھیں جس کی راہ میں
وہ امیرِ کارواں تھی اندرا گاندھی کی ذات
لاکھ پردوں میں جو پنہاں شخصیت چھپتی نہیں
ہر ترقی میں عیاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
روکتی پھر راہ میں تاریکیٔ منزل کسے
ہر قدم پر ضوفشاں تھی اندرا گاندھی کی ذات
آج اس کی یاد کی مشعل ہمارے ساتھ ہے
کل شریکِ کارواں تھی اندرا گاندھی کی ذات

احمد مقبول
۲۲۵۰ - مراٹھواڑ
نعیم پور کھیری

غمِ مستقل

تھا ترے فکر و نظر کا بھی انوکھا انداز
کام جو سوچ لیا کر دیا اس کا آغاز
تیرے جیسا نہ ہوا کوئی وطن میں جانباز
ہے ترے حوصلہ و عزم پہ اس دیش کو ناز

کرنا چاہا جسے اس کام کو انجام دیا
لے لیا سر پہ زمانے نے جو الزام دیا

دیش کو راہ ترقی پہ ہے ڈالا تو نے
بھید اور بھاؤ کو ذہنوں سے نکالا تو نے
قوم کو اک نئے سانچے میں ہے ڈھالا تو نے
کر دیا دیش میں ہر سمت اُجالا تو نے

سوگ جتنا بھی کیا جائے وہ کم ہے تیرا
مستقل اہلِ وطن کے لیے غم ہے تیرا

دیش بھگتی پہ ہمیشہ رہا ایمان ترا
اس کی جانب سے نہ اک پل بھی ہٹا دھیان ترا
سر پہ بھارت کے رہیگا سدا احسان ترا
جسم بھی خاکِ وطن پر ہوا قربان ترا

فلکِ ہند پہ اک انجمِ تابندہ ہے تو
مر کے بھی دیش کی تاریخ میں پائندہ ہے تو

واحد پریمی
نزد گنوری اسکول بھوپال
۴۶۲۰۰۱

زندگی دیکے زندگی بخشی

آج پھر نیم وحشی انساں نے
آج پھر دشمنِ گلستاں نے
رنگ و بو کا وقار لوٹ لیا
حسنِ دورِ بہار لوٹ لیا

برگ بے رنگ ، خار آزردہ
غنچے نمناک ، پھول پژمردہ
سرنگوں شاخیں، مضمحل پودے
بے ثمر پیڑ ، پر تپش سائے
جھاڑیاں مضطرب، روش ویراں
صحنِ سرسبز ، ترجمانِ خزاں
کُنج بے کیف ، گوشہ گوشہ اداس

ذرہ ذرہ اسیرِ حسرت و یاس
ایک ایک پنکھڑی ہے دیدۂ نم
اشکِ سوزاں ہے قطرۂ شبنم
بادِ صرصر بنی ہے بادِ صبا
بارِ غم سے گراں ہے ساری فضا
ابرِ باراں ہے آج شعلہ فشاں
مثلِ خوں موجزن ہے آبِ رواں
باغ کا کچھ عجیب عالم ہے
اُس شہیدِ چمن کا ماتم ہے
جس نے تاعمر تازگی بخشی
زندگی دے کے زندگی بخشی
موسمِ گل کی جو پیمبر تھی
ملک کی بے مثال رہبر تھی
جیسے سورج جلا کے آئی تھی
اندرا ایک ایسی دیوی تھی

ظفر مرزاپوری
تحصیلداری لین
ولیل گنج ۔ مرزاپور

وہ حوصلے کا ہمالہ تھی

فضا خموش زمانہ اداس و رنجیدہ ۔ بشر تو کیا کہ قلم بھی ہے غم میں نم دیدہ
وہ ہند ہی میں نہیں تھی جہاں میں فہمیدہ ۔ گئی وہ دہر سے تھا وقت جس کا گردیدہ
جو ہو سکا نہ کسی سے وہ بات بھی کر دی
وطن کی خاک میں تاروں کی روشنی بھر دی

وہ حوصلے کا ہمالہ تھی فہم کا ساگر ۔ اندھیری راہ کی خاطر تھی نور کا پیکر
زمیں کی گود میں تھی مہر و ماہ کی ہمسر ۔ وطن کو ناز تھا جس پر کہاں گیا وہ گہر
عظیم رہنما عظمت تھی ہند کی تجھ سے
بڑی عروج پہ جنت تھی ہند کی تجھ سے

کیا وہ کام کہ سب پڑ گئے تھے حیرت میں ۔ کہ چار چاند لگایا تھا اپنی عظمت میں
تھا ”ایشیاڈ“ بھی اندرا کے دم سے بھارت میں ۔ اضافہ کر دیا ”آسٹ“ نے اور شہرت میں
تھا اپنے دیش کا اونچا مقام دنیا میں
ترے ہی دم سے تھا بھارت کا نام دنیا میں

پڑوس ملک سے نفرت نہیں محبت تھی ۔ ہر ایک ملک کی عظمت تھی دل میں عزت تھی
جہاں سے جنگ و جدل ختم ہو یہ حسرت تھی ۔ ہر ایک دیش میں ہو شانتی یہ چاہت تھی
وہ اپنی بات میں الفت کی بات کرتی تھی
وہ اتحاد و محبت کی بات کرتی تھی

وطن کی خاک سے اس کو بڑی محبت تھی ۔ ابھی تو دیش کو اس کی بڑی ضرورت تھی
وہ شانِ ہند تھی ہندوستاں کی جنت تھی ۔ فسانہ بن گئی کیسے وہ اک حقیقت تھی
وہ اندرا تھی گلوں کو نکھارنے والی
لہو سے اپنے گلستاں سنوارنے والی
فضا خموش زمانہ اداس رنجیدہ ۔ بشر تو کیا کہ قلم بھی ہے غم میں نم دیدہ

مہذب لکھنوی
نیا محل منصور نگر
لکھنؤ

بہارِ گلشنِ ہندوستاں

اہلِ دل کرتے ہیں ماتم سوگ کرتا ہے جہاں
جب زمیں پہ بے خطا کا خون ہوتا ہے رواں

تیرِ صیادِ اجل نے ختم کردی داستاں
لے گئی بلبل بہارِ گلشنِ ہندوستاں

روحِ موتی لال تھی جانِ جواہر لال تھی
پیروِ گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

صنفِ نازک پر گریں اتنی مسلسل بجلیاں
چھٹ گئی دنیا کہاں کا باغ کیسا آشیاں

لے گئیں قاتل کو اپنے ساتھ ہمت دیکھیے
داد خواہی کے لیے پیشِ خدائے دو جہاں

غیب سے آئی ندا کر دیں گے اک دن فیصلہ
خونِ ناحق ہو نہیں سکتا کسی کا رائیگاں

روح نکلی اہلِ گلشن سے یہی کہتی ہوئی
خوش رہو اہلِ چمن اب ہم کہاں اور تم کہاں

رنگ لائی بے خطا کی موت اندرا اٹھ گئیں
خون کے آنسو ہوئے ہیں چشمِ نرگس سے رواں

پھول کمھلائے اداسی سی چمن میں چھا گئی
ہو گئی فرطِ الم سے بند سوسن کی زباں

بال سنبل کے کھلے گیسو نے کھایا پیچ و تاب
جل اٹھا لالے کا داغ آئی صدائے الاماں

قمریاں خاموش ہیں طاؤس غم سے سرنگوں
ہر طرف ہے باغ میں شہرِ خموشاں کا سماں

آئے تھے شرکت کی خاطر ملکوں ملکوں سے سفیر
ساتھ تھا ارتھی کے لاکھوں اہلِ دل کا کارواں

خاک تیری لے رہی تھی جب ہوائیں گود میں
دیکھتا تھا غور سے جھک جھک کے پیرِ آسماں

مل گیا راجو کو ماں کی جانشینی کا شرف
ہے یقیں ہوگی عدم میں روحِ اندرا شادماں

اے مہذب جاگ اٹھی قسمتِ ہندوستاں
مل گیا نہرو گھرانے کے چمن کا باغباں

ضیاء الدین اصلاحی
دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

مسز اندرا گاندھی

ذاتی و خاندانی حالات!

ہمارے ملک کی عظیم رہنما اور محبوب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا خاندان دولت و ثروت میں بھی ممتاز تھا اور علمی و سیاسی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ ان کے دادا پنڈت موتی لال نہرو اور والد پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے نامور رہنما، اور جنگِ آزادی کی تحریک کے سربرآوردہ لیڈر تھے۔ اس مضمون میں اس فخر روزگار اور نازشِ ہندستانی خاندان کی مختصر سرگذشت اور اس کی ان تینوں عظیم اور مایہ ناز شخصیتوں کے حالات پیش کیے جاتے ہیں:

اندرا گاندھی کا خاندان پہلے کشمیر کی پہاڑی میں آباد تھا، مگر اٹھارھویں صدی کے شروع میں اس نے وہاں کی سکونت ترک کر دی اس وقت مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہو چکا تھا اور فرخ سیر ہندستان کا بادشاہ تھا۔ وہ جب کشمیر گیا تو اس کی نظر اس خاندان کے بزرگ راج کول پر پڑی، جو سنسکرت اور فارسی عالم کی حیثیت سے مشہور اور ممتاز تھے۔ چنانچہ وہ اس کے ایما سے ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ دلی چلے آئے۔ فرخ سیر نے انھیں جاگیر اور مکان بھی دیا۔

دلی میں راج کول کا مکان نہر کے کنارے واقع تھا اس بنا پر وہ راج کول نہرو کہلانے لگے، اس طرح کول کے ساتھ 'نہرو' بھی اس خاندان کے نام کا جزء ہو گیا تھا، مگر آگے چل کر 'کول' تو ختم ہو گیا مگر نہرو باقی رہا۔

۱۸۵۷ء میں دلی ویران و برباد ہوئی تو اس خاندان نے آگرہ میں پناہ لی۔ یہیں اندرا گاندھی کے دادا پنڈت موتی لال نہرو ۶ مئی سنہ ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے تین ماہ قبل ہی ان کے والد گنگا دھر نہرو کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو اور بیٹے بھی تھے۔ جو موتی لال سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ بڑے بیٹے بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمۂ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے تبدیل ہو کر دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے اس لئے ان کا تعلق خاندان سے تقریباً منقطع ہو گیا تھا مگر دوسرے بیٹے نند لال نہرو نے ایک ہندستانی ریاست میں ملازمت اختیار کی اور دس برس تک وہ راجپوتانہ کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرہ میں وکالت شروع کی۔ موتی لال نہرو کی پرورش و پرداخت اپنے انہی بھائی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔

آگرہ میں جب ہائی کورٹ قائم ہوا تو نند لال نہرو نے اس میں پریکٹس شروع کی۔ مگر جب وہاں سے بجائے ہائی کورٹ الٰہ آباد منتقل ہوا تو وہ بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ الٰہ آباد چلے آئے۔ یہاں انھوں نے بڑی شہرت و ترقی حاصل کی، اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہوا۔

موتی لال نہرو کی اسکول اور کالج کی تعلیم کان پور اور الٰہ آباد میں ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے عربی، فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی اور فارسی کی ان کی استعداد اچھی تھی۔ عملی مشغلے کے لئے ان کی نظر بھی قانون ہی کے پیشہ پر پڑی اور ہائی کورٹ کے امتحان میں اوّل نمبر سے پاس ہوئے اور سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو نے پہلے کان پور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کی، تین سال بعد وہ الہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کے بھائی پنڈت نند لال نہرو کا اچانک انتقال ہو گیا جس کے بعد کم عمری میں پورے خاندان کی ذمہ داری موتی لال کے سر آ گئی۔ اس بنا پر وہ پوری یکسوئی اور نہایت انہماک کے ساتھ وکالت کے پیشے میں لگ گئے۔ ان کی توجہ، یکسوئی اور انہماک کی وجہ سے ان کی وکالت خوب چمکی اور اس میں انھوں نے بڑی نیک نامی اور غیر معمولی شہرت حاصل کی اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔

وہ وکالت کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ رکھتے مگر جب انڈین نیشنل کانگریس کا زور بڑھا تو یہ بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہونے لگے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے مگر ابتدا میں انھوں نے نہ کانگریس سے زیادہ دل چسپی لی اور نہ وہ عملی طور پر اس سے وابستہ ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں انھوں نے وکالت سے اتنا کمایا کہ الہ آباد میں آنند بھون کے نام سے ایک نہایت شان دار، وسیع، کشادہ اور لق و دق مکان تعمیر کیا جو آگے چل کر آزادی و اتحاد کی تحریک، قومی سرگرمیوں اور سیاسی رہنماؤں کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔

۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پنڈت جواہر لال نہرو پیدا ہوئے۔ مئی ۱۹۰۵ء میں موتی لال انھیں، ان کی والدہ اور ان کی چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہوئے اور تعلیم کے لئے ہیرو میں ان کا داخلہ کرایا، اس کے بعد خاندان کے اور لوگ تو یورپ کے بعض ملکوں کو ہوتے ہوئے ہندستان واپس آ گئے مگر جواہر لال ہیرو میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے رک گئے۔ یہیں انھیں اخبارات پڑھنے کا شوق بھی ہوا اور وہ سیاست سے بھی کسی قدر دل چسپی لینے لگے، دو سال بعد وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور تین سال تک وہیں رہ کر سائنس کی سند لی کیمیا، ارضیات اور نباتات ان کے خاص موضوع تھے۔

۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندستان کی سیاست عجیب ہیجانی دور سے گزر رہی تھی۔ اس زمانہ میں ہندستان کی خبریں انگلستان کے اخباروں میں بہت مجمل طور پر چھپتی تھیں تاہم اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں اہم واقعات رونما ہو رہے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ملک بدیسی حکومت کے آگے جھکنے کے بجائے اس سے لڑنے پر آمادہ تھا۔ لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کی جلا وطنی، پونا میں تلک کی جدوجہد اور گرفتاری، اروند گھوش کی سرگرمی اور بنگال کے لوگوں کے سودیشی کے بائیکاٹ وغیرہ کی خبریں جب انگلستان پہنچتیں تو جواہر لال نہرو اور دوسرے ہندستانی لوگوں کے دلوں میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتیں اور وہ جوش و خروش سے معمور ہو جاتے، جواہر لال، تلک کے پیرو تھے جو ہندستان میں انتہا پسند کہلاتے تھے۔

ہندستان کی اس ہیجانی سیاست نے پنڈت موتی لال نہرو کو بھی عملی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اعتدال پسند طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے جواہر لال کو ان کے سیاسی اصولوں سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے صوبہ کی ایک کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے خطبہ صدارت میں بنگال اور مہاراشٹر کے انتہا پسندوں کی شدت سے مخالفت کی۔ وہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہوئے، اور ۱۹۰۷ء کے سورت اجلاس میں بھی شریک ہوئے جس میں کانگریس درہم برہم ہو گئی اور اس کے بعد وہ خالص اعتدال پسند جماعت بن گئی۔

جواہر لال ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند حاصل کر چکے تھے مگر انھوں نے لندن میں دو برس مزید قیام کیا اور بیرسٹری کے امتحانات پاس کیے ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کرنے اور سات برس تک یورپ میں قیام کے بعد وہ ہندستان واپس آئے اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ اسی سال وہ بانکی پور کانگریس کے جلسہ میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

وہ کانگریس میں داخل ہو چکے تھے اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شرکت بھی کرتے تھے مگر اس زمانے میں ان کے نزدیک سیاسیات کا مفہوم صرف یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں سیاسی تحریک رک گئی۔ مگر رفتہ رفتہ پھر سیاسی بیداری شروع ہوئی۔ لوکمانیہ تلک جب جیل سے رہا ہو کر آئے

تو ایک ہوم رول لیگ انھوں نے اور ایک مسز بیسنٹ نے قائم کی، جواہر لال دونوں میں شریک ہوئے مگر زیادہ تر مسز بیسنٹ کی لیگ میں انھوں نے کام کیا۔ ہندستانی سیاست میں ان کی سرگرمیاں برابر بڑھ رہی تھیں، کانگرس میں بھی بڑا جوش وخروش دکھائی دیتا تھا اور مسلم لیگ تو کانگرس ہی کے نقش قدم پر چلتی تھی۔ مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ جوش اور ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس سے سارے ملک میں ہوم رول کی تحریک کو بھی بڑی تقویت پہنچی۔

دوسری طرف پنڈت موتی لال نہرو اور بعض دوسرے اعتدال پسند رہنما بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہو گئے تھے اور چند ماہ بعد اکثر حضرات کے مستعفی ہونے کے بعد وہ اس میں شریک رہے اور الہ آباد شاخ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ انھیں رفتہ رفتہ اعتدال پسند جماعت کے عقائد سے نفرت ہونے لگی لیکن وہ پرانے انتہا پسندوں کی طرف بھی مائل نہ تھے۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگرس نے کانگرس اور لیگ کی مشترکہ اسکیم منظور کی۔ اس کا خاکہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ان کے گھر ہی میں بیٹھ کر تیار کیا تھا جس سے ان کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس سے متحدہ جدوجہد کے دروازے کھل گئے تھے۔ ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں یو پی کی اسپیشل کانفرنس کا جلسہ بھی انھی کی صدارت میں لکھنؤ میں ہوا۔

جواہر لال جنگ کے ابتدائی زمانہ تک سیاسی اور قومی کاموں میں کھل کر حصہ نہ لیتے تھے اور جلسوں میں تقریر کرنے سے خاص طور پر بچتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں جب الہ آباد میں پہلی مرتبہ انھوں نے تقریر کی تو ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے ڈائس پر ہی انھیں گلے لگا لیا۔

اس زمانہ میں ان کے گھر آنند بھون میں سیاسی مسائل پر خوب گرماگرم بحثیں اور جھڑپیں ہوتی تھیں۔ پنڈت موتی لال ان چیزوں کا غور سے مطالعہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بیٹے جواہر لال کا رجحان انتہا پسندی کی طرف ہے اور وہ عملی کام کرنے کے حامی ہیں۔ انھیں کبھی کبھی اس کا بھی خیال ہوا کہ بنگال کے بعض نوجوانوں کی طرح وہ تشدد کی راہ پر جا رہے ہیں، حالانکہ اس طرف ان کا رجحان نہ تھا بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ موجودہ صورت حال کو بزدلی کے ساتھ گوارا نہیں کرنا چاہیے اور وہ انفرادی اور قومی غیرت کا تقاضا اس کو سمجھتے تھے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف زیادہ جارحانہ کارروائی کی جائے۔

بہر حال موتی لال نہرو کو جواہر لال کے رویے سے بڑی تشویش تھی گو وہ خود بھی اعتدال پسندوں کے نظریات سے دل برداشتہ ہو چکے تھے اور ان کے دماغ میں بھی خاموش کش مکش جاری تھی، لیکن وہ بڑے محتاط شخص تھے، اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھاتے تھے اور جو قدم آگے بڑھا دیتے اس کا پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کا کوئی کام وقتی جوش وخروش کا نتیجہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ انتہائی غور وخوض کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرتے تھے۔ فروری ۱۹۳۱ء میں وہ دنیا سے سدھار گئے تھے۔

۱۹۱۹ء میں ان کے رجحانات میں بڑی تبدیلی آئی۔ پنجاب کے حادثہ کے بعد انھوں نے اپنی قدیم معاشرت اور اپنا سب کچھ تج دیا۔ اور گاندھی جی کی شروع کی ہوئی نئی تحریک میں تن من دھن سے شریک ہو گئے۔ اسی زمانہ میں کانگرس اور تحریک خلافت کا مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آیا اور ترک موالات کی تحریک نے بڑی شدت اختیار کر لی اور پورے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی لہر دوڑ گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۱۶ء میں پہلے پہل گاندھی جی سے لکھنؤ کانگریس میں ملاقات کی۔ اسی سال کے موسم بہار میں ان کی دلی میں شادی ہوئی[1]

ہندستان کی سیاسی سرگرمیوں کے اسی دور اور ماحول میں مسز اندرا گاندھی ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کا گھر تمام سیاسی تگ ودو اور سرکردہ سیاسی لیڈروں کا مرکز تھا۔ ان میں خود بھی دانش مندی، فراست، اور سیاسی سوجھ بوجھ تھی اس پر یہ ماحول، گویا سونے پر سہاگا۔ اس بنا پر سیاست وتدبر، حب الوطنی، قوم وملک کی خدمت اور عوام کی بھلائی کا جذبہ، غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے مسائل سے دلچسپی، پس ماندہ اور کمزور طبقات سے ہمدردی، ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک اور عدم امتیاز، حق وانصاف پسندی، فرقہ واریت اور

---

[1] یہ تفصیل پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب "میری کہانی" کے شروع کے ابواب کی مدد سے پیش کی گئی ہے۔ (ض)

تعصب سے نفرت، وسیع النظری، روشن خیالی اور رواداری وغیرہ ان کی سرشت میں داخل تھی۔

اندرا گاندھی اپنے گھر میں اکلوتی تھیں، اس لئے باپ اور دادا سب کو نہایت عزیز تھیں، پیار سے انھیں اندو کہا جاتا تھا۔ شروع میں وہ دادا سے زیادہ مانوس تھیں کیونکہ ان کے والد کو قومی کاموں میں مشغول رہنے اور اکثر قید و بند کی زندگی گذارنے کی وجہ سے گھر پر کم رہنا نصیب ہوتا تھا اور والدہ مستقل بیمار رہا کرتی تھیں۔

اندرا چار برس کی تھیں تو ان کے والد اور دادا دونوں کو چھ چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن جب پولیس آنند بھون آئی اور جرمانہ وصول نہ ہونے کی بنا پر گھر کا سامان لے جانے لگی تو ننھی اندرا کو طیش آگیا اور غصہ میں پیر پٹک کر کہنے لگیں کہ تم ان چیزوں کو نہیں لے جا سکتے۔ یہ تو ہماری چیزیں ہیں، وہ اپنی مٹھیاں بھینچے ہوئے پولیس آفیسر کی طرف بڑھیں لیکن گھر کے اور لوگوں نے انھیں روک لیا۔

باپ اور دادا کی گرفتاری کے بعد گھر کے سارے لوگ جب سابرمتی آشرم چلے آئے تو ان کے ساتھ اندرا بھی وہاں پہنچیں، آشرم کی زندگی بہت سادہ تھی، گھر جیسے صوفہ، پلنگ، میز، کرسی اور فرش فروش نہ تھے۔ سادہ اور روکھا سوکھا کھانا اور فرش پر سونا اور سویرے چار بجے جاگنا اور سابرمتی ندی کے کنارے پرارتھنا کیلئے جمع ہونا اور سارے کام کاج خود اپنے ہاتھوں سے کرنا یہاں کا معمول تھا۔ اندرا بھی چھوٹے موٹے کام اپنے ننھے منّے ہاتھوں سے کرتی تھیں یہ دیکھ کر گاندھی جی بہت خوش ہوتے اور ان سے بڑا پیار کرتے وہ آشرم کی سادہ زندگی سے اتنا متاثر ہوئیں کہ گھر واپس آنے کے بعد کھدر کے کپڑے پہننے لگیں۔

الہ آباد میں ان کے بچپن میں جب کوئی جلوس گزرتا اور گلی میں "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگتا، تو وہ گھر والوں کی لاعلمی میں پیچھے سے جلوس میں شامل ہو جاتیں اور اس کے ساتھ چلنے لگتیں اور نعرے بھی لگاتیں، آیا کو پتہ چلتا تو وہ دوڑ کر انھیں پکڑ لاتی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ خاموش نہ رہتیں، اپنی گڑیوں کی فوج بنا کر کھڑا کر دیتیں اور خود زور زور سے "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگاتیں۔ کبھی کبھی وہ گھر کے تمام نوکروں کو جمع کر کے جلسہ کا رنگ دیتیں، ترنگا جھنڈا بھی ہوتا اور وہ ایک اونچی میز پر کھڑے ہو کر تقریروں کی نقل اتارتیں۔

بچپن ہی سے انھیں دیسی چیزوں سے اُلفت اور بدیسی چیزوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ان کے بچپن میں ان کے ایک رشتہ دار یورپ سے آئے تو ان کے لیے ایک بہت خوش نما فراک لائے مگر انھوں نے یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "یہ تو بدیشی ہے، میں اسے کیسے قبول کر سکتی ہوں"؟ یہ جواب سن کر ان کے عزیز کو بڑی ناگواری ہوئی اور انھوں نے غصہ میں کہا کہ تمہاری گڑیا بھی تو بدیشی ہے۔ ان سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا مگر اس کے بعد انھوں نے چپکے سے چھت پر جا کر اس گڑیا کو آگ لگا دی۔

گھر کے لوگوں کی آئے دن کی گرفتاری اور ستیہ گرہ کو دیکھ کر اندرا کے دل میں بھی ملک کی آزادی کے لیے جوش و خروش پیدا ہوتا اور وہ اس راہ میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہو جاتیں۔

چھ برس کی عمر میں وہ الہ آباد کے مشن اسکول میں داخل ہوئیں اس زمانہ میں گاندھی جی اکثر آنند بھون تشریف لایا کرتے تھے اور ان کی وجہ سے ملک کے تمام بڑے بڑے رہنما بھی وہاں آیا کرتے تھے، کانفرنس ہوتی، ملک کو آزاد کرانے کی اسکیمیں بنائی جاتیں، خوب بحث مباحثے ہوتے اندرا گاندھی جب ان باتوں کو سنتیں تو انھیں اپنے ملک کی غلامی اور خراب حالت پر افسوس ہوتا، اور وہ انگریزوں کے خلاف غم و غصہ میں بھر جاتیں جو کہ ہندستانیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے اور جی ہی جی میں عہد کرتیں کہ بڑی ہو کر ملک کی آزادی کی جدّ و جہد میں بھرپور حصہ لیں گی۔

سات آٹھ برس کی عمر میں ان کے ایک بھائی پیدا ہوا جو تین ہی چار روز میں فوت ہو گیا، اس کے ساتھ ہی ان کی ماں کملا نہرو کو سخت بیماری لاحق ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے دق کی تشخیص کر کے انھیں سوئٹزرلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جواہر لال نہرو انھیں اور اندرا کو لے کر سمندری جہاز کے ذریعہ یورپ چلے گئے۔ اس سفر میں وہ اندرا کو دیس دیس کی کہانیاں سناتے اور یہ بھی بتاتے کہ ہمارے ملک پر ایک غیر ملکی قوم انگریز حکومت کر رہی ہے، انگریزوں کے ظلم و ستم کے واقعات سُن کر اندرا کے دل میں

باغیانہ خیالات پرورش پانے لگے۔

ماں کے علاج کے سلسلہ میں جب اندرا گاندھی کو طویل مدت تک یورپ میں قیام کرنا پڑا، تو جواہر لال نہرو نے یورپ کے ایک اسکول میں پڑھنے کے لیے انھیں داخل کر دیا، مگر جواہر لال کو وہاں کا طریقۂ تعلیم پسند نہیں تھا، اس لیے دو سال کی مدت میں انھیں تین اسکول بدلنے پڑے بالآخر دو سال بعد وہ ہندستان واپس آئیں اور پھر الہ آباد کے مشن اسکول میں داخل ہوئیں۔ دس برس کی عمر میں انھیں قومی خدمت کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ وہ ہر اتوار کو چھٹی کے دن سائیکل پر سوار ہو کر الہ آباد سے چھ میل دور ایک اسپتال میں جا کر جذامی بیماروں کی خدمت کیا کرتی تھیں، انھوں نے اس کم عمری میں بچوں کو چرخہ کاتنے کی تعلیم دینے کے لیے ایک چرخہ سنگھ کی شاخ بھی کھولی تھی جہاں بچے چرخہ کاتنے کے علاوہ گھر گھر جا کر کھادی کا پرچار کرتے تھے۔

بارہ برس کی عمر میں جبکہ لڑکیوں کو گڑیوں کے کھیل اور دوسرے تفریحی کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے مگر وہ اس عمر میں بھی آزادی کی تحریک سے دلچسپی اور انگریزوں سے نفرت کرنے لگی تھیں جس کا چرچا ان کے گھر پر ہر وقت ہوتا رہتا تھا، وہ اس زمانہ میں آزادی کی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کے لیے بے چین رہتی تھیں اسی لیے کتابوں اور تعلیم میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ ایک دن وہ کانگریس کے دفتر پہنچ گئیں اور کہنے لگیں کہ انھیں بھی والنٹیروں میں بھرتی کر لیا جائے۔ لوگوں نے انھیں غور سے دیکھ کر پوچھا۔ تمھاری عمر کیا ہے؟ بتایا کہ بارہ برس۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تم چھوٹی ہو، اٹھارہ برس سے پہلے بھرتی نہیں کی جاتی۔ اندرا جی کو اس پر بڑا غصہ آیا اور انھوں نے جوش میں آکر دیش کو آزاد کرانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس کے لئے وانر سینا (بندروں کی فوج) کے نام سے ایک چھوٹی پارٹی بھی بنالی۔ اس پارٹی میں ان کی عمر کی بے شمار لڑکیاں شامل تھیں اور اس کا مقصد کانگریس کا ہاتھ بٹانا تھا، چنانچہ اس پارٹی کی ممبر بچیاں کانگریس کے جلسوں میں لوگوں کو پانی پلاتیں، رات کے اندھیروں میں دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرتیں، کانگریس کے جلسوں میں کھانا تقسیم کرتیں، اور اس کے لیڈروں کے درمیان پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتیں۔

اندرا کی تعلیم میں ہرج دیکھ کر جواہر لال نے انھیں دلّی کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کیا، مگر انھیں یہاں کی تعلیم پسند نہیں آئی اس لیے وہ پھر الہ آباد کے ایک اسکول میں داخل ہو گئیں، مگر اکثر ستیہ گرہیوں کے ساتھ ہو جاتیں اور اسکول کا ناغہ کر دیتیں۔ جواہر لال کو جیل میں بیٹی کا یہ حال معلوم ہوتا رہتا تھا اس لیے وہ انھیں خطوط لکھتے اور ان کے ذریعہ تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ یہی خطوط آگے چل کر "باپ کے خط بیٹی کے نام" سے شائع ہوئے۔

باپ نے مختلف جیلوں سے ان کو اور بھی خطوط لکھے تھے جو انھیں بھیجے نہیں جا سکے۔ یہ خطوط بھی بعد میں "تاریخ کی عام جھلکیاں" کے نام سے شائع ہوئے۔

اندرا کی تعلیم کی جانب سے جواہر لال کو جو تشویش تھی اس کی بنا پر انھوں نے گاندھی جی کے مشورہ سے انھیں پونا کے ایک بورڈنگ اسکول کی ساتویں جماعت میں داخل کر دیا، یہاں بھی ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ دن میں وہ کام میں مشغول رہتی تھیں، اپنے اور دوسری بچیوں کے کام بھی کرتی تھیں اور فرصت کے اوقات میں غریبوں اور اچھوتوں کا کام بھی کرتی تھیں مگر رات انھیں پہاڑ معلوم ہوتی تھی اور وہ ماں باپ کو یاد کر کے لحاف کے اندر رو دیا کرتی تھیں۔ ان کی ماں مستقل بیمار رہتی تھیں اور باپ جیل کی تکلیفوں سے دوچار تھے۔ کبھی کبھی رات میں ان کے رونے کی آواز سن کر دوسری لڑکیاں بیدار ہو جاتیں اور ان کو دلاسا دیتیں۔

اسی زمانہ میں گاندھی جی نے چھوت چھات ختم کرنے کے لئے مرن برت رکھا تو اندرا گاندھی نے اسکول میں جھاڑو دینے والی اچھوت عورت کی بچی کو اپنا لیا، وہ اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرا رکھتیں، اس کے بالوں میں کنگھی کرتیں، صاف کپڑے پہناتیں، اور اسے اپنے بستر پر سلاتیں۔

اسکول کی تعلیم میں بھی انھوں نے اس دفعہ پوری دلچسپی لی اور چار برس کی پڑھائی تین ہی برس میں ختم کر کے میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔

جب ان کی والدہ ڈاکٹروں کے مشورہ سے کلکتہ گئیں تو ان کو بھی وہاں جانا پڑا۔ یہاں قیام کے زمانہ میں جواہر لال، رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے کے لیے شانتی نکیتن گئے، وہاں کا طریقۂ تعلیم انھیں پسند آیا، اس لیے اندرا کو وہاں داخل کر دیا۔ اسکول کی بچیوں کو ان کے داخلہ کی خبر

ملی تو انھوں نے سوچا کہ یہ تو بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہوں گی کیونکہ بڑے متمول گھرانے کی لڑکی ہیں مگر جب انھوں نے اندرا کو کھدر کی موٹی ساری اور معمولی چپل میں دیکھا تو دنگ رہ گئیں۔

اندرا گاندھی یہاں عام لڑکیوں کی طرح رہیں اور شانتی نکیتن کے شری بھون آشرم کے تمام اصولوں کی ہنسی خوشی پابندی کرتی رہیں۔ گاندھی جی کے سابرمتی آشرم کی طرح یہاں بھی بڑی سادہ اور پُر مشقت زندگی گزارنا پڑتی تھی، امیر غریب سب برابر تھے، نوکر چاکر نہ تھے، سارے کام خود ہی اپنے ہاتھ سے کرنے ہوتے تھے۔ اندرا یہاں کے معمول کے مطابق سارے کام بڑے شوق سے انجام دیتیں۔

جب آدمی ایسی جفاکشی اور مشقت کی زندگی بسر کرتا ہے تو اسے دوسروں کی تکلیفوں اور غریبوں کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے، اندرا گاندھی نے بھی آشرم کی مشکل زندگی گزارنے کی وجہ سے غریبوں اور بے سہارا لوگوں سے ہمدردی کرنا سیکھا۔

شانتی نکیتن میں ایک سال بھی نہیں گزرا کہ ان کی والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ جواہر لال اس وقت جیل میں تھے، انھوں نے وہیں سے اندرا کو تار دیا کہ اپنی ماں کی خدمت اور تیمارداری کے لیے الہ آباد آجائیں۔ انھوں نے اس کی تعمیل کی، اور ڈاکٹروں کے اصرار سے اپنی ماں کو پہلے جرمنی لے گئیں مگر جب وہاں بھی ان کی طبیعت نہیں سنبھلی تو ٹھنڈی ہوا کے لیے انھیں سوئٹزرلینڈ لے گئیں۔ یہاں ایک اسکول میں داخلہ بھی لیا، مگر ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اس لیے جواہر لال بھی رہا ہو کر وہاں پہونچ گئے اور شوہر اور بیٹی کی موجودگی میں کملا جی دنیا سے چلی گئیں۔

کملا کے انتقال کے بعد جواہر لال اندرا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان لے گئے، وہ لندن میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لیے ایک والنیٹر کی حیثیت سے کام بھی کرتی رہیں۔

اندرا گاندھی آکسفورڈ سے ڈگری حاصل نہ کر سکیں اور ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سردی کی شدت کی بنا پر وہ بیمار ہو گئیں اور لندن کے ایک اسپتال میں داخل ہوئیں۔ جب طبیعت سنبھلی تو مکمل صحت یابی کے لیے سوئٹزرلینڈ گئیں۔ اسی زمانہ میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور ہندستان کی واپسی کے راستے بند ہو گئے، اس کی وجہ سے انھیں وہاں ایک سال تک رکنا پڑا، بالآخر وہ گھبرا کر اسپین اور پرتگال کے راستے سے ہندستان لوٹیں۔

فیروز گاندھی اندرا کے بچپن کے دوست تھے، کملا کی بیماری کی خبر سُن کر یہ بھی لندن پہنچ گئے تھے اور انھوں نے بڑی گرم جوشی اور مستعدی سے ان کی خدمت کی تھی۔ اندرا اکیلی تھیں، ان کی پریشانی میں انھوں نے ان کا پورا ہاتھ بٹایا تھا، اس کی وجہ سے جواہر لال بھی انھیں بہت ماننے لگے۔ اندرا انگلستان سے واپس آئیں تو ان کے والد جیل میں تھے، وہ ان سے ملنے کے لیے اکثر وہاں جایا کرتیں۔ ایک روز انھوں نے والد سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ فیروز گاندھی سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ والد نے بھی اسے پسند کیا، چنانچہ جب وہ رہا ہو کر گھر آئے تو مارچ ۱۹۴۲ء میں دونوں کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد میاں بیوی کشمیر گئے اور وہیں سے کانگریس کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی آئے جس میں انگریزوں کے خلاف "ہندستان چھوڑدو" تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں کانگریس کے سب ہی ممتاز لیڈروں کو گرفتار کیا گیا تھا، مگر اندرا گاندھی کسی طرح سے الہ آباد آئیں۔ یہاں بھی پولیس نے ان کے تمام عزیزوں کو گرفتار کر لیا مگر وہ بچ بچا کر لکھنؤ پہنچ گئیں اور لڑکوں کے ایک جلوس کی قیادت کرتی ہوئی پولیس کے زدوکوب کا نشانہ بنیں اور کئی لاٹھیاں بھی ان پر پڑیں جس کی وجہ سے وہ گھائل ہو گئیں، اس واقعہ کے بعد انھوں نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک جلسہ عام کیا، پولیس نے اسے گھیر لیا مگر اس کی لاٹھیوں اور بندوقوں کے باوجود انھوں نے تقریر شروع کی۔ بالآخر انھیں اور ان کے شوہر فیروز گاندھی کو گرفتار کرنے میں پولیس کامیاب ہو گئی اور انھیں نینی تال جیل بھیج دیا گیا۔

اندرا گاندھی جیل میں بھی لوگوں کی خدمت کرتی رہیں۔ یہاں ان پڑھ عورتوں کو پڑھانا شروع کیا۔ ۹ مہینے بعد جیل سے رہا ہوئیں، اس کے سوا برس بعد بمبئی کے لیے روانہ ہوئیں، یہیں ان کے بڑے صاحبزادے راجیو گاندھی پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے دو ماہ کے بعد وہ لکھنؤ آگئیں۔

آخر وہ وقت بھی آیا، جب جواہر لال اور تمام لیڈر جیل سے رہا کر دیے گئے اور انگریز ہندستان کو آزادی دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ جواہر لال نہرو ہندستان کی عارضی حکومت کے وزیر اعظم بنائے گئے۔ انھوں نے دہلی میں ایک مکان لیا، ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے اندرا گاندھی بھی لکھنؤ سے دلّی آتی رہیں۔

لوگ آزادی کی خوشیاں منا ہی رہے تھے کہ یکایک فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی وجہ سے گاندھی جی اور جواہر لال کی طرح اندرا گاندھی بھی بہت دکھی ہو گئیں۔ باپ بیٹی نے اس موقع پر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی۔ جواہر لال اس وقت ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے تھے، اس میں کل تین ہی کمرے تھے۔ انھوں نے اپنے آرام کی پروا کیے بغیر دو کمرے بے گھر لوگوں کو دے دیے۔ اور بنگلے کے احاطے میں خیمے نصب کرا دیے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سر چھپانے کی گنجائش نکل آئے۔

پناہ گزینوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کی ساری ذمہ داری اندرا گاندھی نے اپنے ذمّہ لے لی تھی، لوٹ مار اور دنگے فساد کی وجہ سے شہر میں کھانے پینے کی چیزوں کا ملنا دشوار تھا۔ مگر اندرا دوڑ دھوپ کر کے غذائی اشیا مہیا کرتی تھیں تاکہ کوئی شخص بھوکا نہ رہے، ایک روز ایک شخص چھُرا لیے ہوئے بنگلہ میں گھس آیا، وہ جواہر لال ہی کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا مگر اندرا گاندھی کی بہادری نے ان کی جان بچالی۔

اس زمانہ میں وہ اپنے دوسرے بچے کی پیدائش کی وجہ سے بڑی کمزور ہو گئی تھیں مگر اس کے باوجود مظلوموں اور بے گھر لوگوں کی امداد کے لئے وہ رات دن کام کرتیں اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کی بھی دیکھ بھال کرتیں۔

فسادات ملک کے کئی حصّوں میں پھیل گئے تھے، دلی خاص طور پر متاثر تھی، اندرا گاندھی کو جہاں فساد کی خبر ملتی وہاں فوراً پہونچ جاتیں اور اپنی جان کی پروا نہ کرتیں، ان کے جانے سے پولیس بھی پہونچتی اور ایک حد تک روک تھام ہو جاتی۔ حکومت نے پناہ گزینوں کے لیے جگہ جگہ کیمپ بنا دیے تھے۔ اندرا ان کیمپوں میں روزانہ جاتیں، لوگوں کا حال دریافت کرتیں، ان کی فریاد سنتیں، ان کو تسلی دیتیں اور ان کے کھانے کپڑے کا بندوبست کرتیں، ایک دن انھیں اچانک خبر ملی کہ ایک غریب مسلمان خاندان کو غنڈوں نے گھیر لیا ہے، اس وقت جواہر لال کہیں باہر گئے ہوئے تھے گھر میں وہاں ان کے دونوں چھوٹے بچے ہی موجود تھے جو اس وقت مشکل سے تو ایک ہی برس کے تھے، اس کے باوجود انھوں نے بچوں کو آیا کے سپرد کیا اور خود وہاں پہونچ گئیں۔ غنڈوں اور بیہودہ لوگوں نے اندرا کو بھی گالیاں دینا شروع کیں مگر وہ گالی گلوج کی پروا کئے بغیر سیدھی بھیڑ میں گھس گئیں، اور مسلمانوں کے گھر میں داخل ہو کر انھیں تسلی دی اور اپنے ساتھ جیپ پر بٹھا کر اپنے والد کے بنگلے پر لائیں۔ فساد کے زمانہ میں وہ دلی کی چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں میں بھی بے خوف و خطر جاتیں اور مظلوم لوگوں کی مدد کرتیں اور انھیں تسلی دلاتیں۔

جواہر لال ان دنوں بہت مشغول تھے، انھیں اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اندرا گاندھی ان کے آرام و راحت اور کھانے پینے کا پورا خیال رکھتیں۔ ان کی کوٹھی کا سارا انتظام ان ہی کے ذمّہ تھا، اور گھر کے اندر اور باہر کا سارا کام بھی وہی کرتی تھیں۔ باہر سے جو مہمان اور دوسرے ملکوں کے وفود جواہر لال نہرو سے ملنے کے لئے آتے سب کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی نگرانی کرتیں، ملک کے اندر کے جو لیڈر مرکزی وزرا، مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلا اور صوبائی کانگریس کے ارکان جواہر لال سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے، ان سے پہلے یہی ملتیں اور اکثر ان کے کام نپٹا دیتیں، تاکہ جواہر لال پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ وہ خود بھی اہم معاملات میں اندرا سے مشورے کرتے اور یہ انھیں اچھی صلاح دیتیں۔

اندرا گاندھی کی سیاسی تربیت بچپن ہی سے ہو رہی تھی، اس زمانہ میں ان کو اس کا اور زیادہ موقع ملا، وہ جواہر لال کے دور کے تمام سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر رہتی تھیں اور ان کی ممکن مدد بھی کرتی تھیں۔ ان کے زمانہ میں پہلی مرتبہ عام چناؤ ہوا تو اندرا گاندھی نے ان کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ دوسرے عام انتخابات میں انھوں بذات خود سارے ہندستان کا دورہ کیا اور گاؤں گاؤں گھوم پھر کر تقریریں کیں، اور جواہر لال کا ہاتھ مضبوط کرنے اور کانگریس پارٹی کو ووٹ دینے کی لوگوں کو تلقین کی۔

جواہر لال باہر کے ملکوں کا دورہ کرتے تو ان کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے اس طرح تمام ملکوں کے اہم لوگوں سے ان کو ملنے جلنے کا موقع ملتا۔ غرض ملک کے داخلی اور خارجی معاملات سے واقفیت کے علاوہ وہ اسی زمانہ سے اکثر سیاسی گتھیاں بھی سلجھانے لگی تھیں۔

اندرا گاندھی کو ان کی عظیم الشان قومی خدمات، ملک، پارٹی اور عوام کے کاموں میں شب و روز مشغول رہنے اور قومی و سیاسی مسائل میں اچھی سوجھ بوجھ رکھنے کی وجہ سے فروری ۱۹۵۹ء میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۲ برس کی تھی، لوگوں کو حیرت تھی کہ اس کم سنی میں وہ کیسے اس بھاری بھرکم ذمہ داری کو انجام دے سکیں گی۔ مگر انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کام کو انجام دے کر ثابت کر دیا کہ وہ اس بڑے عہدے کے لیے ہر طرح سے اہل ہیں۔

کانگریس کی صدارت کے زمانے میں انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ نئی نئی شاخیں قائم کیں۔ جلسوں میں لوگوں کو کانگریس کے اصولوں سے آگاہ کیا۔ کئی ریاستوں کے الجھے ہوئے مسائل حل کیے۔ مہاراشٹر اور گجرات کی دو ریاستیں بھی اسی دور میں وجود میں آئیں۔ مگر جواہر لال کے کاموں کی کثرت اور ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے انھوں نے ایک سال بعد ہی صدارت سے استعفا دے دیا۔ اس کے ایک سال بعد ان کے شوہر فیروز گاندھی دنیا سے چل بسے، اندرا گاندھی نے ان کے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی مگر موت کو کون روک سکتا ہے۔؟

اندرا گاندھی کو شوہر کی موت کا بڑا صدمہ ہوا مگر اس کے باوجود انھوں نے ملک کی خدمت کے جوش میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ اسی زمانہ میں جبل پور میں بڑا بھیانک فساد ہوا تو سارے کانگریسی لیڈروں سے پہلے وہ وہاں پہونچیں۔ ان کے ساتھ پولیس اور حفاظتی فوج کا کوئی آدمی نہ تھا۔ اندرا بڑی نڈر اور بہادر تھیں اس لئے اپنی جان کی پروا کیے بغیر خطرناک جگہوں پر پہنچ جاتی تھیں۔ چینی جارحیت کے زمانے میں وہ تیز پور کے محاذ جنگ پر پہنچ گئیں اور فوجیوں کی ہمت بندھائی، اور نیفا اور لداخ کا بھی دورہ کیا اور ضروری کپڑے، سامان اور غذائی اشیا بھجوائیں۔

چینی حملہ کے بعد ہی سے جواہر لال نہرو کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ان پر کام کا بھی بڑا بوجھ تھا، اس لئے اندرا گاندھی مستقل انھیں کی خدمت میں رہتیں۔ بالآخر ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو نہرو ہمیشہ کے لیے دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اندرا ابھی شوہر کا غم بھولی نہ تھیں کہ ایسے شفیق باپ کا صدمہ بھی انھیں اُٹھانا پڑا۔

جواہر لال کے بعد لال بہادر شاستری کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ یہ پنڈت جی کے خاص تربیت یافتہ اور معتمد علیہ تھے اور مزاج کے بڑے نرم اور ٹھنڈے تھے۔ پنڈت جی کے ساتھ کی وجہ سے ان میں اچھی سیاسی سُوجھ بوجھ تھی اور وہ صحیح معنوں میں ان کے پیرو تھے

شاستری جی کے دور میں اندرا گاندھی کو اطلاعات و نشریات کا وزیر بنایا گیا۔ ان کا اصل مقصد تو ملک و قوم کی خدمت تھا، اس لیے وہ وزارت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھیں مگر شاستری جی کے اصرار پر بالآخر انھیں یہ ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔ اس زمانہ میں انھوں نے روس کا سرکاری دورہ بھی کیا جس سے دونوں ملکوں کی دوستی مزید مضبوط ہو گئی اور روسیوں پر ان کی قابلیت و صلاحیت کا بھی سکہ بیٹھ گیا۔ لیکن لال بہادر شاستری کو زیادہ دنوں تک ملک کی خدمت اور وزارت عظمیٰ پر فائز رہنے کا موقع نہ ملا۔ ان کے زمانہ میں پاکستان سے جنگ ہوئی اور مسٹر کوسی گن کی کوشش سے ان کی اور پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خاں سے ملاقات اور تاشقند کا معاہدہ ہوا، مگر معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد ہی وہ وہاں انتقال کر گئے۔

اندرا گاندھی کو ان کے مختصر دور میں وزارت اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے کام کرنے کا جو موقع ملا تو اس میں انھوں نے بہتر اور عمدہ کارکردگی کی بنا پر ایسی نیک نامی حاصل کی کہ شاستری جی کی جانشینی کے لیے لوگوں کی انہی پر نظر پڑی۔ وہ اگرچہ کانگریس کے بڑے اور قدآور لیڈروں کے مقابلہ میں کم عمر تھیں لیکن ان کی تمام تر تربیت جواہر لال نہرو نے کی تھی اور وہ ملک کی سیاسی گتھیاں حل کرنے میں ہمیشہ ان کا تعاون کرتی تھیں، انھیں بین الاقوامی معاملات کا بھی اچھا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے بڑے لیڈروں کی موجودگی میں بھی ۱۹ر جنوری ۱۹۶۶ء کو بھارت جیسے عظیم ملک کی وزارت عظمیٰ کا کانٹوں بھرا تاج ان کے سر پر رکھا گیا، کچھ لوگوں کو ان کا وزیر اعظم بنانا پسند نہ تھا، ان لوگوں نے انھیں متفقہ وزیر اعظم بننے نہیں دیا، مگر یہ کم ہی لوگ تھے اس لیے انھیں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔

مسز اندرا گاندھی کے وزیر اعظم بننے کے بعد بے شمار مسائل اٹھے طلبا اور طلازمین کا مسئلہ، زبانوں اور صوبوں کی سرحدوں کا مسئلہ، ندیوں کے پانی کا مسئلہ، علاقائی اور فرقہ وارانہ جھگڑے اور سب سے بڑھ کر ملک کی سالمیت اور ایکتا کا معاملہ تھا مگر اندرا گاندھی نے ان سب مسائل کو بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے حل کیا، ۱۹۶۷ء کے عام چناؤ میں انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کی گئی، ان کے جلسوں میں ہنگامے ہوئے اور گڑبڑ کی گئی۔ بھوبنیشور (اڑیسہ) میں تقریر کرتے ہوئے ان پر پتھر پھینکے گئے، مگر وہ اس بے ہودگی سے بھی نہ گھبرائیں اور پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا۔ ان کی محنت اور لگن سے کانگریس پارٹی کامیاب ہوگئی اور وہ دوبارہ وزیر اعظم چن لی گئیں۔ مگر اس زمانہ میں بھی ان کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ زبان کے جھگڑے، ذات پات کے فتنے، مزدوروں کی ہڑتالیں، کاشت کاروں کے مسائل، طالب علموں کی بے چینی، پڑوسی ملکوں سے ان بن، اناج کی قلت، بے روزگاری اور صوبوں کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ ان سب مسئلوں کو اپنی ہوش مندی، دور اندیشی، ہمت اور بہادری سے حل کرتی رہیں اور کبھی پریشانی ظاہر نہ کی۔

ایک ایسا موڑ بھی آیا کہ خود کانگریس پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر اور معمر سیاست داں ان کے مخالف ہوگئے۔ بات یہ تھی کہ وہ ملک میں سوشلزم لانا چاہتی تھیں، غریبی اور بے روزگاری ختم کرنا چاہتی تھیں اپنی رواداری اور وسیع المشربی کی بنا پر وہ بلا امتیاز مذہب و قوم سب کو خدمت اور ترقی کا یکساں موقع دینا چاہتی تھیں۔ یہ ساری باتیں خود کانگریس کے اصول میں داخل تھیں اور بہت پہلے سے منظور چلی آرہی تھیں۔ اندرا گاندھی عوام کے مفاد میں ان کو عملاً نافذ و جاری کرنا چاہتی تھیں، اسی مقصد سے بینکوں کو قومیایا گیا، نوابوں، راجوں اور سرمایہ داروں کی ہتھیائی ہوئی بڑی بڑی زمینیں ان کے قبضے سے نکال کر غریبوں کے حوالہ کی گئیں، راجوں، مہاراجوں کو جیب خرچ کے لیے ملک کا کروڑوں روپیہ دیا جاتا تھا، اسے بھی بند کر دیا گیا۔ راشٹرپتی کے انتخاب میں متعدد سیاسی لیڈروں نے تنگ نظری کا ثبوت دیا، اندرا گاندھی نے اس رجحان کا بھی مقابلہ کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو صدر کے عہدہ پر متمکن کیا۔

انہی سب باتوں کی وجہ سے سرمایہ دار اور فرقہ پرست عناصر اور حکمراں جماعت کے تمام بڑے بڑے لیڈروں کو ان سے سخت عناد ہوگیا، اس کے نتیجہ میں کانگریس پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ اندرا گاندھی نے تنہا اپنے بل بوتے پر رجعت پسندوں، مخالف پارٹیوں کا مقابلہ کیا اور ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئیں اور متحدہ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں کو زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد وہ پیہم کامیابی حاصل کرتی گئیں۔

۱۹۷۷ء میں عوام کا بڑا طبقہ ان کا مخالف ہوگیا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے ملک کے پیچیدہ حالات کی وجہ سے ایمرجنسی لگا دی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر حکام نے ان کی مرضی و منشا کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا۔ حکام کے رویہ کی وجہ سے لوگ اندرا گاندھی سے ناراض ہوگئے۔ ان کے مقابلہ میں تمام مخالف پارٹیاں مل گئی تھیں، اس لیے اس دفعہ انھیں انتخاب میں شکست ہوگئی اور مخالف پارٹیوں کی حکومت قائم ہوگئی مگر وہ پانچ برس بھی ملک کو نہ چلا سکیں اور درمیانی الکشن کی نوبت آگئی اور ۱۹۸۰ء میں اندرا گاندھی دوبارہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئیں اور پھر انہی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔

اس دفعہ انھیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا، اس لیے دوبارہ انھوں نے نئے جوش و خروش اور بڑی امنگ و حوصلہ سے کام شروع کیا مگر چند ہی ماہ بعد ان کے چھوٹے اور نوجوان بیٹے سنجے گاندھی ایک سانحہ میں فوت ہوگئے، وہ اس زبردست صدمہ اور جانکاہ حادثہ کو بھی بہادری اور ہمت سے جھیل لے گئیں اور اس کے بعد بھی اسی محنت، لگن اور دلچسپی اور انہماک کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کرتی رہیں۔ مگر افسوس کہ بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے ان پر ظالمانہ اور بے رحمانہ حملہ کر کے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

انھوں نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں بڑے نمایاں اور عظیم الشان کام انجام دیے۔ ملک اور ملک کے باہر ہر جگہ ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا، اور وہ نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیا میں مقبول و محبوب تھیں۔ اندرا گاندھی نے بڑی سرگرم اور مشغول زندگی گزاری وہ شب و روز اپنے کاموں میں منہمک رہتی تھیں۔ وہ بڑی نڈر، بے باک، جری اور بہادر

(باقی ۲۳۶ پر)

امان اللہ خان شیروانی
پرنسپل حافظ محمد صدیق
اسلامیہ کالج۔ اٹاوہ (یو۔پی)

خاکہ

اندراجی

آریائی جامت، کاشیری ملاحت، آنکھوں میں خاندانی ذہانت اور گنگا جمنی شباہت سے ایک مجسمہ تیار کیا جائے اور اُسے موتی لال کی فراست، گاندھی جی کی بصیرت، ٹیگور کی دیدہ وری، نہرو کی بلند ہمتی، کملا کی دردمندی اور فیروز کی نرم روی کے رنگوں سے سجادیا جائے تو نہ صرف بھارت کی بلکہ بین الاقوامی عظیم شخصیت کا پیکر تیار ہو جائے گا۔ یہ عظیم شخصیت تھی محترمہ اندرا گاندھی سابق وزیراعظم ہند کی۔

اندراجی کی عظمت کا انحصار نہ تو ان کے وزیراعظم ہونے پر تھا اور نہ نہرو خاندان کے ایک فرد ہونے پر بلکہ ان کا بڑاپن ان کے انسان پرور خیالات اور ان کی وسعت نظری پر مبنی تھا۔ ذہانت ان کے پاس خداداد تھی، سیاست انھیں خاندان سے ورثے میں ملی تھی۔ تربیت ان کے والد بزرگوار پنڈت جواہر لال نہرو کی تھی، صحبت انھیں گاندھی جی کی میسر ہوئی اور تعلیم انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک کی بہترین درسگاہوں میں حاصل کی تھی لیکن ان سب آسائشوں اور آسانیوں کے باوجود ان کی عظیم شخصیت میں سب سے بیش بہا جوہر ان کی سوچ کا آفاقی دائرہ اور ان کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔

اندراجی کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو تھے۔ جلالی اور جمالی، ظاہری اور باطنی، ایک کا محرک دماغ تھا تو دوسرے کا دل وہ دُرگا کا رُوپ بھی تھیں اور سرسوتی کا سروپ بھی۔

بحیثیت وزیراعظم ان کا پہلا روپ ہی ملک کے لیے ضروری تھا، انگنت مسائل والے عظیم ملک کی وزارت عظمیٰ کے لیے دوربینی، دیدہ وری اور ہمہ تن گوشی اگر ضروری ہیں تو کم سخنی، سخت گیری، ضابطوں کی پابندی اور غیر جانبداری بھی لازمی ہیں۔ یہی خصوصیات شخصیت میں جلال، گرمی، طاقت، بُردباری اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہیں۔ وزیراعظم اندرا گاندھی بھی انھیں خصوصیات کا پیکر تھیں۔ لیکن وزیراعظم اندرا گاندھی کے اندر ایک اور اندرا بھی تھی جو حساس دل، پاک جذبات، دردمندانہ فطرت اور گل بداماں شخصیت کی مالک تھی۔ یہ ان کا باطن تھا۔ کبھی کبھی ملک سیاست اور سماج کے وسیع تقاضوں کی خاطر انھیں ان اندرونی جذبات کو چھپانا بھی پڑتا تھا اور کچلنا بھی۔ بظاہر یہ بات غیر منصفانہ معلوم ہوتی تھی لیکن اگر غور کیا جائے تو وسیع تر مفاد میں یہ انصاف پسندی بھی تھی۔ اس کی ایک مثال دینا کافی ہے۔ مرادآباد کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد کچھ مسلم لیڈران ان سے ملے اور وہاں بربریت کے ننگے ناچ کی طرف اندراجی کی توجہ مبذول کرائی۔ اندراجی نے تمام واقعات سکون سے سُنے خاموش رہیں۔ آنکھوں کی نمی اور چہرہ کا کرب بتا رہا تھا کہ اُن واقعات سے اُن کے قلب کو کتنی ٹھیس پہونچی ہے لیکن وزارتِ عظمیٰ اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ زبان خاموش رہے، لب نہ کھلیں صرف یہ

جملہ کہا "کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان سب باتوں کا مجھے کوئی احساس نہیں۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ مجھے کتنا احساس ہے' حالات کے تقاضے کے مطابق وہ سب کروں گی جو مجھے کرنا ہے " اس کے بعد تمام لیڈران خاموشی سے واپس چلے آئے۔ اندراگاندھی کا بیدار ذہن تعصب اور تنگ دل جذبات سے خالی تھا۔ وہ ایک باہمت اور عملی خاتون تھیں۔ شک و شبہات سے بالاتر۔

اندراجی اپنے بچپن میں بڑی بڑی آنکھوں ' تیکھے نقوش ' بھبیرے بالوں اور موہنی صورت والی ہونہار بچی تھیں۔ وہ بہادر بھی تھیں اور نڈر بھی۔ گڑیوں سے کھیلنے کے زمانہ میں بھی ان کا ذہن حالات کی گہرائی تک پہونچ جاتا تھا۔ وہ جو کچھ اپنے گھر میں دیکھتی تھیں ان کے بچپن کے ذہن پر نقوش بنتے جاتے تھے اور اسی لیے کبھی کبھی گڈے گڑیوں کے کھیل میں بھی جنتا کا جلوس اور انگریز فوجیوں کو بندوقیں لیے دکھایا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں یہ پوچھنے پر کہ وہ بڑی ہو کر کیا بننا چاہیں گی۔ ان کا جواب اکثر ہوتا تھا " میں جون آف آرک بننا چاہتی ہوں "۔

اندراجی کا جنم ایک بڑے گھرانے میں ہوا تھا لیکن مشہور و معروف گھرانوں میں جنم لینا کچھ آسانیوں کے ساتھ دشواریاں بھی لاتا ہے۔ اندراجی کے ساتھ بھی ایک دشواری تھی۔ وہ آزادی کے ساتھ برابر عمر والے بچوں میں نہیں کھیل سکتی تھیں۔ شہزادہ سدھارتھ (گوتم بدھ) کی طرح ان کو بھی دنیا کے غم و آلام سے دُور رکھنے کے لیے عام بچوں سے علاحدہ رکھا گیا تھا۔ ان کا دل بھی سدھارتھ کی طرح باہر کی دنیا کے لیے تڑپتا ہوگا لیکن خاندان کی مجبوریاں ' حالات کا تقاضا اور پھر والدین کی مصروفیت نے انھیں ایک الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ مگر اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان میں ذہن کی بیداری' مطالعہ کا شوق ' مشاہدہ کی گہرائی اور حالات کو سمجھنے کی طاقت بچپنے ہی سے آگئی تھی۔ اس لیے ان کے یہ اوصاف گڈے گڑیوں کے کھیلوں میں ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ کچھ اوصاف تو انھوں نے اپنے خاندان سے ورثہ میں پائے تھے مثلاً مستقل مزاجی' ارادوں کی استقامت' دردمندی اور انسانی ہمدردی لیکن کچھ اوصاف ان میں مخصوص تعلیم و تربیت اور اعلیٰ شخصیتوں کی صحبت سے پیدا ہو گئے تھے جیسے دلیری' مستحکم مزاجی اور فیصلہ کن ذہانت۔

محترمہ اندراگاندھی کی پیشانی کے بلوں میں جتنی طاقت تھی اُتنی ہی مٹھاس اُن کی مسکراہٹ میں بھی تھی۔ ان دونوں کو وہ سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ ملک کے ایک بڑے سیاسی لیڈر سے اُن کے کچھ غلط کاموں کی وجہ سے ناراض ہو گئی تھیں۔ جب پانی حد سے اوپر آگیا تو انھوں نے ان لیڈر صاحب کو طلب کیا اور صرف پیشانی پر بل ڈال کر ایک کاغذ کا ٹکڑا انھیں دے کر وہ اٹھ گئیں۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا "جتنی جلد ہو سکے استعفا عنایت فرما دیں " بیچارے لیڈر صاحب کو صفائی کا موقع بھی نہیں دیا۔ ظاہر ہے چند گھنٹوں میں یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ ایک ریاست کے چیف منسٹر صاحب نے استعفا دے دیا ہے۔

اندراجی کے اندر اتنی زبردست قوّتِ ارادی اور فیصلہ کن ذہانت تھی کہ کسی کو بھی ان کے سامنے چوں چرا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح جہاں ان کی ذرا سی خفگی بڑے بڑے سیاست دانوں اور افسروں کے دل دہلا دیتی تھی۔ وہاں ان کی مسکراہٹ دشمنوں کے دل جیت لیتی تھی کیونکہ اگر ایک طرف ان میں سختی ' عزم ' جرأت ' ارادے کی مضبوطی جیسی مردانہ خوبیاں تھیں تو دوسری طرف نرمی ' ممتا ' خدمت کا جذبہ ' اور ہمدردی جیسے نسوانی اوصاف بھی تھے۔ دھنک سات خوبصورت رنگوں کا امتزاج ہے۔ لیکن اندراجی کی شخصیت میں بقول سلمیٰ صدیقی سات

رنگوں سے بھی زیادہ کرشمہ کاری تھی : ان میں ایک طرف خوداعتمادی تو دوسری طرف دردمندی تھی، ایک طرف عزم اور ہمت تو دوسری طرف نیکی اور شرافت بھی تھی، ایک طرف طاقت اور جرأت تو دوسری طرف گہرے درد کی کسک اور انسانیت کے دکھوں کا کرب بھی موجود تھا۔ غرضیکہ وہ "گلستاں اور بیاباں دونوں سے گزرنے کی ہمت رکھتی تھیں "

انھیں سخت سے سخت آزمائش کے وقت بھی آزمائش سے اونچا پایا گیا ان کی شخصیت کا ایک رُخ بنگلہ دیش کی جنگ اور بلیو اسٹار آپریشن میں نظر آتا ہے تو دوسرا عوامی دکھ درد میں شمولیت اور دنیا میں امن وشانتی کی کھوج میں نمایاں ہوتا ہے۔

اندراجی کو نجی زندگی میں دو چیزوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ سجاوٹ اور بچوں کا ساتھ۔ انھیں گلدان سجانے، خوبصورت لباس پہننے۔ باغوں میں سیر کرنے اور موقع ملنے پر ناچ رنگ کی محفلوں میں شرکت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اسی طرح بچوں سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ بچوں کی بھلائی اور خوشی کے لیے انھوں نے بہت سے کام کیے۔ آخر میں وہ معذور بچوں کی آبادکاری میں بڑی دلچسپی لے رہی تھیں۔ اپنے گھر میں بھی وہ ہمیشہ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ نہ صرف کھیلنے کا وقت نکال لیتی تھیں بلکہ ان کے اسکولوں کے کاموں میں بھی مدد کرتی رہتی تھیں۔ اکثر ان کو جلسوں، نمائشوں اور میلوں میں اپنے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ ان کا ذہن چاہے کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو وہ بچوں کے سوالوں کے جواب دینا کبھی نہیں ٹالتی تھیں۔ موقع پڑنے پر وہ کسی چھوٹے بچّہ کا منھ صاف کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے ایک برطانوی اخبار نویس نے کہا تھا" اندراگاندھی بچوں کے نیپکن تبدیل کرنے والی دنیا کی واحد وزیراعظم ہیں "

اندراجی فطری طور پر عوامی لیڈر تھیں۔ عوام میں اٹھنا بیٹھنا، اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونا، ان کے خیالات معلوم کرنا اور اُن کے مسائل کو سلجھانا، انھیں پسند تھا۔ لیکن بحیثیت وزیراعظم انھیں ان سب باتوں کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ سیاسی امور اور حکومت کے کاموں میں اتنا مصروف رہتی تھیں۔ کہ باوجود دلی خواہش کے وہ جسمانی طور پر عوام میں گھلنے ملنے کا وقت نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس کا ثبوت اس وقت ملا جب وہ کچھ عرصہ کے لیے وزیراعظم نہیں رہی تھیں۔ بہار کے ایک اندرونی علاقہ میں زبردست سیلاب آگیا تھا، کوئی بھی رہنما وہاں تک نہیں پہونچ پایا کیونکہ اس علاقہ میں پہنچنا بہت مشکل تھا اور وہاں کوئی سواری نہیں جا سکتی تھی۔ لیکن اندراجی وہاں ہاتھی پر چڑھ کر پہونچیں اور وہاں کے باشندوں کو اپنی ہمدردی، جذبات، احساسات اور اپنی من موہنی مسکراہٹ سے تسلّی وتشفّی کے خزانے لٹا آئیں۔ اسی طرح انھیں دنوں وہ علی گڑھ میں شیروانی خاندان کی ایک شادی میں شرکت کرنے پہونچ گئیں اور نکاح میں شرکت کرنے کے لیے دولھا میاں کے ساتھ تخت پر بیٹھی رہیں اور زنان خانہ میں جاکر مستورات کے ساتھ بہت سی رسموں میں بھی شرکت کی۔ بقول کرشن چندر" اُن کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے سطحی سیاست سے بے پروا ہو کر اعلا سیاست کی نمائش کی لیکن عوامی سطح پر آکر لوگوں کی طلب پوری نہیں کی بلکہ اپنی سطح پر انھیں سیاست کے جلوۂ صدرنگ دکھائے۔ شاید یہ ان کی ذہنی بلوغیت کے ساتھ ان کے پدر بزرگوار پنڈت نہرو کی صحبت کا بھی اثر تھا اور خواجہ احمد عباس کے الفاظ میں" ان کے فیصلوں میں تلواروں کی کاٹ ہوتی تھی تو ان کے خوابوں میں گلوں کی خوشبو بھی "

●●• ———

اندرا گاندھی کی تواریخ

شریمتی اندرا گاندھی ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو شری جواہر لال نہرو کے یہاں الہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے وشو بھارتی شانتی نکیتن، پیپلز اون اسکول پونا، بمبئی، سمرویل کالج آکسفورڈ، بیڈمنٹن اسکول برسٹل اور سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پائی۔ انھیں آندھرا، آگرہ، جگور وکرم، پنجاب، گوروکل، ناگپور، جامعہ ملیہ، پونا، ایل سلواڈور آف اکرس، وسدا آف ٹوکیو، ماسکو اسٹیٹ، آکسفورڈ، چارلس آف پراگ، ماریشس، بغداد، ساؤتھ پیسیفک (فجی)، صوفیہ آف بلگاریہ، سوربون، یو ایس ایس آر اکاڈمی آف سائنسز اور کیو اسٹیٹ یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو ان کی شادی شری فیروز گاندھی سے ہوئی۔ ان کے یہاں دو فرزند شری راجیو گاندھی اور سنجے گاندھی پیدا ہوئے۔ انھوں نے بچپن سے ہی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ چھوٹی سی عمر ہی میں انھوں نے بال چرخہ سنگھ کی بنیاد رکھی۔ تحریک عدم تعاون کے دوران کانگریس پارٹی کی مدد کرنے کی غرض سے ۱۹۳۰ء میں انھوں نے 'وانر سینا' منظم کی۔

ستمبر ۱۹۴۲ء میں انھیں گرفتار کیا گیا اور ۱۹۴۷ء میں انھیں دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی کی ہدایت پر انھوں نے دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں کام کیا۔ ۱۹۵۵ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور کانگریس کی سنٹرل الکشن کمیٹی کی رکن، ۱۹۵۸ء میں کانگریس کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کی رکن، ۱۹۵۶ء میں آل انڈیا یوتھ کانگریس کی صدر، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قومی یکجہتی کونسل کی چیرمین، ۱۹۵۹-۶۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی صدر اور جنوری ۱۹۷۸ء سے انڈین نیشنل کانگریس (آئی) کی صدر تھیں۔

شریمتی گاندھی ۱۹۶۴-۶۶ء کے دوران حکومت ہند میں اطلاعات و نشریات کی وزیر رہیں۔ جنوری ۱۹۶۶ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک نیز ۱۴ جنوری ۱۹۸۰ء سے اپنی وفات تک وہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہیں۔

وہ کئی تنظیموں اور اداروں سے وابستہ رہیں۔ ستمبر ۱۹۸۲ء میں وہ وشو بھارتی کی دوبارہ چانسلر مقرر کی گئیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک یونیسکو کے بھارتی وفد کی رکن رہیں۔ اس مدت کے دوران وہ یونیسکو کی ایگزیکیٹو بورڈ کی رکن بھی رہیں۔ وہ ۱۹۶۲ء میں قومی دفاعی کونسل کی بھی رکن رہیں۔ اس سال وہ قومی دفاعی فنڈ کی ایگزیکیٹو کمیٹی کی رکن بھی رہیں۔ ۱۹۶۲ء میں شہری مرکزی کونسل کی چیرمین، اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۴ء تک سنگیت ناٹک اکاڈمی کی چیرمین رہیں، وہ قومی یکجہتی کونسل کی رکن بھی رہیں، وہ ہمالین ماؤنٹینیرنگ انسٹی ٹیوٹ، دکشن بھارت پرچار سبھا، نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری سوسائٹی اور جواہر لال نہرو میموریل کی صدر بھی تھیں۔ وہ بین الاقوامی قانون سے متعلق بھارتی سوسائٹی کی سرپرست بھی تھیں۔

۲۶ اگست ۱۹۶۴ء سے فروری ۱۹۶۷ء تک راجیہ سبھا کی رکن رہیں۔ وہ چوتھی لوک سبھا ۱۹۶۷ء، پانچویں لوک سبھا ۱۹۷۱ء اور چھٹی لوک سبھا (نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء) کی رکن رہیں اور جنوری ۱۹۸۰ء میں ساتویں لوک سبھا کے لیے وہ رائے بریلی (اتر پردیش) اور میدک (مدھیہ پردیش) سے منتخب کی گئیں۔ بعد میں انھوں نے میدک کی نشست کو برقرار رکھا اور رائے بریلی کی نشست چھوڑ دی۔ وہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کی قائد رہیں اور جنوری ۱۹۸۰ء سے کانگریس (آئی) پارلیمنٹری پارٹی کی قائد رہیں۔

وہ جو بھی کام کرتی تھیں اس میں خوشی محسوس کرتی تھیں مختلف فنون سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی انھیں کوہ پیمائی اور نئے موضوعات کے بارے میں مطالعہ کرنا پسند تھا۔

سال ۱۹۷۲ء میں انھیں بھارت رتن، بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے ۱۹۷۲ء میں میکسیکن اکاڈمی ایوارڈ ۱۹۷۳ء میں غذائی اور زندگی تنظیم کا دوسرا

سالانہ میڈل، ۱۹۷۶ء میں ناگری پرچارنی سبھا کا ساہتیہ واچسپتی (ہندی) کا خطاب ملا۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں امریکہ کا مدر ٹریسا ایوارڈ اور غیر معمولی تدبر کے لیے اٹلی کا ایزابیلا دی ایستے ایوارڈ ملا۔ انھیں ییل یونیورسٹی کا ہالینڈ میموریل انعام بھی ملا۔ فرانس کے رائے عامہ سے متعلق ادارے کے ذریعہ جمع کی گئی آراء کے مطابق وہ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء مسلسل دو برسوں تک فرانسیسی خواتین کی طرف سے مقبول ترین خاتون قرار دی گئیں۔ امریکہ میں لیے گئے ایک خصوصی جائزے کے مطابق وہ ۱۹۷۱ء میں دنیا کی سب سے زیادہ مقبول خاتون تھیں۔ ۱۹۷۱ء میں ہی ارجنٹائن سوسائٹی نے انھیں جانوروں کے تحفظ کے لیے ڈپلومہ آف آنر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں جنگلی جانوروں سے متعلق عالمی فنڈ کا آرڈر آف دی گولڈن آرک دیا گیا۔ شمال مشرق مفاہمت کے لیے ۱۹۸۲ء میں انھیں یوتھانٹ ایوارڈ اور اس سال امریکہ کی آبادی سے متعلق کونسل کے ممتاز پارلیمانی امور کے ماہر کا ایوارڈ دیا گیا۔

تصنیفات:۔ ان کی تصنیفات میں دی ایرس آف چیلنج ۷۶-۱۹۶۹ء دی ایرس آف انڈیپنڈنس ۱۹۷۲-۱۹۶۶ء انڈیا، ان ڈے، اٹرنل انڈیا، مادیر شنے، مائی ٹرتھ، پیپلس اینڈ پرابلمس وغیرہ شامل ہیں۔

انھوں نے ہندوستان اور پوری دنیا کا سفر کیا۔ انھوں نے افغانستان، الجیریا، ارجنٹائن، آسٹریلیا، آسٹریا، بنگلہ دیش، بلجیم، بھوٹان، برازیل، بلغاریہ، برما، کینیڈا، چلی، چین، کولمبیا، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، مصر، فجی، فن لینڈ، فرانس، عوامی جمہوریہ جرمنی، وفاقی جمہوریہ جرمنی، گھانا، گوئنا، ہنگری، انڈونیشیا، ایران، عراق، آئرلینڈ، اٹلی، جمائیکا، جاپان، کویت، لاؤس، لبنان، مالدیپ، ماریشس، منگولیا، میکسیکو، موزمبیق، نیپال، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، نائجیریا، ناروے، عمان، پاکستان، فلپائن، پولینڈ، پرتگال، رومانیہ، سعودی عربیہ، سیشلز، سنگاپور، اسپین، سری لنکا، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، شام، تنزانیہ، تھائی لینڈ، ٹونگا، ترینیداد اور ٹوباگو، متحدہ عرب امارات، برطانیہ اور دوگوسے امریکہ، روس، وینیزویلا، ویت نام، زامبیا، زمبابوے، اور اقوام متحدہ کے سرکاری دورے کیے۔

(بشکریہ: پی۔ آئی۔ بی)

یادوں کا ورثہ : صفحہ ۲۰۳ کا بقیہ

بعد چک منگلور سے وہ دوبارہ لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئیں میں انھیں مبارکباد دینے گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں اور انھوں نے کہا تھا کہ سنیل یہ میری فتح نہیں ہے بلکہ عوامی جذبہ کی جیت ہے اور تم دیکھ لینا کہ اس عوامی جذبہ کی مکمل فتح ہوگی۔

عوام یہ سب (جنتا حکومت کی بد انتظامی) زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے ابھی تک ان کے یہ الفاظ یاد ہیں۔ ان کے یہ الفاظ کتنے سچ تھے اس کا فیصلہ آنے والے وقت نے کر دیا۔

انفرادی طور سے وہ میری کتنی خیر خواہ تھیں یہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ۱۹۶۹ء میں جب ایک بار میں ان سے ملا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ "سنیل تم مجھ سے زیادہ نہ ملا کرو، تم سرکاری ملازمت میں (بینک میں) ہو مجھ سے زیادہ ملنے جلنے سے تم پر خفیہ پولیس لگ سکتی ہے اور تم پر کوئی مصیبت آسکتی ہے" میں نے ان سے کہا تھا: اندرا جی میرا خاندان ہمیشہ سے ہی آپ کا حامی رہا ہے اور ملک کی بھلائی کے لیے میں آپ کی پالیسیوں کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ایک نڈر باپ کی اولاد ہوں اور ایسے ہی بے خوف ہو کر آپ سے ملتا رہوں گا۔"

۱۹۸۰ء میں انتخابات ہونے پر وہ دوبارہ برسر اقتدار آگئیں اور اسی سال اسمبلیوں کے انتخابات ہونے پر انھوں نے مجھے گورکھپور سے الیکشن لڑنے کا موقع دیا۔ ان کے آشیرواد سے میں کامیاب بھی ہوا اور پہلے نائب وزیر بعد میں وزیر ریاست اور اب کابینی وزیر کی حیثیت سے ریاست کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔

اندرا جی چلی گئیں ہیں اب ——— میرے پاس صرف رہ گیا ہے ان کی یادوں کا ورثہ جو آئندہ بھی میری رہنمائی کرتا رہے گا اور مجھے تقویت پہنچاتا رہے گا۔

منظر سلطان

روشنی کا سفر

سرخیاں
نیلگوں آسماں کی جبینوں پہ چاروں طرف
خون کی جم گئیں
وقت کے ساز پر ضرب کاری پڑی
چیخ نکلی، فضا میں دھواں بھر گیا
کانپتی انگلیاں
ڈگمگاتے قدم
قلب کی بے زباں دھڑکنیں تھم گئیں
شہروں شہروں
گلی در گلی
بس یہی ایک آواز تھی گونجتی
پھر اخوت کے سینے پر گولی چلی
پھر اندھیرا۔ چراغوں کی روشن لویں
چاٹ جانے کی خاطر
دبے پاؤں آبادیوں سے گذرنے لگا
وار کرنے لگا
زندگی موت میں جنگ ہونے لگی
عصبیت، درد کا بیج بونے لگی
آخرش
روح سے جسم کا رابطہ منقطع ہو گیا
ایک اعلیٰ مدبر۔ مفکر۔ مجاہد جدا ہو گیا
جسم مٹ بھی گیا
راکھ بٹ بھی گئی
لیکن اس کا عمل
(اس کے پیغام و آدرش کی روشنی
گفتگو اور کردار کی پختگی)
روزِ روشن کی مانند زندہ رہا
آج کیا
آنے والے زمانے کی تاریخ میں
ہر ورق
ہر صفحہ
حرفِ زرتار سے ہی لکھا جائے گا —!!

شہیدِ وطن

دلکش بدایونی
محلہ برئے نو
بدایوں (یوپی)

صاحبِ اختیار کے چرچے
عظمتِ پُر وقار کے چرچے
ہر طرف سوگوار کرتے ہیں
ماتمِ غمگسار کے چرچے
زینتِ دہر ہو چکی رخصت
ہو چکے اب بہار کے چرچے
ایک گیسو دراز چھوڑ گیا
زلفِ لیل و نہار کے چرچے
باہمی شرحِ آشتی کہیے
گل کے ہونٹوں پہ خار کے چرچے
جب محبت پہ تبصرہ ہوگا
ہوں گے اس شاہکار کے چرچے
ذکرِ کیف و خمار چھوڑ گئے
لطفِ کیف و خمار کے چرچے
جن کا صبر و قرار لوٹ لیا
اُن سے صبر و قرار کے چرچے
بعد اُن کے جگر میں چبھنے کو
ہیں غمِ نوکِ خار کے چرچے
ہیچ اس دہرِ بے ثبات میں ہیں
عمرِ ناپائیدار کے چرچے
اے شہیدِ وطن ہر اک دل میں
ہیں تری یادگار کے چرچے
مٹ نہیں سکتے دل سے اے دلکشؔ
تیرے نقش و نگار کے چرچے

شمیم امروہوی
قاضی زادہ - امروہہ (یوپی)

محترمہ اندرا گاندھی کی اچانک رحلت پر

قطعۂ تاریخ

۱۴۰۵ھ

نئی منزل کی جانب جا رہی ہے
دیارِ ہند کی وہ رہنما اب
نہ آئے گا نظر اب اس کا چہرہ
نہ سن پائیں گے ہم اس کی صدا اب
ہم اس کے نقشِ پا محفوظ کرلیں
دکھائیں گے ہمیں وہ راستا اب
برائے امنِ عالم جان دی ہے
نہ بن پائے تصادم کی فضا اب
اندھیرے چھا نہیں سکتے چمن میں
اجالا کر گئی اس کی چتا اب
تقاضا "شانتی دن" کا یہی ہے
کوئی مصرع کہو تاریخ کا اب
صدا آئی بصد تکلیف کہہ دے
ہوا ہے ختم عہدِ اندرا اب

۱۴۰۵ھ

شریک صدمہ والام شمیم امروہوی

۱۴۰۵ھ

ڈاکٹر معراج نفیس
شعبۂ سماجیات لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

مادرِ وطن

وہ مادرِ وطن وہ مسیحا نہیں رہی
جانے سے اس کے رونقِ دنیا نہیں رہی
جس نے دیا وزارتِ عظمیٰ کو اک وقار
وہ تمکنت وہ شان سراپا نہیں رہی
جس نے وطن کی آن بڑھائی جہان میں
جس نے چمن کو خون سے سینچا نہیں رہی
اس کی نظر میں سارے مذاہب تھے محترم
وہ پاسبان دیر و کلیسا نہیں رہی
لگتا ہے جیسے دور کا اک خاتمہ ہوا
جس روز سے وہ جانِ تمنا نہیں رہی

منظر ندیمی
۱۲۰ - اسمٰعیل نگر، میرٹھ

خراجِ عقیدت

* قطعہ

نہ اپنی شہرت و ناموس بے بہا کے لیے
نہ سالمیتِ احیائے نقشِ پا کے لیے
وطن نواز اصولوں کے ارتقا کے لیے
بہا ہے خون ترا اس ملک کی بقا کے لیے

علی احمد دانش
۳۴۷/۱۲۴ محلہ شاہ میرانیس چوک لکھنؤ ۳

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا

(بہ یادِ محترمہ اندرا گاندھی)

ہے پشیمان تمنائے جفا تیرے بعد
تنگ و تاریک ہے عالم کی فضا تیرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا "تیرے" بعد

جان سی شے کو کیا تو نے وطن پر قربان
ہے زبانوں پہ تری جرأت و ایثار کی بات
زندگی نام ہے ملت پہ فدا ہونے کا
موت کے سائے میں تو نے دیا پیغامِ حیات

ہند کی عظمتِ رفتہ کے فسانے کہہ کر
تو نے امروز کو فردا کا تصور بخشا
دے دیا ڈوبتی نبضوں کو ابھرنے کا شعور
دلِ مایوس کو احساسِ تہوّر بخشا

گو ترا پیکرِ خاکی ہے نہاں نظروں سے
تیرے انفاس کی خوشبو سے مہکتا ہے چمن
ہے تری فکر سے شاداب ہر اک لالہ و گل
تیری نظروں کی تجلی سے دمکتا ہے چمن

رافع بن خالد
بارہ بنکی

خون کی آواز

اندرا گاندھی امر ہیں ان کی ہستی زندہ باد
روشنی ان کے اصولوں کی سدا پائندہ باد
اندرا فکر و عمل کی تازگی کا نام ہے
اندرا عقل و فراست آگہی کا نام ہے

اندرا سارے جہاں میں امن و الفت کی سفیر
اندرا خاتون لیکن اک بہادر بے نظیر
اندرا کی زندگانی دیش سیوا کا سبق
اس نے لکھا ہے نئی تاریخ کا ہر اک ورق

تیسری دنیا کا رہبر ہند اس کے دم سے ہے
اس لیے ہر ایک دل بیتاب اس کے غم سے ہے
ظالموں نے گولیوں سے اس کو چھلنی کر دیا
خون کے ہر ایک قطرے سے مگر آئی صدا

متحد رہنا ہمیشہ دیش والو پیارے
پھوٹ سے فرقہ پرستی سے نہ بیٹھو ہار کے
سارے صوبے سارے مذہب زبانیں ایک ہیں
شنکھ کی آواز گربانی اذانیں ایک ہیں

اندرا کے خون کی آواز سن لو دوستو
تم چتا کی راکھ سے کچھ پھول چن لو دوستو

عارف جائسی
سب پوسٹ آفس، تفضیاز ضلع رائے بریلی

وطن کی آبرو جاتی رہی

(قطعات)

اپنی گہری فکر سے ذہنوں کو گرماتی رہی
ہر مصیبت دل پہ سہہ کر پھول برساتی رہی
اک نہ اک دن یوں تو ہر انساں کو مرنا ہے مگر
تیرے مرنے سے وطن کی آبرو جاتی رہی

ساری دنیا کے جھک گئے پرچم
دیکھئے شان سربراہی کی
اُف وہ تاریخ ساز شخصیت
جس نے ہر دل پہ بادشاہی کی

اپنی پیہم کوششوں اور اپنی جدوجہد سے
ایک حد تک کم ہی کر دی دیش کی پسماندگی
ہر پریشانی سے وہ لڑتی رہی مردانہ وار
صنفِ نازک اور اس میں اس قدر مردانگی

نہ غرض مال و زر سے تھی تجھ کو
نہ ہوس دل میں واہ واہی کی
ہر تکلف سے بے نیاز رہی
اور بے لوث سربراہی کی

کاشف لکھنوی
۵/۱۹۹ باغ آئینہ بی بی
حسین گنج لکھنؤ

زندہ باد اے اندرا گاندھی

زندہ باد اے اندرا گاندھی فدا کارِ وطن
تیرے قدموں پہ نچھاور کیوں نہ ہوں اہلِ چمن
کیوں نہ تیرے گیت گائیں اس زمیں کے مرد و زن
کیوں نہ تیرے ذکر سے سرشار ہو یہ انجمن
تیرے ہی خوں سے چمن میں آج ہے رنگِ بہار
اے وزیرِ اعظم وطن کی جان و دل تجھ پہ نثار
ہر طرف تو نے جلائے عزم و ہمت کے چراغ
جن سے روشن ہو گئے اہلِ گلستاں کے دماغ
جو بھٹکتے تھے ملا ان کو بھی منزل کا سراغ
ہر کس و ناکس تھا تیری رہبری سے باغ باغ
تیری کوشش کا نتیجہ بن کے آئی ہے بہار
مٹ نہیں سکتے ترے قدموں کے اب نقش و نگار
اے وقارِ ملک و ملت تیری عظمت کو سلام
وقف تھی سب کے لیے جو اس محبت کو سلام
سرزمینِ ہند سے تیری عقیدت کو سلام
تیری ہمت کو سلام اور تیری جرأت کو سلام
پھول کچھ اشعار کے تیرے لیے ہم لائے ہیں
کر قبول اس کو جو ہم نذرانہ لے کر آئے ہیں

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی

اندرا گاندھی

اے مری محبوب لیڈر اندرا شانِ وطن
تیرے مرجانے سے ہے ویران اب سارا چمن

ہر کلی ہے مژدہ ہر پھول مرجھایا ہوا!!
ہر گلی کوچہ میں سناٹا سا ہے چھایا ہوا

نرم و نازک جسم تیرا گولیوں کا ہو شکار
کون اب اپنے محافظ کا کرے گا اعتبار

فخرِ ملک و قوم میں ہر وقت سرگرداں تھی تو
باغِ ہندستان کے ہر ہر پھول پر قربان تھی تو

اک گھڑی آرام کرنا بھی سمجھتی تھی حرام
کرلیے تھے اپنے ذمہ ارتقا کے اتنے کام

اٹھ پڑیں تو پھر غریبوں کی مدد کے واسطے
ان کی زحمت دور کرنے کے نکالے راستے

کس قدر طاقت تھی تیری فکر کی پرواز میں
میں نکلتے تھے ترقی کے ترانے آواز میں

جب تو ہی پر ترے ہندوستان کو ناز تھا
تیری انسان دوستی پر کل جہان کو ناز تھا

نغمہ زن ہے عندلیبانِ چمن کے دل میں تو
مسند آرا ہے محبانِ وطن کے دل میں تو

ڈاکٹر بیگ جعفری
ڈی/۸۴ . ایل، ڈی، اے کالونی
عیش باغ . لکھنؤ

مادرِ ہندوستان

تیرے دم سے سرخرو ہے چہرۂ ہندوستاں
کامراں در کامراں ہے تیرا دورِ حکمراں
زندگی کے ہر قدم پر تھا تیرا اک امتحاں
فیصلوں نے تیرے دکھلایا ہے منزل کا نشاں
بن گئی تو اس صدی میں امنِ عالم کی زباں
مرحبا! اے اندرا اے مادرِ ہندوستاں

اے جہاں کی دلاری، دخترِ گنگ و جمن
کملا بائی کا دل اور جواہر لال کا بدن
اے اہنسا کی پجارن، شانتی کا بانکپن
تیری قربانی ہمیشہ یاد رکھے گا وطن
اب تو اونچا ہی رہے گا تیرے پرچم کا نشاں
مرحبا! اے اندرا اے مادرِ ہندوستاں

دوستی کی بات بڑھ کر دشمنی تک آ گئی
نفرت و بے گانگی کی ایسی بدلی چھا گئی
ظلم کی گولی ترے سینے سے جو ٹکرا گئی
عظمت و ہمت کی دیوی جیسے دھوکا کھا گئی
زندگی سے موت بڑھ جائے گی تھا کس کو گماں
مرحبا! اے اندرا اے مادرِ ہندوستاں

شمیم حنفی

گڑیا گھر

بڑی بڑی کالی آنکھوں، بھورے بالوں، تیکھے نین نقش اور موہنی صورت والی اُس ننھی سی بچی کے پاس بہت سی گڑیاں اور گڈّے تھے۔ اُس کا کمرہ ایک اچھا خاصا گڑیا گھر تھا۔ دیس بدیس کی گڑیاں۔ کچھ گڑیاں اُس کے دادا جی نے خاص طور پر ولایت سے منگوائی تھیں۔ ان گڑیوں کے لباس بھی ولایتی تھے۔ کچھ گڑیاں ہندستانی تھیں، کشمیر کی، بنگال کی، راجستھان کی، پنجاب کی، اتر پردیش کی۔ ان گڑیوں گڈّوں میں کئی دولھا دُلھن تھے، زری اور مخمل کے چمکیلے، رنگ برنگے کپڑے پہنے۔ ایک گڈّا اٹھانے پر آواز بھی نکالتا تھا۔ ان گڈّے گڑیوں میں کسان مرد اور عورتیں تھیں۔ نوکر تھے۔ بھشتی تھے۔ چپراسی تھے۔ سپاہی تھے۔ راجے اور رانیاں تھیں۔ راج کمار اور راج کماریاں تھیں۔ ماسٹر صاحب تھے۔ طالب علم تھے۔ پجاری تھے۔ انگریز فوجی تھے۔ بینڈ ماسٹر تھے۔

بڑی دیر سے وہ بچی ان گڈّے گڑیوں کو فرش پر ایک ساتھ سجانے میں لگی ہوئی تھی۔ اسے ایک الجھن بار بار ستا رہی تھی، یہ کہ بھانت بھانت کے گڈّے اور گڑیاں ایک ساتھ سجائی کیسے جائیں؟ سپاہی کی جگہ لڑائی کا میدان ہے۔ ماسٹر صاحب کی جگہ اسکول، دولھا دُلھن کی جگہ شادی کا منڈپ۔ کسان کی جگہ گاؤں اور کھیت۔ انگریز فوجی کی جگہ چھاؤنی۔ پجاری کی جگہ مندر ——

ان گڈّوں گڑیوں کو ایک ساتھ رکھا جائے تو سارا ماحول تتر بتر ہو جاتا ہے۔ نہ تو اسکول دکھائی دیتا ہے نہ دربار، گھر نہ بازار۔ وہ بچی بار بار گڑیوں گڈّوں کی ترتیب بدلتی۔ ایک کو پیچھے ہٹاتی دوسرے کو آگے بڑھاتی۔ پھر گہری، خاموش نگاہوں سے یہ تماشا دیکھتی اور گردن ہلاتی —— "نہیں —— یہ بھی نہیں!" بات کسی طرح بن نہیں پا رہی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ جلدی سے اُس بچی نے کاغذ کا بنا ہوا ترنگا جھنڈا میز کی دراز سے نکالا اور تمام گڑیوں گڈّوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ آگے جھنڈا تھا —— اس کے پیچھے کسان، مزدور، بھشتی، کاریگر، نوکر، دولھا، دلھن، راجے، رانیاں، چپراسی، ماسٹر صاحب، طالب علم، پجاری۔ بچی نے شرارت بھری نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اے گڑیو گڈّو! یاد رکھنا! تم ستیہ گرہی ہو۔ آزادی کی لڑائی میں شامل۔ ترنگے جھنڈے کے پیچھے تم ایک ساتھ جمع ہو گئے ہو!"

اتنا کہہ کر اُس نے انگریز فوجی گڈّے جن کے کاندھوں پر بندوقیں تھیں، اس بھیڑ کے سامنے کھڑے کر دیے۔ پھر دھیرے دھیرے دونوں طرف کے گڑیوں گڈّوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھسکانا شروع کیا۔ ایک طرف ہندستانی ستیہ گرہی، آزادی کے متوالے۔ دوسری طرف انگریزی سامراج کے رکھوالے —— دونوں طرف کے گڑیاں گڈّے آگے بڑھتے رہے۔ انگریز فوجی گڈّے بندوقیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہندستانی ستیہ گرہی ہنستے تھے۔ فوجی گڈّے ان کی طرف اس طرح بڑھے جیسے بندوق کاندھے سے اتار کر ابھی فائرنگ شروع کر دیں گے —— بچی کو جوش آگیا۔ وہ نعرے لگانے لگی....

"بھارت ماتا کی جے" "ہندو مسلم بھائی بھائی" "انقلاب! زندہ باد!"

اس جوش و خروش کے نتیجے میں بچی نے دونوں طرف کے گڑیوں گڈّوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ آزادی کے متوالے زیادہ تھے، فوجی کم۔ جیسے جیسے ستیہ گرہی آگے بڑھتے گئے، فوجی پیچھے ہٹتے گئے۔ پھر بھگدڑ سی مچ گئی۔ اب وہ بچی گڑیوں گڈّوں کو چھوڑ کر تالیاں بجانے لگی۔ زور زور سے نعرے لگانے لگی۔ بچی کی دیکھ بھال کرنے والی آیا۔ بغل کے کمرے میں سو رہی تھی۔ شور سُن کر اچانک جاگی۔ اس کمرے کی طرف بھاگی۔ کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ قصّہ کیا ہے۔ حیران آنکھوں سے وہ اُس بچی کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ یہ کھیل ہے یا حقیقت!

یہ بچی اندرا پریہ درشنی تھی!

جس عالی شان حویلی کے ایک کمرے میں یہ سارا تماشا برپا ہوا اُس حویلی کا نام تھا آنند بھون۔ ●●●

خواجہ احمد عباس

مسیحا کی موت

جب گاندھی کو گوڈسے نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تو جواہر لال نہرو نے ان الفاظ میں اس خبر کو نشر کیا تھا۔ کہ سارے ملک میں ایک دم روشنی کم ہو گئی ہے۔ اور غم کا اندھیرا چھا گیا ہے اور خود پنڈت جواہر لال نہرو کا جب انتقال ہوا تو بلٹز میں ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا "نہرو امر ہے" ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن جو خطبے انھوں نے لکھے ہیں اور جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں وہ اب بھی لوگوں کے پاس موجود ہیں ہدایت پانے کیلئے ان سے کچھ سیکھنے کے لیے اور آج میں یہ دونوں باتیں۔ کہہ رہا ہوں اندرا گاندھی کے انتقال کے موقع پر کہ سارے ملک کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ مگر اندرا گاندھی اپنی رکریا، ہونے کے بعد بھی آج بھی زندہ ہیں۔ کیوں کہ اندرا گاندھی کی موت نہیں ہوئی بلکہ ان کو شہید کر دیا گیا۔ اور شہید جیسا کہ آپ جانتے ہیں کبھی نہیں مرتے۔ دراصل میرے تعلقات طالب علمی کے زمانے سے جواہر لال نہرو سے تھے۔ جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اپنے دماغ میں بھی مجھ سے بہت بڑے تھے اور اپنے وسیع دل میں سارے ہندوستان کو انھوں نے سما رکھا تھا۔ اس لیے میں نے جب اندرا گاندھی کو بچپن میں پہلی بار دیکھا جواہر لال نہرو کی بیٹی کی حیثیت سے ہی دیکھا، اپنی چھوٹی سی منہ بولی بہن کے روپ میں دیکھا، پہلے کبھی ننھی سی بچی کے روپ میں پھر جب وہ بڑھتی گئیں (بڑی ہوتی گئیں) تو پنڈت جواہر لال نہرو جیل سے انھیں خط لکھنے لگے۔ جب بھی وہ خط چھپتے تھے میں بہت دلچسپی سے ان کو پڑھتا تھا گویا نہ صرف وہ میری بہن تھیں بلکہ ہم مکتب بھی تھیں پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ یورپ چلی گئیں اور وہاں سوئٹزرلینڈ میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۶۴ء میں اپنے پتا کا انتقال انھوں نے دیکھا اور نہرو جی کے انتقال کے بعد وہ پھر اکیلی رہ گئیں ان کے سامنے نہرو کی کیا روایات تھیں ان میں سب سے نمایاں روایت ان کی بہادری اور شجاعت تھی ان تھک پن سے وہ کام کرتے تھے اسی ان تھک پن سے یہ بھی کام کرتی تھیں۔ انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کی منسٹر ہو گئیں تو ان سے میری ملاقات ایک میٹنگ میں ہوئی جہاں انھوں نے سب فلم پروڈیوسرس اور ڈائریکٹروں کو بلایا تھا۔ تو وہاں جب میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ میں فلم انڈسٹری میں فلمی کاروبار میں کیا تبدیلیاں لانا چاہتا ہوں اور کیا خواہش ہے میری ان تبدیلیوں کے بارے میں تو میرا نقطہ نظر جو تھا اس کو بمبئی کے پروڈیوسروں نے بہت برا مانا اور کہا کہ صاحب ہمارے REPRESENTATIVE کی حیثیت سے یہ نہیں بول سکتے تو میں نے PRE-SIDENT یعنی اندرا گاندھی سے فریاد کی اور ان سے کہا کہ آپ کا حکم نامہ تار کے ذریعے سے مجھے ملا تھا اور میں کسی REPRESENTATIVE CAPA-CITY میں نہیں بول رہا ہوں۔ میں اپنے دل اور دماغ سے بول رہا ہوں تو انھوں نے کہا کہ عباس صاحب اپنے دل اور دماغ کی جو بات کہنا چاہتے ہیں ان کو کہنے دیجیے اور وہ آپ کے REPRESENTATIVE نہیں ہیں وہ اپنی جگہ پر ایک (IMPORTANT) پروڈیوسر ہیں اس لیے ہم ان کی ہر بات سننا چاہتے ہیں تو یہ تھی روایت اس ڈیموکریٹک فنکشننگ کی جو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بعد میں میں نے فلمی کاروبار کو خیرباد کہنے کی تحریک پیش کی۔ جو کہ کسی اور پروڈیوسر کو منظور نہیں تھی میٹنگ کے بعد اندرا جی نے مجھ سے کہا آپ کی بات تو بمبئی کے ایک پروڈیوسر نے بھی نہیں مانی نہیں نے کہا جواہر لال نہرو اور حسرت موہانی نے جب ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کیا تھا تو کانگریس نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔ یہاں تک کہ گاندھی جی نے نہیں مانی تھی۔ مگر آخر میں ۱۹۴۷ء میں وہی بات ماننی پڑی" انھوں نے مسکرا کر کہا "تو آپ کو بھی برسوں انتظار کرنا پڑے گا۔"

اور آج ایسے واقعات اور ملاقاتیں یاد آرہی ہیں۔ اندرا جی کو کبھی میں نے فرشتہ نہیں سمجھا۔ انسان تھیں مگر بلند انسان تھیں یعنی انسانی کردار کی خوبیاں جو انسان میں ہوتی ہیں ان میں بھی تھیں ورنہ ان کو میں دیوی یا نیم انسان نہ سمجھتا، مثلاً وہ ماں کی حیثیت سے اپنے بیٹوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ہندوستانی ماں کی طرح ممتا کا جذبہ ان کے ہاں بھی تھا۔ کبھی کبھی یہ جذبہ لوگوں کو برا بھی لگتا تھا۔ مگر اسی جذبے کے ماتحت انھوں نے سنجے کی وفات کے بعد اپنے بڑے لڑکے راجیو کو سیاست میں گھسیٹ لیا اور ان کو وہ سب ٹریننگ دی جس کی بدولت راجیو گاندھی نے ایک رات میں وہ سب سیکھ لیا جو ایک پرائم منسٹر کو جاننا چاہیے۔ اپنی ماں کی طرح ہی وہ بھی خلیق ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بہادر ہیں اپنی ماں کی طرح ہی وہ چند ہندوستانیوں سے نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں سے محبت اور پیار کرتے ہیں۔

ساتھ میں ان کا نہ صرف حسن ہے بلکہ عزم بھی ہے۔ جرأت ہے بہادری ہے۔ ایروپلین کے پائیلٹ رہ چکے ہیں جو ہر رات کو موت اور زندگی کا کھیل کھیلتے تھے۔ اس لیے امید ہے کہ وہ آگے چل کر وہ سب خوبیاں دکھا دیں گے جو ان کو ورثہ میں ملی ہیں۔ آج تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اندرا گاندھی امر ہیں۔ راجیو گاندھی زندہ باد۔

★▭★

مسز گاندھی کے خانگی حالات: (صفحہ ۲۲۳ کا بقیہ)

سیاست داں تھیں، وہ اپنی شاندار اور گوناگوں خدمات، ایمانداری، سچائی، وطن پرستی، روشن دماغی، رواداری، وسیع النظری، فراخ دلی، بہادری اور ہمت و جرأت کی بنا پر ملک کی عظمت کا نشان بن گئی تھیں، اپنے گھر کے چھوٹے بڑے کاموں سے لے کر ہندوستان اور بین الاقوامی دُنیا کے مسائل سے واقف تھیں اور ان کی گتھیاں سلجھاتی تھیں، ملک کے گوشہ گوشہ کا دورہ کرتی تھیں اور ہزاروں میل کا سفر چند دنوں میں طے کرتی تھیں، انتخابات میں ایک ایک روز دسوں جلسوں اور خاص میٹنگوں میں شرکت کرتی تھیں اور بیرونی ملکوں کے سفر بھی اکثر کرتی رہتی تھیں۔ ان ساری مشغولیتوں کے باوجود عوام سے رابطہ بھی رکھتی تھیں، ان کی فریادیں سنتیں اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کرتیں۔

وہ مصائب و آلام اور بھاری ذمہ داریوں اور مسائل سے کبھی متفکر اور پریشان نہ ہوتیں۔ بڑے جرأت مندانہ فیصلے کرتیں اور جب کوئی فیصلہ سوچ سمجھ کر کرلیتیں اور اس کی صحت پر انھیں یقین ہوتا تو نہ لوگوں کی مخالفت کی پروا کرتیں اور نہ اپنے فیصلہ کو تبدیل کرنے کے لیے آمادہ ہوتیں۔ ان کا آگے بڑھنے والا قدم کسی حال میں بھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا

وہ بڑی انصاف پسند تھیں، ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیتیں، ان کی نظر اپنی قوم اور ملک تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ دنیا کے ہر مظلوم اور کمزور کا ساتھ دیتی تھیں، جب دو ملکوں میں جھگڑا ہوتا تھا تو وہ ظالم کے خلاف آواز اٹھاتیں اور مظلوم کی حمایت کرتیں، عرب و اسرائیل اور ویتنام کی جنگ میں انھوں نے مظلوم عربوں اور ویت نامیوں کی حمایت کی پاکستان کی فوجی حکومت نے مشرقی بنگال میں ظلم ڈھائے تو انھوں نے شیخ مجیب الرحمان کا ساتھ دیا اور ان کی کوششوں سے بنگلہ دیش کی آزاد اور خود مختار حکومت وجود میں آئی۔ انھوں نے ہندوستان کی سالمیت اور ایکتا قائم رکھنے پر ہمیشہ زور دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد لوگوں کا خیال تھا کہ ایسے وسیع و عریض ملک کو متحد رکھنا دشوار ہوگا۔ مگر انھوں نے اپنی ہمت، بہادری اور جواں مردی کی بدولت ملک کو پارہ پارہ نہ ہونے دیا اور بالآخر اسی کے لیے انھوں نے اپنی جان دے دی۔ وہ سچ مچ ملک کے غریبوں، مظلوموں اور بے سہارا لوگوں، کمزور اور پسماندہ قوموں اور اقلیتوں کی ہمدرد اور غم خوار تھیں اور سب کی ترقی اور بھلائی کے لیے فکر مند رہتی تھیں، چند مجنون اور پاگل لوگوں نے ان کی زندگی ضرور ختم کردی مگر انھوں نے جو روشنی دکھائی ہے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو عرصہ تک منور اور روشن رکھے گی۔

★

صالحہ عابد حسین
عابد ولا۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

ہندستانی عورت کو اب کیا کرنا ہے

اس وقت عورت کی آن شان اور فرض کیا ہے؟ خدمت اور خدمت کے معنی چاکری یا مجبوری کی سیوا نہیں۔ خدمت کے بہت وسیع معنی ہیں۔ اس میں اپنے خاندان کی خدمت بھی آجاتی ہے، شہر اور ملک اور دنیا اور انسانیت کی بھی۔ علم اور ادب اور آرٹ اور سیاست اور سماج سیوا۔ غرض ساری دنیا اس کے وسیع معنوں میں سمٹ آتی ہے۔ اور اسی لیے میں یہ عقیدہ رکھتی ہوں کہ بنیادی طور پر عورت کی آن بھی اور فرض بھی اور دل کی طمانیت بھی خدمت میں پوشیدہ ہے۔ چاہے وہ محدود دائرے میں ہو یا وسیع دائرے میں۔

غور کیجیے! بچی پیدا ہوئی تو ماں باپ کی محبت کا مرکز چند دن میں بن جاتی ہے، یہ ارادی نہ سہی قدرت کا عطیہ ہے کہ بچی، لڑکے سے زیادہ پیاری باتیں اور حرکتیں کرکے گھر بھر کا دل موہ لیتی ہے۔ ذرا بڑی ہوئی تو ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ باپ بھائیوں کے کاموں کو دوڑ دوڑ کر کرنے لگی اور جوں جوں کلی پھول بنتی جاتی ہے اس محبت کی خوشبو اور زیادہ پھیلنے لگتی ہے۔ جوان ہوئی، نئی زندگی شروع کی تو غیروں کو اپنانے کا کام اسی خدمت اور محبت کے بل پر شروع کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ایک انجانے اور غیر آدمی پر اپنی محبت اور خدمت نچھاور کی۔ اس خارزار کو گلزار بنانا اس کا کام ہے ورنہ زندگی نرک بھی بن سکتی ہے۔ مرد میں (معذرت کے ساتھ کہوں) کچھ حیوانیت ہوتی ہے، کچھ آمریت ہوتی ہے، کچھ صدیوں کے اثرات سے عورت کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتا ہے (الا ماشاء اللہ) ان جذبوں کو پہچان کر عورت اسی طرح اس کو اپناتی ہے کہ وہ رام ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے اور اس خوبی سے کہ وہ سمجھتا ہے عورت اس کی محکوم ہے لیکن حقیقت میں (گھر کی دنیا تک) حکم عورت کا چلتا ہے۔ اور یہ کرشمہ ہے اس فرض کو نباہنے اور خدمت میں اپنے کو کھپانے کا جو قدرت نے اُسے ودیعت کی ہے۔ اسی کے بل پر وہ دکھ اور کٹھنائیاں جھیلتی ہے جس کے لیے مولانا حالیؔ نے کہا ہے

ع جیتی اٹھتی وہ دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

چونکہ اسے قدرت نے ماں بنایا ہے اسی لیے یہ جذبہ اُسے وافر عطا کیا ہے۔ دنیا میں یہ کوئی عام اور انوکھی بات نہیں ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد اپنی سینکڑوں دلچسپیاں، تفریحیں، کھیل تماشے، دوستوں اور عزیزوں کے گہرے تعلقات جن میں اب تک سرور اور مگن رہتی تھی شوہر کے عشق میں تج دیتی ہے اور ماں بن کر تو اس کا مرکز حیات و محبت — بچے — بن ہی جاتے ہیں۔ نو مہینے پیٹ میں رکھ کر دکھ جھیلنا، اسے پالنا پوسنا اور ساری عمر اس کی بھلائی اس کی فلاح و بہبود اور اس کی ممتا میں اپنے کو مٹانا اور اس کو انتہائی مسرت سمجھنا۔

ایک قصہ ہے کہ ایک شخص سے اس کی محبوبہ نے فرمائش کی کہ مجھے تمھاری ماں کا دل چاہیے۔ اور اس نے عشق کے جنون میں ماں کا دل نکالا اور محبوبہ کو پیش کرنے چلا۔ راستے میں ٹھوکر لگی (شاید منہ کی) تو ماں کے دل سے آواز آئی "میرے بچے تیرے چوٹ تو نہیں لگی۔"

بڑے جذباتی اور خوبصورت انداز میں کہنے والے نے ماں کی اتھاہ محبت کو دکھایا ہے۔ دراصل عمر بھر ماں کو یہی فکر لگی رہتی ہے

کر "بیٹے تجھے چوٹ تو نہیں لگی ؟"

اور جب عورت کے دل میں اور وسعت پیدا ہو جائے تو صرف وہ اپنے ہی نہیں دوسرے عزیزوں، پڑوسیوں، نوکروں چاکروں کے بچوں کی ماں بھی بن جاتی ہے اور جب یہ ممتا معراج کو پہنچ جائے تو ساری دنیائے انسانیت اس میں سما جاتی ہے!

آج ہم نے اپنی محبوب ترین ہستی جس پر ہمیں ناز ہے، غرور ہے اور جس کو ہم عورت کا بڑا ہی دلکش اور سچا روپ سمجھتے ہیں۔۔۔ اندرا گاندھی میں اس کا جلوہ دیکھا ہے ۔۔۔ وہ ماں تھیں۔ بچے اور راجیو کی۔ وہ ماں بنیں، اپنی قوم کی ۔۔۔ اپنے ملک کے بچوں اور پھر بڑوں کی بھی۔ اور ایک منزل وہ آئی کہ وہ ساری دکھی دنیائے انسانیت کی ماں بن کر سامنے آئیں۔ ظالم، وحشی طاقت کے بل پر، ظلم و ستم سے دنیا کو اقتدار میں لانے والوں کو ان کا ماں کا یہ روپ ڈرانے لگا کہ ارے یہ کہیں دنیا میں امن و سلامتی اور آزادی اور یک جہتی کی "ماں" بھی نہ بن جائیں۔ بھارت کی اس جیالی بیٹی اور ماں نے زبان ہی سے نہیں کہا۔۔۔ وہ تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے ۔۔۔ بلکہ وہ کر دکھایا جس پر دنیا آج ان کی عظمت کے آگے سرنگوں ہے۔ وہ دشمن کو بھی یہی کہتی رہیں کہ یہ سب میرے بچے ہیں۔ مجھے ان پر اعتماد ہے۔۔۔ آج بھی ان کی روح سے یہی آواز بلند ہو رہی ہے کہ "ارے میرے بچو! تمہیں چوٹ تو نہیں لگی ؟"

آج دنیا بہت وسیع ہو گئی ہے۔ اور بہت سکڑ بھی گئی ہے۔ آج کی دنیا میں جو ایک جگہ ہوتا ہے اس کا اثر سارے دیش اور بعض اوقات ساری دنیا پر پڑتا ہے۔ دنیا نے بہت ترقی بھی کی ہے، خاص کر سائنس وغیرہ کے میدان میں ہواؤں پر کمندیں ڈالی ہیں، آسمانوں پر اڑانیں بھری ہیں، ستاروں سے اٹکھیلیاں کی ہیں اور چاند کو فتح کیا ہے۔ راکٹ بنائے ہیں اور ایٹم کو دنیا کے لیے لعنت بنا لیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ (اور کیسے کیسے دانشور یہ دعوے کر رہے ہیں) کہ اس کو "امن" کے کاز کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ امن کے لیے؟ یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا ہوگا۔ اور یوں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ چوتھائی دنیا جنگ و خوں ریزی میں مبتلا ہے اور باقی اس خوف سے لرز رہی ہے کہ کل کیا ہوگا؟ ایک طرف طاقت، دولت، اقتدار کی ہوس، دنیا کو اپنانے اور تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ دوسری طرف وہ دنیا ہے ۔۔۔ کروڑوں لوگوں کی دنیا۔۔۔ جو غریبی بلکہ انتہائی مفلسی، بھوک، بیماریوں، قحط، سیلاب اور جنگ و جدل کے عفریت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ پھر بھی جب روشنی کی کوئی کرن، آشا کا کوئی دیپ، سہارے کی کوئی لکڑی اسے وابستہ ملکوں کی رہنمائی کی صورت میں نظر آتی ہے تو ڈھارس بندھتی ہے۔

ہمارے ملک میں بھی یہ سب تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف باہر کی دنیا کے وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کو آزاد، متحد، خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف گھر کے اندر کے سینکڑوں مسائل ہیں اور تخریبی قوتیں ہیں جو قوم اور ملک کے مفاد کو اپنے مفاد یا تعصب پر قربان کر رہی ہیں۔ لیکن انسان کو کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ ایسا وقت دنیا پر آتا رہتا ہے اور خدا کی مہربانی سے دور بھی ہو جاتا ہے۔ میرا علم محدود ہے مگر ایک انسان کی حیثیت سے، انسانیت پر یقین رکھتی ہوں۔ اسی کی خادم کی حیثیت سے قوم اور ملک کی بھلائی چاہنے والی اور اسلام کی پیرو ہونے کی وجہ سے (کہ اسلام کے معنی ہی امن و سلامتی کے ہیں) یہ کہ اب بھی اس دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ اور بہت ہیں، جو انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی بھلائی چاہتے ہیں، دنیا میں خوشحالی، امن، "شانتی" اور دنیا والوں کو سکون و چین کی زندگی سے ہمکنار کرنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں۔ جنگ، خوں ریزی، فساد اور ہنگاموں سے نفرت کرتے ہیں۔ (جو نہیں کرتے وہ نہ مذہبی ہیں، نہ مسلمان ہیں نہ انسان کہلانے کے مستحق) دراصل انسان کا ضمیر ہمیشہ اسے حق کی طرف لے جانا چاہتا ہے لیکن شیطانی طاقتیں اُسے گمراہ

کرنے کے در پے رہتی ہیں۔

اس کٹھن دور اور انتہائی رنج و غم میں ڈوبے ہندوستان پر بہت بڑی ذمہ داری آپڑی ہے۔ اس نازک گھڑی میں ہم میں سے ہر ایک پر کیا فرض عائد ہوتا ہے یہ ہمیں سوچنا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ گاندھی جی کی شہادت نے ۴۸۔۱۹۴۷ء کے انتہائی خوں ریز اور عبرتناک اور خوفناک فساد کی آگ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تھے ان کا خون کروڑوں لوگوں کے لیے زندگی کا پیغام بن گیا تھا۔ پنڈت نہرو نے اس گھڑی میں اور ان صبر آزما حالات میں ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔ ملک کو نئی طاقت دی، ترقی کے بے شمار کام شروع کیے اور ہندوستان کو ایک نیا طاقت ور، دوسرے ملکوں کو راستہ دکھانے والا ملک بنایا۔ اتنا ہی نہیں پڑوسی اور پچھڑے ہوئے غلام ملکوں کو ان سے تقویت ملی اور وہ ان کے لیے ہر اعتبار سے سرچشمۂ تحریک بن گئے۔

جب قدرت نے ان کو ہم سے واپس لے لیا تو پہلے شاستری جی نے ہندوستان کو اس نازک گھڑی میں سنبھالا اور جب تھوڑے عرصہ بعد اس ملک کی آزادی اور اس کی جدوجہد میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی تو آزادی کی دلدادہ اور انسانیت کی حامل ایک خاتون (جسے میں دیوی نہیں کہوں گی — کہ وہ عورت کا بہترین روپ تھیں) محترمہ اندرا گاندھی ہندوستان کے آسمان پر طلوع ہوئیں اور اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔

اندرا جی نے نہرو جی سے تربیت پائی تھی۔ ٹیگور کے قدموں میں علم و دانش، آرٹ اور جمالیات کا گیان حاصل کیا تھا، گاندھی جی سے انسانیت پر اعتماد، انسانوں سے محبت اور اہنسا کا درس لیا تھا۔ یہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ان کے اندر پنہاں تھیں۔ جو وقت نے ظاہر کیں۔

بعض لوگ — بعض کیوں اکثر — سمجھتے تھے کہ عورت ہیں۔ ہندوستان جیسے عظیم ملک اور اس کے انتہائی مشکل مسائل بھلا کیسے حل کر سکتی ہیں، لیکن دنیا نے دیکھا کہ عورت خاص کر اس عورت میں — کیسی بے پناہ صلاحیتیں اور طاقتیں چھپی ہوئی تھیں

انھوں نے دکھا دیا کہ عورت کو جنگ و خوں ریزی سے کیسی نفرت ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ملک کے پچھڑے، غریب، مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا ان کا اولین فرض ہے۔ انھوں نے کسانوں اور مزدوروں، ہریجنوں اور آدی باسیوں، عورتوں اور بچوں ہر ایک کے مسائل سمجھنے کی کوشش کی اور ان کو حل کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں انھوں نے دنیا کے دوسرے پچھڑے ہوئے یا "ترقی پذیر" ملکوں کی مدد کی اور ان کو آزادی خوشحالی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے عالمی مسائل کو حل کرنے کی بھی جدوجہد کی۔ اور ساری دنیا میں ان کے عظیم کاموں کی دھوم مچ گئی! نہ وہ ملک کی تخریبی قوتوں سے گھبرائیں نہ اپنی جان کی دھمکیوں سے ڈریں۔ وہ دن رات اسی جدوجہد میں لگی رہیں کہ باہری قوتیں جو اس ملک کو متحد اور آزاد اور خوشحال نہیں دیکھنا چاہتیں ان سے ٹکرلیں اور ہندوستان کو بچائیں۔ لیکن اندرا جی انسان تھیں بھگوان (معاذ اللہ) نہ تھیں۔ یہ ملک جو اچھا خاصا ایک براعظم ہے جس کے ستر کروڑ باسیوں کے کروڑوں مسائل ہیں انھیں آسانی سے تو حل نہیں کر سکتی تھیں، کام کرنا انسان کا فرض ہے۔ نتائج خدا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ مگر اندرا جی کو ہندوستان پر بھروسہ تھا، اس کے نوجوانوں پر بھروسہ تھا، اس کے بچوں پر بھروسہ تھا۔ اپنے ساتھیوں پر بھروسہ تھا اور سب سے بڑھ کر خود اپنی ذات پر اعتماد تھا اور اپنے خدا پر۔ وہ موت سے نہ ڈرتی تھیں۔ وہ بہت مذہبی تھیں اور سبھی مذہبوں کی بنیادی سچائیوں پر عقیدہ رکھتی تھیں وہ جانتی تھیں کہ جب تک وہ کام کر سکتی ہیں کریں گی جب خدا چاہے گا بلا لے گا۔ سنتی ہوں — وہ سولہ بلکہ اٹھارہ گھنٹے تک کام کرتی تھیں مگر کیا ازجی کیا ہمت تھی کہ اس عمر میں بھی وہ نہ تھکتی تھیں نہ ان کی صحت پر اس کا اثر پڑتا تھا۔

انھوں نے خراب سے خراب حالات میں دل چھوٹا نہیں کیا ہار نہیں مانی۔ انھوں نے اپنے والد کی طرح ہندوستان بھر کے سفر کیے۔ ہر جگہ کے حالات دیکھے اور وہاں کے مسائل سمجھے اور حل

کرنے کی جان توڑ کر کوشش کرتی رہیں۔ ان کے یہاں تھک
سفر لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت کے ساتھ ساتھ امید پیدا
کر دیتے تھے۔ غریب، بچھڑے ہوئے، مصیبت زدہ لوگ،
سماج کی ستائی اور ٹھکرائی عورتیں، بیمار و مظلوم بچے، معذور
اور معذوروں کی توجہ کے خاص مرکز بن جاتے تھے۔ وہ جہاں جاتیں
مرد احترام سے ہاتھ جوڑتے، عورتیں صدقے قربان ہوتیں،
بچے محبت، پیار اور پھول وصول کرتے ــــــــــــ
اور صرف وہ لوگ ہی نہیں خود اندرا جی بھی ان سے ایک نئی طاقت
حاصل کر کے واپس آتیں۔ دوسرے جن ملکوں میں وہ جاتیں
وہاں بھی لوگ، خاص کر عورتیں اور بچے ان سے بے حد متاثر
ہوتے۔ وہ دنیا کے لیے ایک آئیڈیل عورت بن چکی تھیں۔ جو
لوگ حسد یا جلن یا دشمنی رکھتے بھی تھے وہ ظاہر نہ کر سکتے تھے۔
مگر حقیقت یہ ہے کہ تخریب پرشور ہوتی ہے اور تعمیر کا مزاج
خاموش ہوتا ہے۔ آخری دنوں میں ہم نے یہی افسوسناک
حالت دیکھی۔

آج ــ اندرا جی کی زندگی اور موت دونوں کی ایک شاندار
مثال ہمارے سامنے ہے جو صدیوں روایت و حقیقت بن کر
زندہ رہے گی ؟ آج عورت ــ ہندوستانی عورت کو خصوصاً
یہ سوچنا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے، کیا کرنا چاہیئے، عورت وہ ہندو
ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو، عیسائی ہو، پارسی ہو، آدی باسی ہو،
ہریجن ہو ــ کسی طبقے کسی علاقے کی ہو۔ اپنے اپنے حلقے میں چھوٹی
سی ـ ننھی سی ـ اندرا جی بن سکتی ہے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ وہ
عورت ہے اور جیسا میں نے پہلے کہا عورت ماں ہے اور ماں کبھی
ظالم اور سنگ دل اور خوں ریز نہیں ہو سکتی۔ (اور جو ہوتی ہے
وہ عورت نہیں، اس کے نام پر کلنک ہے۔) اسے سبق سیکھنا ہے۔
اپنے کو پہچاننا ہے۔ اس کا فرض کیا ہے ؟ وہ کیا خدمت کر سکتی
ہے ملک قوم اور انسانیت کی !

ماں عورت ــ ماں ہے ــ اور ہندوستانی عورت میں ممتا اور
محبت اور دکھ اٹھا کر دوسروں کو سکھ دینے کا جذبہ مردوں سے
زیادہ ہوتا ہے۔

وہ اپنی اس محبت کو صرف محدود ترین دائرے میں استعمال
نہ کرے بلکہ اپنے اپنے حلقے میں عام کر دے۔ حلقہ کتنا ہی محدود کیوں
نہ ہو محبت اور خدمت لامحدود ہوتی ہے۔ وہ اسے بروئے کار
لائے اور اپنے گھر سے اس دولت کو بانٹنا شروع کرے کہ خیرات
گھر سے شروع ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کے دل میں امن اور شانتی
کا احساس و احترام پیدا کرے، اپنے گھر کے مردوں کو یہ بات
سکھائے اور سمجھائے کہ گھر کا سکھ اور انسان کی راحت اسی میں
ہے۔ ان میں ملک کی آزادی سلامتی یک جہتی اور اتحاد کا جذبہ
پیدا کرے۔ ان کے دل میں ملک کے ہر باسی کی عزت اور اس
کی سلامتی کی لگن پیدا کرے۔ سننے میں یہ بڑی بڑی باتیں لگتی
ہیں۔ لیکن وہ یہ اتنی بڑی ہیں نہ کٹھن۔ یہ تو انسانیت کی بنیاد
ہیں۔ ہمارا دائرہ کتنا ہی محدود ہو صرف میرا گھر۔ میرا چھوٹا سا
محلہ، میرا ذرا بڑا محلہ، میرا گاؤں، قصبہ، شہر۔ اور میرا ملک
ــــ جہاں، جتنا، جس قدر ہم اس کام کو کر سکیں وہ اتنا ہی
مفید، اتنا ہی مقدس اور اتنا ہی ضروری ہے کہ چراغ سے چراغ
جلتا ہے ! جس مرد کے دل میں اپنی ماں کی، بہن کی بیٹی کی عزت
ہوگی وہ اگر حیوان نہیں بن چکا تو وہ ہر عورت کی عزت کرے گا۔
اور ہر مرد کو اپنا بھائی سمجھے گا۔ زبان سے وقتی جذبہ کے تحت "بھائی
بھائی" کہہ دینا اور بات ہے اور زندگی میں اس کو برتنا اور اپنانا
دوسری بات ہے جو بہت اہم اور بہت کٹھن بھی ہے ! ماں اگر ماں۔
عورت ــ بہن ــ بیٹی اس کے دل میں بچپن سے یہ بیج بو دے تو
یہی تناور درخت بن جائے گا۔ اگر نہیں تو کہیں نہ کہیں اس میں
عورت کی کوتاہی یا ذہنی کجی یا لاپروائی یا خود غرضی ضرور ہوگی مانتی
ہوں ــ عورت اندرا گاندھی نہیں ہو سکتی۔ اندرا جی جیسی
عورتیں تو صدیوں میں کہیں جنم لیتی ہیں۔ لیکن ہم چھوٹی سی اندرا
بن سکتے ہیں۔ انسانیت کی محبت اور انسان کی بھلائی کا جذبہ ہر دل
میں ہر عورت میں چھپا ہوتا ہے۔ صرف ہمیں اسے پہچاننا ہے۔
جانتی ہوں ہر عورت کے مسائل ہیں۔ ذمہ داریاں ہیں، گھر
اور گھر والوں کی خدمت ہے۔ ہمارے ہاں عورت ہمیشہ اپنی طاقت
اور ہمت سے زیادہ کاموں میں لگی رہتی ہے۔ مگر خیالات اور

تربیت کے لیے جسمانی طاقت سے زیادہ ذہنی صفائی اور صلاحیت اور دل کی نرمی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کا مقدس دودھ جو خون بن کر آپ کے بچے کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اس میں تعصب تنگ نظری، ظلم و فساد کا زہر آیا کیسے؟ اگر آ بھی گیا تو محبت کے تریاق سے اسے نکال ڈالیے! آئیے آج ہم اس دکھ بھرے دور میں، اس مقدس دور میں عہد کر لیں کہ نفرت، غصہ، انتقام، فساد، جنگ، خون ریزی کے جذبات اپنے بچوں کے دل میں ہرگز پیدا نہ ہونے دیں گے۔ کتنا ہی چھوٹا دائرہ ہو مگر ہم انسان اور انسانیت کی خدمت کریں گے۔ اسی میں ہماری اور ہمارے خاندان کی۔ ہمارے محلے، شہر، ملک اور دنیا کی بھلائی مضمر ہے یہی ہمارا دینی اور مذہبی فریضہ ہے کہ کسی سچے مذہب نے ظلم و خون ریزی کی حمایت نہیں کی آپ اپنی کوشش کیے جائیے۔ تالاب جوں جوں بھرتا ہے چھوٹی لہروں سے بڑی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ گھر کے باہر ہمارا دائرہ اور بڑا ہے ہم ٹیچر ہیں تو شاگردوں سے، معلم اخلاق ہیں تو اپنے مذہب کے ماننے والوں سے، ڈاکٹر ہیں تو مریضوں سے، ادیب اور شاعر اور آرٹسٹ ہیں تو اپنے قلم سے، مقرر ہیں تو اپنی تقریروں سے، صحافی ہیں تو اپنے اخبار اور رسائل کے ذریعہ غرض جس میدان میں ہوں، امن و سلامتی، محبت و اخوت اور یک جہتی کی تعلیم دے سکتے ہیں اور ہمیں دینا چاہیے ورنہ ہمارا یہ ہزاروں برس پرانا مقدس ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔

ہمیں اپنے جواں سال اور فعال وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا جنھوں نے اپنے ذاتی غم کو جس سے بڑا غم کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ دل کے ساگر میں چھپا کر ملک کی بھلائی اور امن و اتحاد و یکجہتی کے کام میں اپنے کو ڈبو دیا ہے، ان کی بے پناہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے لیکن کامیاب و کامراں ہونے کے لیے ہم سب کو بھی ان کو سہارا دینا ہے اور وہ ہے ملک کی خدمت، انسانیت کی خدمت، یک جہتی اور اتحاد کا دل و جان سے حامی ہونا۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ یہ بڑا کام مرد سے بہت زیادہ عورت کر سکتی ہے۔ اور یہی عورت کا فرض بھی ہے اور یہ اسے کرنا ہے کہ انسانیت کی، ہندوستان کی اپنی قوم کی سب سے بڑی خدمت ہے اور اسی میں اس کی اولاد کی نجات ہے۔ حالی نے کہا ہے ؎

ملک ہیں اتحاد سے آباد
ملک ہیں اتفاق سے آباد
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو!
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

فرقہ پرستی اور انسانوں کے درمیان تفریق جب تک موجود ہے، جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی۔ سوشلزم کے بغیر جمہوریت ممکن نہیں ہے کیونکہ نابرابری اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔

—— اندرا گاندھی

انسانی بہبود کے کاموں کو ملکی سرحدوں میں مقید نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب کو مل جل کر یہ سوچنا ہے کہ دنیا کی حکومتیں اپنے ممالک کے عوام کے لیے کیا کر سکتی ہیں

—— اندرا گاندھی

سائنسداں چاہے وہ سرمایہ دار ملکوں کے ہوں، سوشلسٹ ممالک کے ہوں یا کمیونسٹ ملکوں کے ہوں۔ ان کے سامنے سب سے اہم کام سماجی اور معاشی مسائل کا منطقی حل تلاش کرنا ہے۔

اندرا گاندھی

ویریندر پٹواری
پریم کنج، جنوری باغ
شہری، کٹوجموں، توی
۱۸۰۰۰۲

(افسانہ)

آشوب

واہ! واہ!! - یہ خواب میں نے ۲۸ سال پہلے بھی دیکھا تھا - دل کش خواب! - حسین خواب - !! مگر ؟ - اُف میرے دل میں ایک ہوک سی کیوں اُٹھ رہی ہے — آنکھوں میں یہ جلن کیسی ؟ - سارے جسم میں یہ تھرتھراہٹ کیسی -؟ یہ کیسی کیفیت مجھ پر طاری ہو چکی ہے - اِس شکستہ دل نے یاد دلایا - کتنا خوبصورت تھا وہ منظر — واہ! تب سبز سبز مخملی گھاس پر چلتے ہوئے پکھراج کے مانند آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے شبنم کے قطرے دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری کلپنا اپنے مرمریں شانوں پر سنہری گیسو بکھیرے' میرے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اور پکھاوج کی تھاپ پر جھوم جھوم کر ناچ رہی تھی - اور — اور — میری آشا رنگ برنگی پھولوں کو چوم چوم کر گا رہی تھی-

سارے جہاں سے اچھا' ہندوستاں ہمارا

مگر ؟ - اُف! دل میں پھر ایک ہوک سی اٹھی ہے - ایک مالی اپنے گلشن کی لہک دیکھنے کے بجائے شعلوں کی چادر دیکھ کر کر ہی کیا سکتا ہے - پھولوں کی مہک کے بجائے جلے ہوئے گوشت کی بُو سونگھ کر اور کر ہی کیا سکتا ہے - خنک سی ہواؤں میں دھوئیں کی ملاوٹ دیکھ کر اور کر ہی کیا سکتا ہے - یہ الاؤ جس کی تپش سے پھول جھلس گئے اور میری اکلوتی بیٹی آشا کی دنیا تاریک ہو گئی' جانے کس کی پیداوار تھی - میں جاننے کی کوشش کرتا بھی تو بھلا کیسے جان پاتا - بارود پھٹ گیا - گولیاں چل پڑیں — لاشوں کے ڈھیر میں کھو کر - اور پھر صدمات کے بیابانوں میں راستہ تلاش کرتے کرتے میں نے آشا کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی - جانے تپتے ہوئے صحراؤں میں میری اندھی بچی کو کس نے اٹھا لیا تھا - جانے اس کو آسرا کس نے دیا تھا - کسی مولانا نے یا بھگت گرنتھی نے - یہ شاید ڈاکٹر شانتی پرشاد بھی نہیں جانتا ہے - مگر میری آشا کا مسیحا ڈاکٹر شانتی پرشاد کیسے کہہ رہا ہے کہ اس کی تاریک دنیا منّور ہو گی - مگر ہاں - وہ تو آنکھوں کا ایک کامیاب ڈاکٹر ہے - تو کیا میری بیٹی پٹی کھلتے ہی سب کچھ دیکھ سکے گی - وہ یہ کمرہ — وہ سڑکیں — مندر مسجد - گوردوارے پرندے - چرندے - وہ نیلے نیلے آکاش میں اڑتا ہوا سفید کبوتر - وہ برف سے ڈھکے پہاڑ - لہلہاتے کھیت - فیکٹریوں کی چمنیاں - سربفلک چنار کے درخت - ابلتے چشمے - موٹر - کاریں - ریل - گاڑیاں - جہاز - طیارے - آفتاب - مہتاب - رنگین سحر - پرکشش شام - یا - یا - فقط تاریکی! اف!! نہیں - نہیں - ڈاکٹر شانتی پرشاد کا آپریشن کامیاب ہے - ہا ہا ہا -

مگر ؟ - اُف! — ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے - یہ شور و غل کیسا ہے ؟ یہ توڑ پھوڑ کی آواز کیسی ہے ؟ یہ گولیوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے -

شاید دُور کہیں ۔ مگر یہ لیمپ کس نے توڑ ڈالا ہے۔
یہ تاریکی کیسے چھا گئی ہے۔ کیا میں بھی اندھا ہو گیا
ہوں۔ آشا بابو۔ بابو کیوں چلا رہی ہے۔؛ مگر مجھے
آپریشن تھیٹر کے اندر کوئی جانے کیوں نہیں دے رہا ہے۔
اُف یہ کیسی ڈراؤنی آوازیں ہیں۔ لگتا ہے کسی پرندے
کی گردن مروڑ دی ہے کسی نے۔ مگر کس نے؟ اور باہر کچھ
بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ بستی ویران ہے۔ ڈسپنسری
انگاروں میں لپٹی ہوئی ہے۔ معمار مجروح ہے اور طبیب
خون سے لت پت ۔ یہ کوئی طوفان سیلاب یا زلزلہ نہیں
ہے۔ شاید جنگ ہے ۔ مساوات کے نام پر فسادات کرانے
والوں کی یلغار۔ یا ایک گھر کو ٹکڑے ٹکڑے کرانے والے ۔
آتش زن ۔ ہڑتال ٹھونسنے والے رہزن۔ اور نظام کو
درہم برہم کرنے والے نیتا۔ مگر اس دھوئیں میں کسی کی
شکل تو نظر آتی۔ اُڑتی ہوئی دھول میں کسی کے قدموں
کے نشان تو دکھائی دیتے۔ مگر۔! وہ سب دیکھ کر میں
کروں گا بھی کیا۔ آشا آپریشن تھیٹر میں صدائیں دیے
جا رہی ہے اور میں شیشوں سے جھانک کر ایک لاچار
مریض اور فرش پر پڑے بے بس ڈاکٹر کو دیکھ رہا ہوں۔
وہ خود آخری سانسیں لے رہا ہے ۔ کون بچائے گا میری
بیٹی کے مسیحا کو ۔؟ کون؟ .... مگر یہ کس کے قدموں کی
آہٹ ہے ۔ یہ ہاتھ میں لالٹین لیے کون ہے۔ گلے میں
رودرکش کی مالا پہنے یہ کون ہے ۔؟ ارے ۔ یہ تو
وہی ہے۔ پریہ درشنی تم ۔؟ لیکن کیا یہ جوگن میری
بیٹی کے آشوبِ چشم کا علاج کر سکے گی۔ کیا اس مدھم
مدھم روشنی میں میری آشا سب کچھ دیکھ سکے گی؟ یہ
کمرہ ۔ یہ مکان ۔ یہ دھرتی ۔ وہ آکاش ۔ مگر ۔ پریہ درشنی
تم میری آشا کو کہاں لے جا رہی ہو؟ ۔ میری کلپنا کے پاس
نا ۔؟ ہاں چلو اُسے۔ بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ایک
ایسی جگہ جہاں وحشی درندے نہیں ، انسان رہتے ہوں۔
ایک ایسی جگہ جہاں سبز سبز مخملی گھاس پر مچلتے ہوئے کھراج
کے مانند ۔ مگر ۔ اُف ۔ یہ کیسی آواز ۔؟ یہ گولیوں کی بوچھار
کیسی؟ ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ پریہ درشنی! پریہ درشنی!! ۔
تم ہمیں منجدھار میں یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں ۔ آشا کا
ہاتھ کون پکڑے گا اب۔ وہ بے چاری اندھی ہے ۔؛ انجانے
راستوں پر چل پڑی تو جانے کب کس کھائی میں گر جائے
۔ اُف! ۔ اُف!! اب کیا ہوگا؟ تم خود لہو لہان ہو ۔
بے حس و حرکت۔ مگر؟ ۔ ہاں! لالٹین جل رہی ہے ۔
تاریکیوں کو مٹا رہی ہے ۔ راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔
اب لالٹین ہی مجھے راستہ دکھائے گی ۔ اور میں آشا کی
اُنگلی پکڑ کر اپنی کلپنا کے پاس جاؤں گا۔ میں ڈھولک بجاؤں
گا۔ کلپنا رقص کرے گی اور آشا رنگ برنگی پھولوں کی خوشبوؤں
کے درمیان گائے گی ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تعلیم محض علم حاصل کرنا نہیں، تعلیم کا مقصد خود کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنا ہے تاکہ
ہم سماج میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

اندرا گاندھی

ترقی کو درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زمین سے ہی اُگتی ہے تبھی جڑیں پکڑ سکتی ہے۔

—— اندرا گاندھی

انصر قدوائی

ترجمہ:۔
سید مصداق الحسن

ہندستان اندرا گاندھی کے بغیر

اندرا گاندھی کی موجودگی میں ان کے بغیر ہندستان کا تصور ناممکن تھا۔ ۱۹۷۷ء میں کانگریس پارٹی کے اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد ۱۹۸۰ء میں عوام کی جانب سے ان کی موافقت میں حق رائے دہی کا استعمال اسی احساس کا آئینہ دار تھا۔ اب جذباتی اور ذہنی سطح پر عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے ان کی عزیز ترین شے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی ہے۔ اندرا گاندھی عہد نو کی نمائندہ شخصیت تھیں اور یہ مرتبہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔ ان کی پالیسیوں کا محور جمہوریت سیکولرازم اور سوشلزم تھا۔ اور اس محور سے ذرہ برابر ہٹنے کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نہرو کے بغیر ہندستان کا تصور ناممکن تھا اور جب ہم نے انھیں کھو دیا تو ان قدروں کی تجسیم اندرا گاندھی میں نظر آئی چنانچہ ان روایات کا تسلسل برقرار رہا۔ ایسے سماج میں جہاں جاگیرداروں اور آزادی کے بعد ابھرنے والے نئے دولتمند طبقے کی بالادستی تھی، ہندستان کی ایک جدید ملک کی حیثیت سے ترقی دشوار اور سست رفتار تھی۔ جمہوریت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے سماجی تبدیلی لانا ایک دشوار گزار عمل تھا اور نہرو اس جدوجہد میں خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ معقول دلائل کی بنیاد پر سماجی تبدیلی میں نہرو کا یقین غیر متزلزل تھا چنانچہ انھیں ہمیشہ ضبط و تحمل سے کام لینا پڑا۔ اپنی شخصی جاذبیت کے باوجود انھیں ملک کے سفینہ کو دائیں بازو اور مفاد پرست عناصر کے برپا کیے ہوئے طوفانوں سے بچا کر آگے بڑھانا پڑا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد صاف نظر آ رہا تھا کہ نہرو اس جنگ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ اندرا گاندھی اپنی جدوجہد میں اور بھی تنہا تھیں۔ ملک کی تعمیر نو کے ابتدائی برسوں میں جنگ آزادی کے سورما نہرو کے گرد موجود تھے اور جمہوری نیز سیکولر آدرشوں کو مستحکم کرنے میں ان کے معاون تھے۔ اس کے برخلاف مسز گاندھی نے جب ۱۹۶۶ء میں اقتدار سنبھالا تو وہ ایسے رفقا سے محروم تھیں۔ ان کی ترقی پسندانہ اور انقلابی پالیسیوں کی ہر قدم پر مخالفت کی گئی۔ کانگریس پارٹی خود ترقی پسند اور قدامت پرست دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ کانگریس پارٹی کو پھر وہی مقام حاصل کرنا تھا جو جنگ آزادی کے دوران عوامی تحریک کی شکل میں ابھرنے پر اسے حاصل ہوا تھا۔ تنظیم کی جگہ چودھراہٹ لے چکی تھی۔ اور اس کا نصب العین غیر متعین اور سست رفتار ہو گیا تھا۔ پارٹی کا داہنا بازو ہر محاذ پر سرگرم تھا اور پارٹی کی ترقی پسندانہ پالیسیوں کی راہ میں دشواریاں پیدا کر رہا تھا۔

۱۹۶۹ء میں کانگریس کے فرید آباد اجلاس میں

سنڈیکیٹ کی وجہ سے عوامی زمرہ اور معاشی خودکفالتی جیسے معاملات پر کوئی واضح پالیسی متعین نہ کی جا سکی۔

نہرو اپنے اقتدار کے دوران فرقہ پرستی کی بیخ کنی، جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے اور ملک کو معاشی طور پر مستحکم کرنے میں مصروف رہے۔ نہرو نے اپنی وفات کے بعد ایک شاندار ورثہ چھوڑا تھا اور ملک کی ترقی اور سیاسی استحکام کی راہ ہموار کی تھی۔ شاستری جی کی وفات کے بعد جب اندرا گاندھی نے اقتدار سنبھالا تو صرف ایک سال بعد ہی عام انتخابات ہونے والے تھے۔ اس وقت ملک کے متعدد حصوں میں کانگریس مخالف لہر چل رہی تھی۔

اگرچہ نہرو نے ملک کے اندرونی معاملات میں جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم کی اور غیر ملکی معاملات میں ناوابستگی کی واضح پالیسی اختیار کی تھی لیکن اندرا گاندھی کو ان پالیسیوں پر عوام کا اعتماد بحال کرنا تھا۔ انھوں نے نہ صرف ان پالیسیوں کو فروغ دیا بلکہ خود کو ان کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ان پالیسیوں سے کسی بھی طور پر انحراف کرنے کے لیے قطعاً راضی نہ ہوئیں۔ ان کا کام انتہائی مشکل تھا اور ان کی پالیسیوں کی زبردست مخالفت کی گئی۔ ان کی سب سے زیادہ توجہ اس بات پر تھی کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ہی معاشی آزادی بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اسی درمیان تخریب کار عناصر نے مذہب اور زبان کے نام پر سر اٹھانا شروع کیا۔ انھوں نے معاشی پالیسیوں کو سوشلسٹ جہت دینا چاہی تو نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

کانگریس کی ۱۹۶۹ کی تقسیم جو دھرا ہٹ اور عوامی قیادت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کا نتیجہ تھی۔ تعیش پسند لیڈروں اور اندرا گاندھی کی سرگرم و فعال قیادت کے درمیان جو ذہنی فاصلہ اور جنریشن گیپ تھا، اس بحران کی جڑیں اس میں پیوست تھیں۔

اب ۱۹۷۱ اور ۱۹۷۲ کی انتخابی قوت آزمائی کا وقت آ پہنچا تھا جس کا نتیجہ زبردست اندرا لہر کی شکل میں برآمد ہوا۔ ملک کی تاریخ میں یہ ایک اہم موڑ تھا۔ جب اندرا مخالفین نے یہ سمجھ لیا کہ اندرا گاندھی کو الکشنی محاذ پر شکست نہیں دی جا سکتی تو انھوں نے نظریاتی سوالات کا پر تشدد جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ گھیراؤ، بند اور ہڑتالیں (۱۹۷۴ کی ریلوے ہڑتال خاص طور پر قابل ذکر ہے) عام ہو گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ سیاسی قتل اور تشدد میں اضافے کی شکل میں برآمد ہوا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ جو لوگ اندرا لہر کو نہ روک سکے، انھوں نے تشدد کا سہارا لیا۔ تشدد کی اس لہر نے سب سے پہلے آسام کو اپنی گرفت میں لیا اور اس کے بعد اس نے پنجاب میں اپنا ننگا ناچ شروع کیا۔ اندرا گاندھی کا قتل ایک انتہائی شرمناک واقعہ تھا۔ ان کی موت کچھ لوگوں کے لیے ایک ناگہانی اور غیر متوقع واقعہ ہو سکتا ہے لیکن اندرا گاندھی کے لیے ایسا نہیں تھا۔ وہ اکثر اپنی شہادت کا اندیشہ ظاہر کرتی رہی تھیں اس کے باوجود وہ آخر وقت تک عوام سے رابطہ قائم کیے رہیں۔ جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اندرا گاندھی کو قتل کر دیا ہے وہ بھول کر رہے ہیں۔ ان کی موت سے وہ آدرش اور نظریات نہیں مرے ہیں جن پر وہ عمل پیرا تھیں۔ دراصل اب اندرا گاندھی کی جد و جہد کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوگا۔ وہ دن بھی آئے گا جب اندرا گاندھی کے قاتل اور ان کی پشت پناہی کرنے والے افراد اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں گے۔ اس سانحہ نے ان کے آدرشوں پر چلنے کے لیے عوام کے عزائم کو تقویت پہنچائی ہے۔ بلاشبہ یہ جد و جہد وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کی قیادت میں جاری رہے گی۔ کیونکہ اب یہ قومی اہمیت کا معاملہ ہو گیا ہے۔ راجیو گاندھی سے ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اندرا عہد کی شاندار

(باقی صفحہ ۲۴۸ پر)

نریش چوپڑا

مترجمہ:
رضوانہ سیف

نہرو اور اندرا

بعض مماثلتیں اور اتفاقات

جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی وفات سے متعلق بعض عجیب و غریب مماثلتیں اور اتفاقات ذہن میں آتے ہیں۔

دونوں ہی نومبر میں پیدا ہوئے اور دونوں ہی نے وزیر اعظم کی حیثیت سے وفات پائی۔ دونوں ہی کا انتقال بدھ کے دن ہوا۔ دونوں کا انتقال مہینے کے آخری ہفتے کے دوران ہوا۔ دونوں ہی متعلقہ دہائی کے چوتھے سال میں فوت ہوئے۔ یعنی نہرو ۱۹۶۴ء میں اور اندرا گاندھی ۱۹۸۴ء میں۔ دونوں کا انتقال دن میں ہوا۔ دونوں ایک ہی شہر نئی دہلی میں اپنی اپنی سرکاری رہائش گاہ پر فوت ہوئے۔ دونوں کے آخری رسومات سنیچر کو ادا کیے گئے۔ دونوں کی آخری رسومات ایک ہی پجاری۔ پنڈت گردھاری لال نے انجام دیں۔

دونوں رہنماؤں کی نعش درشن کے لیے ایک ہی جگہ اور ایک ہی عمارت۔ تین مورتی ہاؤس میں رکھی گئی۔ دونوں کا آخری سفر اسی عمارت سے شروع ہوا۔ دونوں کا جنازہ ایک ہی راستہ سے ہو کر گزرا اور جمنا کے کنارے تک گیا۔ دونوں کی آخری رسومات ایک ہی علاقہ یعنی شانتی ون میں ادا کی گئیں۔ دونوں کی چتاؤں کو شری راجیو گاندھی نے ہی آگ لگائی۔

دونوں کی وفات اڑیسہ کے شہر بھونیشور کے دورے کے قلیل عرصہ بعد ہی واقع ہوئی۔

دونوں نے اپنے بعد ایک ہی اولاد چھوڑی یعنی نہرو نے اندرا کو اور اندرا نے راجیو کو۔ دونوں کی جانشینی بآسانی انجام پائی۔ دونوں ہی کی وفات اس وقت ہوئی جب قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی شہرت بام عروج پر تھی۔

دونوں کی موت کا کچھ نہ کچھ تعلق کسی بڑے قومی بحران میں فوج کے ملوث ہونے سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نہرو کی موت دسمبر ۱۹۶۲ء کے چینی حملہ کے صدمہ کا نتیجہ تھی جبکہ اندرا گاندھی کے معاملہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی موت گولڈن ٹمپل میں فوجی کارروائی کا براہِ راست نتیجہ تھی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
آنند بھون کھانتہ پاڑا، باریپاڑی
۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

شریمتی اندرا گاندھی

شعرائے بنگال کی نظر میں

ایک جمہوری ملک کا وزیراعظم ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے خاص طور سے ہندستان جیسے عظیم ملک کا وزیراعظم ہونا۔ لیکن اندرا گاندھی محض وزیر اعظم ہی نہیں تھیں۔ اُن کے انتقال پر "اخبار مشرق" کلکتہ نے یکم نومبر ۱۹۸۴ء کو اپنے اداریہ میں لکھا: "اندرا گاندھی ایک شخصیت نہیں ایک تاریخ ساز عہد تھیں۔ اُن کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ اپنی ۶۷ سالہ کی عمر میں اندرا گاندھی نے اپنی سیمابی اور مقناطیسی شخصیت کی غیر معمولی قوت سے نہ صرف یہ کہ ان گنت نشیب و فراز کا مقابلہ کیا بلکہ وہ خود نشیب و فراز پیدا کرتی رہیں تاکہ مقابلے کی دوڑ میں ان کی متحرک قیادت تمام قوتوں پر بھاری اور حاوی رہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب اندرا گاندھی اقتدار سے محروم ہوئیں تو اس وقت بھی شکست خوردہ اندرا فاتح لیڈروں سے زیادہ اخبارات کی شہ سرخیوں میں نظر آتی رہیں۔"

موت اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ہاتھوں سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ لیکن اگر وہ قدرتی موت نہ ہو تو اس موت کا اثر دلوں کو مزید جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمارے درمیان مزید چند برسوں تک جیتیں اور پھر موت آکر ان کو ہم سے چھین لے جاتی۔ ایسی حالت میں بھی سیکڑوں لوگ روتے۔ لیکن ان کو دو ہندستانیوں نے ہی گولی سے چھلنی کر دیا۔ اس واقعہ کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے اس طرح کی موت کا ہمیں وہم گمان تک نہ تھا۔ چنانچہ اندرا گاندھی کی موت برق بن کر ہم پر گری اور اس موت نے ان کو "امر" بنا دیا۔ اندرا جی کے اس بے رحمانہ قتل نے شعراء اور ادباء کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا یکم نومبر سے ۱۹ نومبر تک کے اخبارات پر نظر ڈالی جائے تو کل ہند پیمانے پر ہمیں سیکڑوں شعراء کی وہ نظمیں ملیں گی جو اس ظالمانہ قتل سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں اور اگر یہ سارا کلام یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو اردو شعراء نے اندرا گاندھی پر عقیدت کے جو پھول نچھاور کئے ہیں وہ محفوظ ہوجائیں گے کلکتہ کے اردو اخبارات میں شعرائے بنگال کے تاثرات کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں انہی شعراء میں سے کچھ شاعروں کے منتخب اشعار پیش کر رہا ہوں جس سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر اس سانحہ نے کیا اثرات مرتب کئے اور انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کیا ہے

کس قدر ظالم تھا کیسا بد دماغ
جس کے ہاتھوں گل ہوا روشن چراغ
روشنی ایسی کہاں پائیں گے ہم

ظفیر فیضی آبادی

امینِ آگہی تھی پیروِ حق و صداقت تھی
وہ اہلِ ایشیا کی روح تھی حسنِ سیاست تھی
قیامت کی طرح اس عہد میں اس کی جدائی
خزاں بادرِ ہندوستاں پر موت چھائی ہے

شوکت غزالی

تمہارے بعد دلی شہر ایسے پھول جیسا ہے
کہ جس میں حسن تو موجود ہو خوشبو نہیں آئے

بہن کے پیار ماں کی ممتا کو کون بھولے گا
یہ ممکن ہی نہیں ہے یاد ہم کو تو نہیں آئے

— منور رانا

اٹھ کے آپ گئیں کیا اندرا
ہر فرد و محفل روتا ہے
کہہ دو پاشا عالم عالم
آج ہمارا دل روتا ہے

— حشمت کمال پاشا

تو ظلم کے خلاف تھی، تھی دوستی پسند
سارے جہاں کو تو نے دیا امن کا پیام

کرلے قبول شاعرِ خستہ کی التجا
لے لے تو آج ثاقبِ مضطر کا بھی سلام

—— احمد حسین ثاقب

تری وسعتِ خیالی کے ترے دشمن بھی قائل تھے
سیاست میں فراست میں بھی یکتائے جہاں تو تھی
شکیلِ غم نوا تنہا نہیں، سب لوگ کہتے ہیں
کہ اک تابندہ نقشِ عظمتِ ہندوستاں تو تھی

—— شکیل نبی نگری

اے قوم تیری حامی و غمخوار تھی اندرا
دشمن کے لئے چین کی دیوار تھی اندرا
تاراج ہوا موسمِ گل میں یہ گلستاں
اے اہلِ چمن رونقِ گلزار تھی اندرا

—— عشرت نبی نگری

یہ راکھ ہے کس کی یہ خاک ہے کس کی
یہ راکھ ہے اس ہستی کی جو پیکرِ ثابت قدمی تھی
یہ خاک ہے اس ہستی کی جو خوگرِ حب الوطنی تھی

—— اقبال کرشن

دشمن سے کہو قتل سے اندرا نہ مرے گی
بھارت کی ہے وہ روح سدا ساتھ رہے گی
جنتا اسے چاہے گی پرستش بھی کرے گی
وہ امن کی دیوی ہے بتا کیوں نہیں دیتے
سوئی ہوئی اندرا کو جگا کیوں نہیں دیتے

—— خورشید درخشاں

کس طرح اٹھاؤ گے اجالے کا جنازہ۔؟
یہ جسم نہیں ہے کہ سجا دو گے چتا پر
کرنوں کا نشیمن نہ فضا میں نہ ہوا پر
روپوش نہیں ہوتے ضیا پاش نظارے
کیا قبر میں سوتے ہیں کبھی چاند ستارے؟
تابوت میں سورج کو لٹانے پہ تلے ہو؟
کیوں معجزہ خود بنانے پہ تلے ہو؟
کس طرح اٹھاؤ گے اجالے کا جنازہ ؟

—— اعجاز افضل

یا خدا
کیا غضب یہ ہوا
مجھ سے کیوں میری محبوب لیڈر کو چھینا گیا
ملک اور قوم کی رہنما
امن اور دوستی کی تھی پیغامبر اندرا
یا خدا! ملک اور قوم کو صبر دے
اس کے پیغام پر جینے مرنے کی توفیق دے

—— صادق گیاوی

اپنے اپنے چراغوں میں محفوظ کر لو اسے
یہ لہو بہہ نہ جائے کہیں جم نہ جائے کہیں
یہ لہو امن کا
زندگی کا لہو
روشنی کا لہو
چاندنی کا لہو
یہ لہو یعنی جمہوریت کا لہو
یہ لہو یعنی انسانیت کا لہو
یہ لہو بہہ نہ جائے کہیں جم نہ جائے کہیں

رئیس انوری

ھندستان۔ اندرا گاندھی کے بغیر: صفحہ ۲۴۵ کا بقیہ

روایات برقرار رہیں گی۔ وہ نوجوان جو شانتی ون میں تنہا چتا کو آگ دکھانے کے لیے کھڑا ہوا تھا قومی اتحاد و سالمیت کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے میں اکیلا نہ ہوگا۔ ملک کے ۷۰ کروڑ عوام — مرد، عورتیں اور بچے پورے عزم کے ساتھ اس کے ہمراہ ہیں اور سب نے اندرا گاندھی کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے کا عہد کر رکھا ہے۔

●●●

اگر ملک کی خدمت کرتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے فخر ہوگا

مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ' اس ملک کو ترقی یافتہ اور طاقتور

No. 10, 11, 12
FEB, MARCH,

URDU MONTHLY
NAYA DAUR
POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

Rs. 10/-

ایک یادگار تصویر